قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

مئی 2026 قیمت 25₹

ماہنامہ

اُردو دُنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

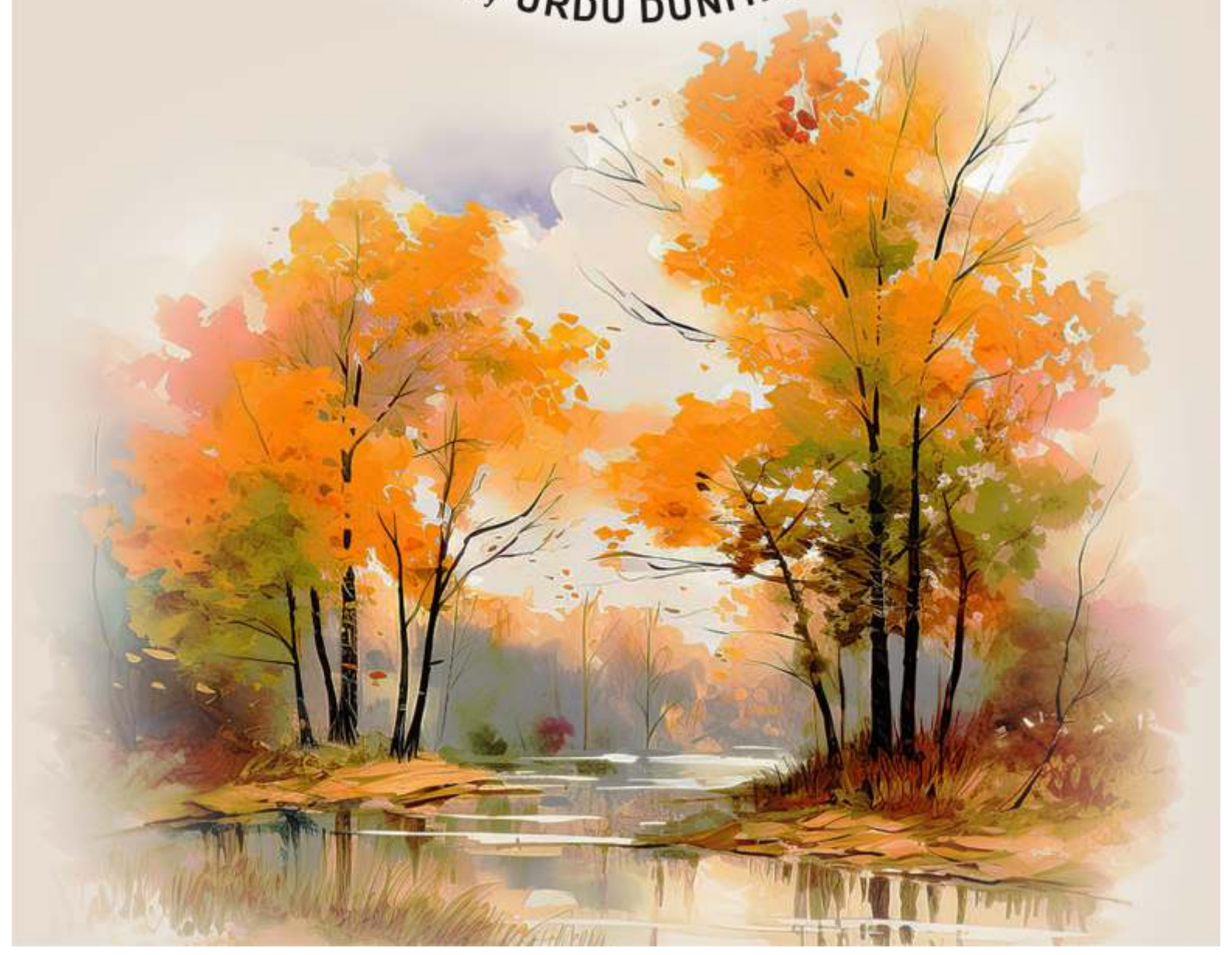

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ، A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 ، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:28، شمارہ:5، مئی 2026

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال
مدیر منتظم: ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی
نائب مدیر : نہاں
معاون مدیر : ڈاکٹر فیضان الحق
معاونین : ڈاکٹر وسیم اقبال، محمد اکرام، محمد فرقان عالم

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، حکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع : سالاسار امیجنگ سسٹمس
B-19، سیکٹر 88، نوئیڈا۔ 201305 (یوپی)

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: اختر حسین
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے، سالانہ -/240 روپے
صفحات: Total Pages:100

• قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
• ڈرافٹ NCPUL,NewDelhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 011-35151992 | شعبۂ ادارت: 011-35152009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

ای-میل
editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آرکے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
• ہماری بات — مدیر — 4

خطوط
• آپ کی بات — قارئین — 5

قومی تعلیمی پالیسی 2020
• اسکول کا پہلا دن:
ایک مشترکہ ذمہ داری کا آغاز — دھرمیندر پردھان — 8

ڈیجیٹل انڈیا اور اردو
• اردو انفارمیٹکس میں اطلاعاتی ومعلوماتی
ٹیکنالوجی کی اصطلاح — مکرم نیاز — 10
• عصری ٹیکنالوجی اور اردو زبان — ذاکر احمد کمار — 13

انڈین نالج سسٹم
• سنسکرت شعریات — عتیق اللہ — 16
• رامائن کی معنویت
عصر حاضر کے تناظر میں — بلوندر سنگھ — 21

ادب: زاویے اور جہات
• اردو آزاد نظم کا پس منظر — حنیف کیفی — 24
• اردو ادب اطفال پر دیگر
زبانوں کے اثرات — مظفر حسین غزالی — 29
• اردو زبان وادب کے
فروغ میں تراجم کا حصہ — بلقیس مقبول — 31
• 1857 کے بعد مثنوی اور نظم — تسنیم قمر — 34

تنقید وتجزیہ
• نند لعل گویا کی فارسی شاعری — امیر عباس خان — 38
• نواب مصطفی خاں شیفتہ کی
تنقیدی بصیرت — محمد حنیف خان — 42
• جگر کی کلاسیکیت — اکرم پرویز — 46

• سلطان اختر: کلاسیکی روایت کا
جدت پسند شاعر — ظفر اللہ انصاری — 49
• پریم ناتھ در کے افسانوں کا
علامتی اور سماجی مطالعہ — سریش کمار — 53

شخصیات
• یاس یگانہ چنگیزی کی
ادبی معرکہ آرائیاں — نسیم احمد نسیم — 57
• مولانا خیر رحمانی کے علمی وادبی نقوش — عبدالودود قاسمی — 60
• شفیع الدین نیر اور بچوں کے غالب — عبدالناصر — 63
• اسد رضا کی ادبی وفکری شخصیت — محمد نوشاد عالم ندوی — 66

پردۂ سیمیں
• راج کپور: بالی ووڈ کا ستارہ — ف س اعجاز — 68

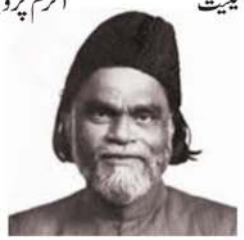

زبان اور زمینی صورت حال
• کرناٹک میں معاصر اردو ادب
ایک جائزہ — انو پماپول — 72

کتابوں کی دنیا
• تعارف وتبصرہ — 76

جہانِ آگہی
• خبرنامہ — ادارہ — 82

ہماری بات

ہندوستان میں تعلیم ہمیشہ سے قومی ترقی، سماجی ہم آہنگی اور فکری بیداری کا بنیادی ستون رہی ہے۔ بدلتے ہوئے عالمی حالات، تیز رفتار ٹیکنالوجی اور علم پر مبنی معیشت کے اس عہد میں یہ ناگزیر ہو چکا تھا کہ تعلیمی نظام کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ اسی پس منظر میں قومی تعلیمی پالیسی 2020 (NEP2020) ایک جامع، دوراندیش اور انقلابی اقدام کے طور پر سامنے آئی ہے، جس کا مقصد نہ صرف تعلیمی معیار کو بہتر بنانا ہے بلکہ طلبہ کو 21 ویں صدی کے تقاضوں اور چیلنجز کے لیے تیار کرنا بھی ہے۔ اس پالیسی کی سب سے نمایاں خصوصیت تعلیمی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی ہے، جہاں روایتی 2+10 نظام کی جگہ 4+3+3+5 ماڈل متعارف کرایا گیا ہے، جو بچوں کی نفسیاتی، ذہنی اور علمی نشوونما کو مدنظر رکھتے ہوئے ترتیب دیا گیا ہے۔ ابتدائی بچپن کی نگہداشت و تعلیم (ECCE) کو غیر معمولی اہمیت دینا اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ زندگی کے ابتدائی سال سیکھنے کی بنیاد رکھتے ہیں۔ مادری زبان میں تعلیم پر زور اس پالیسی کا ایک اہم پہلو ہے، کیونکہ تحقیق سے ثابت ہے کہ بچے اپنی ابتدائی تعلیم اپنی زبان میں زیادہ بہتر طور پر حاصل کرتے ہیں، جس سے نہ صرف سیکھنے کی رفتار میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ ان کی ثقافتی شناخت بھی مضبوط ہوتی ہے۔ تاہم اس کے مؤثر نفاذ کے لیے معیاری نصابی مواد اور تربیت یافتہ اساتذہ کی فراہمی ایک بڑا چیلنج ہے، جس پر سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں کثیر الشعبہ (Multidisciplinary) نظام، لچکدار نصاب اور ملٹیپل انٹری و ایگزٹ سسٹم طلبہ کو اپنی دلچسپی اور حالات کے مطابق تعلیم جاری رکھنے کی سہولت فراہم کرتے ہیں، جو خاص طور پر ان افراد کے لیے مفید ہیں جو کسی مجبوری کے باعث تعلیم ادھوری چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ اساتذہ کو تعلیمی نظام کا ستون قرار دیتے ہوئے ان کی پیشہ ورانہ تربیت، چار سالہ مربوط B.Ed پروگرام اور مسلسل ترقی کے مواقع فراہم کرنا اس پالیسی کی اہم ترجیح ہے، تاکہ اساتذہ محض معلومات کی ترسیل تک محدود نہ رہیں بلکہ تخلیقی رہنما کے طور پر طلبہ کی شخصیت سازی میں مؤثر کردار ادا کر سکیں۔

ڈیجیٹل تعلیم کا فروغ بھی اس پالیسی کا ایک نمایاں پہلو ہے، خاص طور پر کووڈ-19 کے بعد کے دور میں اس کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے۔ آن لائن تعلیم، ڈیجیٹل وسائل اور جدید ٹیکنالوجی کے استعمال سے تعلیم کو زیادہ قابل رسائی اور مؤثر بنانے کی کوشش کی گئی ہے، تاہم اس کے ساتھ ڈیجیٹل تقسیم کا مسئلہ بھی شدت سے سامنے آتا ہے، جہاں دیہی اور پسماندہ علاقوں کے طلبہ اب بھی ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ کی سہولیات سے محروم ہیں۔ اس خلا کو پر کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ تعلیمی مساوات کو یقینی بنایا جا سکے۔ تشخیصی نظام میں اصطلاحات کی سمجھ کے بغیر صرف رٹنے جیسے عمل کے خاتمے اور تنقیدی و تخلیقی سوچ کے فروغ پر زور دیا گیا ہے، جہاں فارمیٹو اسیسمنٹ اور صلاحیت پر مبنی جانچ طلبہ کو محض امتحانی دباؤ سے نکال کر دلچسپی کے ساتھ سیکھنے کی طرف مائل کرتی ہے اور PARAKH جیسا پورٹل اس عمل کو معیاری بنانے میں کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے۔ مزید برآں، تعلیم کو جامع اور ہمہ گیر بنانے کے لیے سماجی و معاشی طور پر پسماندہ طبقات، خواتین اور خصوصی توجہات کے حامل افراد کو یکساں مواقع فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس کے تحت صنفی انکلوژن فنڈ اور خصوصی تعلیمی زونز جیسے اقدامات قابل ذکر ہیں۔ پیشہ ورانہ تعلیم کو اسکولی سطح سے ہی فروغ دینا بھی ایک اہم قدم ہے، جس سے طلبہ کو عملی مہارتیں حاصل ہوں گی اور وہ روزگار کے بہتر مواقع سے مستفید ہو سکیں گے، یوں یہ اقدام نہ صرف بے روزگاری میں کمی لانے میں مددگار ہوگا بلکہ ملکی معیشت کو بھی تقویت دے گا۔ اگر تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو کوٹھاری کمیشن (66-1964) اور 1986 کی قومی تعلیمی پالیسی جیسے اقدامات ہندوستان میں تعلیمی اصلاحات کی ایک مضبوط روایت کی نمائندگی کرتے ہیں اور NEP2020 اسی تسلسل کا ایک وسیع اور ہمہ گیر اظہار ہے۔ NEP2020 تعلیمی نظام میں انقلابی تبدیلی لانے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ ہماری خوش بختی ہے کہ زیر نظر شمارے میں عزت مآب دھرمیندر پردھان (وزیر تعلیم، حکومت ہند) کا ایک اہم مضمون شاملِ اشاعت ہے جس میں NEP2020 اور اسکولی تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

شمس اقبال

آپ کی بات

ماہنامہ'اردو دنیا' میں 'آپ کی بات' کے تحت قارئین کے تاثرات شائع کرنے کا مقصد رسالے کے مشمولات کے تئیں قارئین کی آرا سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔ رسالے کے قلم کاروں اور قارئین سے گذارش ہے کہ مشمولات کے حوالے سے اپنے تاثرات ارسال کرنے کی زحمت کریں اور نئے موضوعات، مسائل، علاقوں اور ادبی و علمی شخصیات سے بھی مطلع فرمائیں۔ خطوط کی شکل میں موصول ہونے والے آپ کے یہ تاثرات ہمارے لیے بے حد اہم ہیں کیوں کہ ہمیں ان سے رسالے کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری جانے کا اتفاق ہوا، جہاں ماہنامہ 'اردو دنیا' اپریل 2026 کے شمارے پر نظر پڑی۔ فوراً یاد آیا کہ میرا ایک تبصرہ بھی مارچ 2026 کے شمارے میں شائع ہوا تھا، مگر اس پر رسالہ کا شکریہ ادا کرنے کا موقع ابھی تک نہیں مل سکا تھا۔ خیال آیا کہ کیوں نہ ایک مختصر خط کے ذریعے شکریہ ادا کیا جائے اور ساتھ ہی اپریل کے تازہ شمارے پر بھی چند تاثرات قلم بند کر دیے جائیں۔

رسالے کی فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوا کہ اس میں ادب، زبان، تحقیق، صحافت اور سماجی موضوعات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ یکجا کیا گیا ہے۔

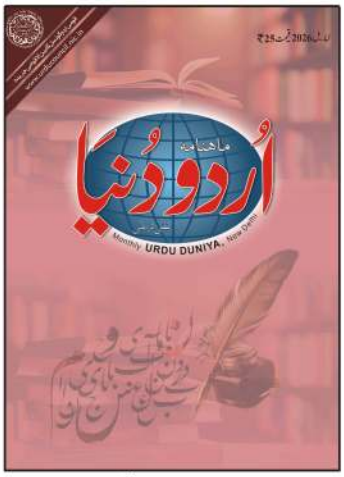

شمارے کی یہی جامعیت اسے ایک وقیع اور بامعنی ادبی دستاویز بنا دیتی ہے۔ اس شمارے میں پیش کیے گئے مضامین قارئین کو ادبی و فکری شخصیات سے روشناس کراتے ہیں، جب کہ 'ہماری بات'، 'آپ کی بات' جیسے گوشے رسالے اور قارئین کے درمیان ایک زندہ ربط قائم رکھتے ہیں۔ اسی طرح 'زبان و تعلیم' کے عنوان سے اردو زبان کے فروغ اور اس کے تعلیمی امکانات پر گفتگو نہایت اہم اور بروقت محسوس ہوتی ہے۔

اداریہ کے کالم 'ہماری بات' میں مدیر ڈاکٹر شمس اقبال نے نہایت بصیرت افروز انداز میں ادب اور ماحولیات کے باہمی رشتے کو اجاگر کیا ہے۔ شعری روایت میں فطرت اور ماحول سے گہری وابستگی پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ماحولیاتی تنقید (Eco-criticism) کے تصور کو بھی موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ ادب کے ذریعے انسان میں فطرت کے تحفظ اور ماحول کی بقا کا شعور پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر اداریہ ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

شمارے میں کئی اہلِ قلم کے تاثراتی خطوط شامل ہیں، جن کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر کسی قاری نے رسالے کا سابقہ شمارہ نہ بھی پڑھا ہو تو ان صاحبانِ قلم کے تاثرات سے اپنے اشتیاق اور تشنگی کو بڑی حد تک دور کر سکتا ہے۔ ان خطوط میں خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر افضل مصباحی، ڈاکٹر حبیب سیفی، ڈاکٹر پنکج کمار اور ایم راگھوراؤ کے نام قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے اپنے فکر انگیز تاثرات کے ذریعے شمارے کی اہمیت کو مزید اجاگر کیا ہے۔

'کثیر لسانی ہندوستان' کے عنوان سے شامل مضامین اردو اور دیگر زبانوں کے باہمی رشتوں اور ہندوستان کی لسانی و ثقافتی روایت کو اجاگر کرتے ہیں۔ جن سے قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ اردو زبان نہ صرف مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان ایک مضبوط پل ہے بلکہ اس کی جڑیں ہندوستانی معاشرے میں گہرائی تک پیوست ہیں۔

'اقلیم سخن' کے تحت پیش کیے گئے مضامین اردو شاعری کی روایت، اس کے فکری اور فنی پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ 'میر تقی میر کی غزل گوئی؛ ایک باز دید' اور 'نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں متصوفانہ رجحان' سے لے کر جدید شعری رجحانات تک مختلف موضوعات کو جس انداز میں شامل کیا گیا ہے، وہ اردو شاعری کے تسلسل اور ارتقا کو واضح کرتے ہیں۔

رضا نقوی واہی کے حوالے سے مضمون 'اب جا رہا ہوں یاس کی دنیا لیے ہوئے' میں عبدالحی نے یہ واضح کیا ہے کہ واہی کی مزاحیہ شاعری محض تفریح یا قہقہوں تک محدود نہیں بلکہ اس کے پس پردہ سماجی شعور اور فکری گہرائی بھی موجود ہے۔ مضمون میں اردو طنز و مزاح کی روایت کا مختصر تاریخی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے جس سے قاری کو اس صنف کے ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ عبدالحی کی یہ تحریر معلوماتی ہے اور دلچسپ بھی۔

فہرست میں شامل قسیم اختر کا مضمون معلوماتی اور فکر انگیز محسوس ہوا۔ مضمون نگار نے بڑی خوبی کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ اگرچہ ساحر لدھیانوی کو عموماً نظم اور نغمہ نگاری کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے، لیکن ان کی غزل گوئی بھی اپنی معنوی گہرائی، رومانیت اور انقلابی شعور کے باعث خاص اہمیت رکھتی ہے۔ خصوصاً فریڈرک اینگلز کے قول کے حوالے سے شعری رمزیت اور فن کی لطافت پر جو گفتگو کی گئی ہے، وہ مضمون کو علمی وقار عطا کرتی ہے۔ یہ مضمون نہ صرف ساحر لدھیانوی کی غزل گوئی کو سمجھنے میں معاون ہے بلکہ اردو تنقید کے سنجیدہ مطالعے کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے۔

اسی طرح 'چراغِ عقیدت' کے تحت شامل تحریریں ادبی شخصیات کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہیں۔ یہ مضامین نہ صرف ان شخصیات کی ادبی اور فکری خدمات کو یاد دلاتے ہیں بلکہ ادب میں ان کے مقام و مرتبے کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔

اس میں ایک اور اہم اور معلوماتی مضمون 'جیلانی بانو؛ بحیثیت افسانہ نگار' فیضان الحق

کی تحقیقی کاوش ہے۔ مضمون نگار نے نہایت سنجیدگی اور گہرے مطالعے کے ساتھ جیلانی بانو کی افسانہ نگاری، ان کے اسلوب اور فکری جہات کا جائزہ پیش کیا ہے۔

مضمون نگار نے جیلانی بانو کے مختلف افسانوں کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ ان کی تحریروں میں ایک گہرا انسانی درد اور سماجی شعور پایا جاتا ہے، جو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ خصوصاً افسانہ 'گل نغمہ' میں موسیقی، محبت اور تقسیم ہند کے اثرات کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے، جہاں سر اور راگ کا رشتہ حقیقی زندگی کے جذبات سے جڑ جاتا ہے۔ ان کے یہاں کردار، واقعات اور علامتیں مل کر اس عہد کے سیاسی اور سماجی حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی افسانہ نگاری اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ مضمون نگار نے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ جیلانی بانو کے افسانوں میں صرف معاشرتی مسائل ہی نہیں بلکہ انسانی نفسیات، داخلی کرب اور تنہائی جیسے موضوعات بھی نمایاں ہیں۔ افسانہ 'ایک دوست کی ضرورت ہے' انسانی تنہائی اور سچے رفیق کی تلاش کا مؤثر بیان ہے، جب کہ بچوں کے نفسیاتی شعور پر مبنی افسانے بھی ان کی تخلیقی بصیرت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ فیضان الحق کا یہ مضمون نہ صرف جیلانی بانو کی افسانہ نگاری کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے بلکہ اردو افسانے کی فکری روایت کو بھی واضح کرتا ہے۔

ممتاز نقاد گوپی چند نارنگ کی شخصیت اور تنقیدی خدمات پر عارف این کا مضمون معلوماتی اور فکر انگیز ہے۔ مضمون نگار نے نہ صرف نارنگ صاحب کی علمی زندگی اور ادبی سفر کو مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا ہے بلکہ اردو تنقید میں ان کے رجحان ساز کردار کو بھی بڑی وضاحت کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ خاص طور پر لسانیات، ساختیات اور مابعد جدید نظریات کے حوالے سے نارنگ صاحب کی خدمات کو جس سلیقے سے بیان کیا گیا ہے، وہ قابلِ تحسین ہے۔ یہ مضمون نہ صرف معلومات میں اضافہ کرتا ہے بلکہ اردو تنقید کے جدید رجحانات کو سمجھنے میں بھی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

اسی گوشے میں قاسم خورشید کے حوالے سے توقیر عالم کا ایک مضمون بھی شامل ہے، جس میں قاسم خورشید کی زندگی اور ان کی ادبی خدمات کو نہایت معلوماتی اور متاثر کن انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مضمون نگار نے قاسم خورشید کی جدوجہد بھری زندگی، تعلیمی سفر اور ادبی کارناموں کو سادہ اور مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ خاص طور پر ان کی بچپن کی محرومیوں، محنت و مشقت اور علم کے حصول کے لیے کی گئی جدوجہد کو جس انداز سے پیش کیا ہے، وہ قاری کو متاثر کرتا ہے۔ یہ تحریر نہ صرف ایک اہم ادبی شخصیت کا تعارف پیش کرتی ہے بلکہ نئی نسل کو محنت، حوصلے اور علمی لگن کا پیغام بھی دیتی ہے۔

اسی طرح شمارے کے دیگر گوشے بھی نہایت دلچسپ اور معلومات افزا ہیں۔ صحافت کے عنوان کے تحت شامل مضامین اردو صحافت کی روایت اور اس کی موجودہ صورتِ حال پر روشنی ڈالتے ہیں، جس سے قاری کو صحافت کی تاریخ اور اس کے ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے۔ لغت نویسی کے ذیل میں پیش کی گئی تحریر اردو زبان کی لغوی روایت اور اس کی علمی بنیادوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

مزید آگے تھیٹر اور ڈراما سے متعلق مضمون ہے جو ہندوستانی تھیٹر کی روایت اور اس کی ثقافتی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے، جو اردو ادب کے دائرے کو محض شاعری و نثر تک محدود نہیں رہنے دیتا بلکہ فنونِ لطیفہ کی دیگر جہات سے بھی روشناس کراتا ہے۔ اسی طرح ماحولیات کے موضوع پر شامل مضمون عصری مسائل کی طرف توجہ دلاتا ہے اور یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ ادب صرف جمالیاتی تجربہ ہی نہیں بلکہ سماجی شعور بیدار کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔

جہانِ موسیقی کے تحت موسیقی کی ایک نامور شخصیت پر لکھا گیا مضمون اردو دنیا کے ثقافتی تنوع کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کتابوں کی دنیا اور جہانِ آگہی جیسے گوشے اس شمارے کو مزید جامع اور معلوماتی بناتے ہیں، جہاں نئی کتابوں اور علمی سرگرمیوں کا تعارف قاری کے علمی ذوق کو مہمیز دیتا ہے۔

اس شمارے کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ملک کی مختلف جامعات سے وابستہ ریسرچ اسکالرز اور نئی نسل کی علمی و ادبی کاوشوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے تاثرات اور تبصرے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ یہ تبصرے نہ صرف معلوماتی ہیں بلکہ نئی نسل کی فکری بیداری اور ادبی ذوق کے بھی آئینہ دار ہیں۔ اس سلسلے میں محمد فرقان عالم، عبدالوارث، ڈاکٹر رفیق احمد، محمد ارشد ہمراز اور ڈاکٹر حبیب سیفی کے تبصرے قابلِ ذکر ہیں۔ نئی نسل کو اظہار کا موقع دینا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا یقیناً ایک قابلِ ستائش اقدام ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ شمارہ ادب، تحقیق، تنقید، صحافت، موسیقی، تھیٹر اور سماجی شعور جیسے مختلف موضوعات کو یکجا کر کے ایک ہمہ جہت ادبی منظرنامہ پیش کرتا ہے۔ بلاشبہ مدیرِ رسالہ اور ان کی مجلسِ ادارت اس خوبصورت اور معیاری شمارے کی ترتیب پر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے قارئین کے لیے ایسا علمی و ادبی ذخیرہ فراہم کیا ہے جو نہ صرف معلومات میں اضافہ کرتا ہے بلکہ ادبی ذوق کی آبیاری بھی کرتا ہے۔ یہ شمارہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اردو دنیا اردو زبان و ادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ قارئین کے فکری اور ادبی شعور کو بھی مہمیز دے رہا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ شماروں میں بھی اسی طرح متنوع اور معیاری مواد پیش کیا جاتا رہے گا۔

آخر میں میں رسالے کے معزز مدیر ڈاکٹر شمس اقبال، مجلسِ ادارت اور تمام معاونین کو اس بامقصد اور وقیع اشاعت پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے زیرِ اہتمام یہ علمی و ادبی خدمت آئندہ بھی اسی شان کے ساتھ جاری و ساری رہے۔

قمر الزماں چمپارنی، پٹنہ یونیورسٹی، بہار

آج جو ادب تخلیق ہو رہا ہے اس سے ہندوستانی عوامی تہذیب و ثقافت کی عکاسی ہوتی ہے، یہ تاثر اردو دنیا اپریل 2026 کا شمارہ دیکھنے کے بعد ذہن پر قائم ہوا۔ میں اگر یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ اردو دنیا رسالہ قومی اردو کونسل کے ذریعے اردو زبان کی ترقی و فروغ کے علاوہ بین المذاہب ہم آہنگی اور ملکی سالمیت و اتحاد کے قائم رکھنے میں بھی عمدہ رول ادا کر رہا ہے۔ اپنے اپنے طور پر ملک کے قلمکار جس دلچسپی سے تجربات و احساسات کی ترجمانی اپنی تخلیقات میں کرتے ہیں۔ اس سے اردو دنیا کی شان بڑھتی ہے۔ مرحومہ جیلانی بانو کی شخصیت اور فن دونوں کا احاطہ فیضان الحق نے شاندار طریقے سے کیا ہے۔ جیلانی بانو کی افسانہ نگاری کے جن پہلوؤں پر موصوف نے روشنی ڈالی اور جن کتابوں کا احوال بیان کیا، ان سے مرحومہ کی شخصیت اور ادبی قد و قامت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ تحریر بہترین خراج عقیدت ہے۔

بلاشبہ قاسم خوشید کی اچانک موت محض ایک ادیب کی موت نہیں ہے بلکہ اردو اور ہندی ادب کے حسین سنگم کا بکھر جانا ہے، توقیر عالم نے ٹھیک ہی لکھا ہے واقعی وہ ایسے ہی ادبی گلشن کو اجاڑ گئے۔ مجھ اجنبی سے آپ کی پہلی ملاقات ساہتیہ اکادمی کیمپس میں تین برس قبل سال 2023 میں ہوئی تھی، اس کے بعد قومی اردو کونسل کے دفتر میں

دوسری ملاقات بچوں کے ادب پر منعقد ورکشاپ میں ہوئی اور تب سے بذریعہ موبائل گفتگو کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔

مرحوم قاسم خورشید کے تعلق سے میں اتنا ہی کہوں گا کہ ان میں مغروریت قطعی نہیں تھی۔ جمال اویسی: پاسدار شعروسخن، مضمون نگار مشتاق احمد بھی پسند آیا۔ دراصل جمال اویسی کے کئی اشعار ناچیز کو ازبر ہیں، نظمیہ شاعری بھی جمال اویسی نے بہترین کی ہے۔ یوں تو ہر شاعر اپنے خیال وجذبہ کے اظہار کے لیے الفاظ ہی سے کام لیتا ہے، لیکن الفاظ کے ساتھ اس کا برتاؤ نہ صرف انفرادی اسلوب کو مدوّن کرتا ہے بلکہ مختلف فنکاروں کے درمیان خط امتیاز کو بھی نمایاں کرتا ہے، اور ہم اسی کے تحت اس کے بارے میں رائے قائم کرتے ہیں۔

ساحر لدھیانوی کی غزل گوئی، قسیم اختر، کبیر اجمل کا شعری اظہار، فہمینہ علی، رضا نقوی واہی عبدالحی کے مضامین پڑھنے لائق ہیں۔ تخلیقی توانائیوں کا تسلسل برقرار رکھتے ہوئے بہترین ادب تواتر کے ساتھ اردو دنیا میں پیش کیا جارہا ہے، اس کے لیے متعلقہ احباب کو سلام۔ بلند ارادوں اور ذمے داریوں کے تعلق سے آپ کی لگن اور مضبوط شخصیت کی نشاندہی یوں تو اردو دنیا کا ہر شمارہ کرتا ہے، لیکن جس معیاری سطح کا ادب گذشتہ چھ مہینوں میں پڑھنے کو ملا اس نے نسبتاً مثبت تاثر قائم کیے۔ اصناف ادب کی مسابقتی دوڑ نے موجودہ دور کے بعض تخلیق کاروں سے ان کی ذہنی تخلیقیت سلب کرلی ہے۔ فکر کا عنصر اگر کسی کے یہاں دکھ جائے تو غنیمت سمجھا جائے۔ اے آئی کے بجا اور بے جا استعمال سے حقیقی قلمکاروں کی قدردانی میں کمی واقع ہوئی ہے۔ قومی اردو کونسل کو مبارکباد۔

ڈاکٹر حبیب سیفی، حوض رانی، نئی دہلی

ماہنامہ 'اردو دنیا' مارچ 2026 کا شمارہ موصول ہوا۔ رسالے میں شامل بیشتر مضامین ہمیں متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری فکر ونظر میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔ نوشاد حسین کا مضمون 'پنچ کوش، فلسفہ اور ہمہ جہتی تعلیم' عمدہ اور معلوماتی مضمون ہے۔ اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ تعلیم ہمیشہ انسانی تہذیب کی روح رہی ہے۔ اس کا حقیقی مقصد خودشناسی ہے۔ انسان کی اصل ترقی اس وقت ممکن ہے جب وہ سماج اور کائنات کے درمیان توازن کو پہچان لے۔ ایاز احمد خان کے مضمون 'قومی تعلیمی پالیسی اور مادری زبان' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر بچے کی تعلیم مادری زبان میں ہو تو اس کا ذہن تیزی سے سیکھتا ہے کیونکہ مادری زبان ذہن سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ مومن سمیہ کا مضمون 'تعلیم میں مصنوعی ذہانت کا استعمال' موجودہ دور کے پس منظر میں ایک عمدہ مضمون کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ مصنوعی ذہانت تعلیم کے شعبے میں بہت اہم کردار ادا کررہا ہے۔ محمد جمشید عالم کا مضمون 'تعلیم اور ٹیکنالوجی' بھی موضوع کی مناسبت سے عمدہ مضمون ہے۔ ٹیکنالوجی نے تعلیمی نظام میں انقلاب برپا کرنے کے ساتھ سیکھنے کے عمل کو دلچسپ بنایا ہے۔ گلاب سنگھ کے مضمون 'ڈیجیٹل انقلاب اور اردو' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈیجیٹل انقلاب نے مواصلات کے طریقوں کو بدل دیا ہے۔ اس نے اردو کے لیے ایک اور موقع فراہم کیا ہے۔ اردو کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسے ادبی زبان تک محدود نہ رکھیں بلکہ اردو کو سائنسی اور کاروبار کی زبان بھی بنائیں۔ سراج انور محمد میراں کا مضمون 'رابندر ناتھ ٹیگور کی افسانہ نگاری' ایک عمدہ اور معلوماتی مضمون ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹیگور کے افسانوی ادب نے ملک کی ہر زبان کے فنکاروں کو متاثر کیا۔ پنکج کمار نے 'راجا نرسنگھ راج کی غزلیہ شاعری' میں ان کے کلاسیکی رجحانات کا بہت عمدہ طریقے سے ذکر کیا ہے۔ شمارے کے بقیہ مضامین بھی لائق مطالعہ ہیں۔

ایم راگھو راؤ، ساؤتھ سول لائن، چھندوارا، مدھیہ پردیش

ماہنامہ 'اردو دنیا' مارچ 2026 کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق پر عالمی اردو کانفرنس کے افتتاح کا منظر دیدہ زیب ہے۔ اس شمارے کا اداریہ بہت معلوماتی ہے جس میں صاحب مدیر اردو زبان وادب کے تعلق سے نئی بات کا اظہار کرتے ہیں جو عصری ماحول سے مربوط ہوتی ہے۔ انھوں نے ڈیجیٹل پلیٹ فارمز، سوشل میڈیا، فیس بک، انسٹاگرام، یوٹیوب، وہاٹس ایپ اور کتابوں کی ڈیجیٹلائزیشن کی اہمیت وافادیت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اس تعلق سے انھوں نے قومی اردو کونسل کے ساتھ ریختہ فاؤنڈیشن کی خدمات کا واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ شمارے میں شامل ڈاکٹر ثوبان سعید کا مضمون 'قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور ہندوستانی علاقائی زبانیں' اپنے موضوع پر بہت وقیع مضمون ہے جس میں قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تحت جو اصول اور تقاضے ہیں ان پر عمدہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ 'ادب زاویے اور جہات' کے تحت لیاقت علی کا مضمون 'معاصر اردو غزل کی شعریات' اور افضل مصباحی کا مضمون 'مثنویات میر میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب' عمدہ اور معلوماتی ہیں۔ شخصیات کے تحت سراج انور محمد میراں (رابندر ناتھ ٹیگور کی افسانہ نگاری)، منظور احمد گنائی (شہزادی کلثوم کی شاعری)، پنکج کمار (راجا نرسنگھ راج عالی کی غزلیہ شاعری' اور ارشاد احمد (شاطر گورکھپوری کی یاد میں' جیسے مضامین شامل ہیں جس کے مطالعہ سے علم وآگہی میں اضافہ ضرور ہوگا۔ ان کے علاوہ شمارے کے دیگر مضامین معلوماتی اور لائق مطالعہ ہیں۔ اس سے پہلے 'اردو دنیا' جنوری اور فروری کے شمارے بھی موصول ہوئے۔ فروری کے شمارے میں سرورق پر 'لال قلعہ کی فصیل سے' کتاب کی رسم اجرا کی تصویر بہت کچھ بیاں کررہی ہے۔ اس کے ساتھ اس شمارے کی ایک اور خاص بات ہے بھارت منڈپم پرگتی میدان میں منعقدہ عالمی کتاب میلے کی رپورٹ۔ اس تفصیلی رپورٹ کے مطالعے سے کونسل کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی تفصیلات کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ مختلف موضوعات پر لکھے گئے قلمکاروں کے مضامین بھی دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ جنوری کا شمارہ بھی ایک خاص شمارہ کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس شمارے میں قومی اردو کونسل کے ذریعے علی گڑھ میں منعقدہ کتاب میلے کی رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس رپورٹ کے ذریعے علی گڑھ کتاب میلے کی سرگرمیوں کا علم ہوا۔ کتاب میلے میں کتابوں کی کثیر تعداد میں خریداری ایک خوش آئند بات ہے۔ قوی امید ہے کہ اس کتاب میلے کے ذریعے کتاب اور قاری کے مابین رشتہ مزید مضبوط ہوگا۔ اس کے علاوہ شمارے میں شامل تمام مضامین لائق مطالعہ ہیں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ واکیڈمک سینٹ ممبر، تلنگانہ یونیورسٹی، حیدرآباد، تلنگانہ، موبائل:9603018825

دھرمیندر پردھان
وزیر تعلیم، حکومت ہند

اسکول کا پہلا دن

ایک مشترکہ ذمہ داری کا آغاز

ہر سال، جب اسکول کے نئے تعلیمی سیشن کا آغاز ہوتا ہے، ہندوستان اجتماعی عزم و ہمت کے ایک بے مثال منظر کا مشاہدہ کرتا ہے۔ پہاڑی اور ساحلی علاقوں سے لے کر شہروں اور دور دراز گاؤں تک کے لاکھوں بچے — متعدد ذاتی مشکلات کے باوجود — تازہ توانائی، نئے عزائم اور بے پناہ امکانات کے ساتھ اپنے کلاس روم میں داخل ہوتے ہیں۔ ملک کے لیے یہ ایک خاموش مگر طاقتور لمحہ ہوتا ہے۔ اس سال بھی تقریباً 2 کروڑ بچوں نے پہلی جماعت میں داخلہ لیا ہے، جو امید کے ساتھ ایک مشترکہ قومی ذمہ داری کا بھی احساس دلاتا ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے آموزش کے معاملے میں رٹنے اور حفظ کرنے کے بجائے تجسس، تفہیم اور ہمہ جہتی ترقی کو اولیت دی ہے۔ ہر تعلیمی سال اس وژن کو حقیقت بنانے کی سمت ایک بامعنی قدم ثابت ہو رہا ہے۔

بال واٹیکا اسکیم کے نفاذ کے ساتھ ابتدائی بچپن کی تعلیم اب باضابطہ اسکولی نظام کا حصہ بن چکی ہے، اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ بچے بہتر تیاری اور مضبوط بنیادی مہارتوں کے ساتھ پہلے گریڈ میں داخل ہوں گے۔ اسکول میں بچے کا داخلہ لینا علم اور معاشرے کے ساتھ عمر بھر کے تعلق کا آغاز ہوتا ہے۔ لہٰذا اسکولوں کو اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ یہ سفر خوشگوار آموزش، فلاح و بہبود اور وابستگی کے مضبوط احساسات پر مبنی ہو۔

ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ اسکول کا پہلا دن یادگار نہ ہو۔ یہ نئی شروعات کے متعلق جھجک اور خوشیوں کا امتزاج ہوتا ہے۔ ننھے ننھے ہاتھ بڑے بڑے جذبات کو تھامے ہوتے ہیں اور متجسس آنکھیں ایک بالکل نئی دنیا کا احاطہ کر رہی ہوتی ہیں۔ جب بچے خود کو محفوظ اور قابلِ قدر محسوس کرتے ہیں تو وہ کھل کر اظہار کرتے ہیں۔ مختلف امور میں حصہ لیتے ہیں اور ان کا تجسس پروان چڑھنے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ مگر تسلسل کے ساتھ ان کا اعتماد بڑھنے لگتا ہے۔ ابتدائی برسوں میں کھیل کو مرکزی اہمیت دینی چاہیے۔

> **قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے آموزش کے معاملے میں رٹنے اور حفظ کرنے کے بجائے تجسس، تفہیم اور ہمہ جہتی ترقی کو اولیت دی ہے۔ ہر تعلیمی سال اس وژن کو حقیقت بنانے کی سمت ایک بامعنی قدم ثابت ہو رہا ہے۔**

ہماری زندگی میں تعلقات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک خیال رکھنے والا استاد بچے کی زندگی کا رخ تبدیل کر سکتا ہے۔ ایک سازگار ماحول پر مبنی کلاس خاموشی کو شرکت میں، اور شرکت کو اعتماد میں بدل سکتی ہے۔ جب کسی بچے کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس کو توجہ دی جاتی ہے اور اس کی بات سنی جاتی ہے تو اس کا تجسس ہمت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جس بچے کو وابستگی کا احساس رہتا ہے وہ اپنی آواز کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔

بچوں کے ابتدائی تعلیمی برسوں میں خواندگی اور عددی مہارت پیدا کرنے سے متعلق ملک نے مضبوط عزائم کر رکھے ہیں۔ نپُن بھارت مشن کے ذریعے ہندوستان کا واضح موقف ہے کہ ہر بچہ دوسری جماعت سے نکلنے تک سمجھ کر پڑھنے اور بنیادی حساب کرنے کے قابل ہو جائے۔ اس اسکیم کے تحت جوابات کو رٹنے سے زیادہ تصورات کو سمجھنے پر توجہ ہونی چاہیے۔ کلاس رومز میں بچوں کو جوابات دوہرانے کے بجائے سوالات پوچھنے کی ترغیب دی جانی چاہیے۔

یہ وژن کا تعلق تعلیمی شعبوں کے ساتھ دوسرے شعبوں سے بھی ہے۔ مختلف فنون، کھیل اور اقدار آموزش

کے لازمی حصے ہیں۔ تعلیم کی ذمہ داری صرف ذہن ہی نہیں بلکہ جسم اور دل کے ساتھ ایک مکمل بچے کی تشکیل ہے۔ جسمانی سرگرمی اور غذائیت اسکول کی روزمرہ زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ ایک صحت مند بچہ بہتر طور پر سیکھتا، شریک ہوتا اور اعتماد کے ساتھ پروان چڑھتا ہے۔

عالمی سطح پر بچوں کے طرز زندگی میں نمایاں تبدیلی دیکھی جارہی ہے۔ غذائی عادات کی تبدیلی اور جسمانی سرگرمیوں میں کمی کے سبب پوری دنیا تشویش میں مبتلا ہے۔ ہندوستان اس چیلنج سے نمٹنے کے لیے سرگرم عمل ہے۔ اسکولوں میں لازمی جسمانی تعلیم، موٹاپے سے نمٹنے کے لیے 'آئل بورڈز'، 'شوگر بورڈز'، غذائیت کے معیار پر توجہ اور پی ایم۔پوشن اسکیم جیسے اقدامات اسکولوں کو صحت مند اور فعال طرزِ زندگی کے فروغ کی جانب متوجہ کر رہے ہیں۔ ان کوششوں کا مقصد ایک ایسی نسل تیار کرنا ہے جو صحت کو تمام ترقیوں میں مرکزی اہمیت کی حامل تصور کرے۔

اگرچہ ٹیکنالوجی رسائی اور آموزش کو آسان بنانے والا ایک طاقتور ذریعہ ہے، لیکن سوشل میڈیا پر بڑھتی نمائش، اسکرین ٹائم، توجہ اور ذہنی صحت کے حوالے سے کئی خدشات بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ مسئلہ بھی صرف ہندوستان تک محدود نہیں بلکہ عالمی ہے۔ ایسے میں اسکول کے ذمہ داران اور اہل خانہ کو خیال رکھنا چاہیے کہ سوشل میڈیا کو سیکھنے کے آلے کے طور پر استعمال کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ یہ بچوں کی توجہ بھٹکانے کا آلہ بن جائے۔

اس وژن کا ایک اور اہم پہلو بچوں کی ذہنی اور جذباتی صحت ہے۔ اسکولوں کے نصاب اور تدریس میں سماجی جذباتی آموزش کو جگہ دی گئی ہے تاکہ بچے پچھلی کسی بھی نسل سے زیادہ پیچیدہ اور تیز رفتار دنیا کا مقابلہ کرسکیں۔ بچوں کو محفوظ اور دباؤ سے پاک ماحول فراہم کرنے کے لیے اسکول، والدین، اساتذہ اور تمام کمیونٹیز کی مشترکہ کوشش ضروری ہے۔

کسی بھی قسم کی اصلاحات محض پالیسی دستاویزات کے ذریعے بچوں تک نہیں پہنچتیں بلکہ ان کا نفاذ اساتذہ کے ذریعے ہوتا ہے۔ وہ تعلیم کے میدان میں تبدیلی کے حقیقی معمار ہیں، جو کسی بھی وژن اور حقیقی کلاس روم کے درمیان پل کا کام کرتے ہیں۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ کثیر لسانی زاویوں سے تدریس کے فرائض انجام دیں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ بچوں کی مادری زبان قابل احترام اور سیکھنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ ان پہلوؤں پر توجہ دے کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ باضابطہ تعلیم کی طرف رخ کرنا آسان، لائق اعتماد اور اپنی جڑوں کی شناخت سے وابستہ ہے۔

میں اپنے اساتذہ سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ہر بچے کی رفتار اور شخصیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور اس کی ذہنی و جذباتی صحت کا خیال رکھتے ہوئے قابلیت اور ہنر پر مبنی آموزش کو اہمیت دیں۔

تعلیم اسکول کے دروازے پر شروع یا ختم نہیں ہوتی۔ گھر پہلی درسگاہ ہے، اور والدین پہلے اساتذہ ہیں۔ بچے گھر میں جو تجربہ کرتے ہیں اسی سے اسکول میں ان کے سیکھنے کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

مطالعے کی عادت کو فروغ دینا اور بچوں کے سوالات کا تحمل کے ساتھ جواب دینا علم کی جستجو کو پروان چڑھانے کے کارآمد طریقے ہیں۔ میں والدین سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ بچوں کی متوازن غذا اور مناسب نیند کا خاص خیال رکھیں۔ انھیں روزانہ جسمانی سرگرمی اور گھر کے باہر وقت گزارنے کا موقع دیں۔ والدین کو اسکول کے ساتھ متحرک طور پر جڑے رہنا چاہیے اور بچے کی کامیابی کو محض گریڈ سے نہیں ناپنا چاہیے، یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ ان کے اندر اعتماد، رحم دلی اور سیکھنے کی کتنی لگن موجود ہے۔ والدین اپنے بچوں کو یہ یقین دلا کر سب سے بڑا تحفہ عنایت کرسکتے ہیں کہ سیکھنا اپنے آپ میں ایک بے حد خوشگوار عمل ہے۔

تعلیم ایک مشترکہ ذمہ داری ہے۔ اس کا تعلق حکومت، اسکول، اساتذہ، والدین اور کمیونٹی سے ہے اور ہر فریق کا اپنا کردار ہے۔

اگرچہ ٹیکنالوجی رسائی اور آموزش کو آسان بنانے والا ایک طاقتور ذریعہ ہے، لیکن سوشل میڈیا پر بڑھتی نمائش، اسکرین ٹائم، توجہ اور ذہنی صحت کے حوالے سے کئی خدشات بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ مسئلہ بھی صرف ہندوستان تک محدود نہیں بلکہ عالمی ہے۔ ایسے میں اسکول کے ذمہ داران اور اہل خانہ کو خیال رکھنا چاہیے کہ سوشل میڈیا کو سیکھنے کے آلے کے طور پر استعمال کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ یہ بچوں کی توجہ بھٹکانے کا آلہ بن جائے۔

تعلیم اسکول کے دروازے پر شروع یا ختم نہیں ہوتی۔ گھر پہلی درسگاہ ہے، اور والدین پہلے اساتذہ ہیں۔ بچے گھر میں جو تجربہ کرتے ہیں اسی سے اسکول میں ان کے سیکھنے کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

ہر بچہ کو یہ حق حاصل ہے کہ اسے دیکھا جائے، سنا جائے اور سیکھنے کے اس سفر میں شفقت سے اس کی رہنمائی کی جائے۔ ہمارے تعلیمی نظام کی کامیابی کا اندازہ محض چند نمایاں اور کامیاب افراد سے نہیں لگایا جا سکتا بلکہ اس کا اصل مقصد ہر بچے کو خواہ وہ کسی پس منظر کا ہو، اعتماد اور خوشی کے ساتھ سیکھنے کا موقع فراہم کرنا ہے۔ آیئے عہد کریں کہ ہم ایک جامع، اختراعی اور مستقبل کے موافق تعلیمی نظام تعمیر کریں گے۔ ہم مل کر ہی یہ یقینی بنا سکتے ہیں کہ ہر کلاس روم ایک ایسی جگہ بنے جہاں خوابوں کو پر ملیں اور مستقبل کے رہنما تشکیل پائیں۔ وکست بھارت 2047@ کے پیش رو آج ہماری کلاسوں میں موجود ہیں۔ ان کی پرواز کے لیے ہمیں سنہری پر عطا کرنے کی ضرورت ہے۔

■

(بشکریہ روزنامہ 'دی انڈین ایکسپریس'، 1 اپریل 2026)

ترجمہ: ڈاکٹر فیضان الحق

اردو انفارمیٹکس میں

اطلاعاتی و معلوماتی ٹیکنالوجی کی اصطلاح

مکرم نیاز

گذشتہ دو دہائیوں میں اردو زبان میں ایک نیا علمی و فنی شعبہ بتدریج ابھر کر سامنے آیا ہے جسے عموماً 'اردو اطلاعیات' یا 'اردو انفارمیٹکس' کہا جاتا ہے۔ اس شعبے کا بنیادی مقصد اردو زبان کو جدید معلوماتی اور ترسیلاتی ٹیکنالوجی کے تقاضوں سے ہم آہنگ بنانا ہے۔ اس ضمن میں حروف اور رسم الخط کی معیاری ڈیجیٹل تشکیل، کی بورڈ لے آؤٹس کی سائنسی تدوین، فونٹ ڈیزائننگ، یونیکوڈ انکوڈنگ، اور خودکار ترجمہ جاتی نظامات (Translation Machine) جیسے موضوعات شامل ہیں۔

ہندوستان اور دیگر ممالک کے مختلف سرکاری و تحقیقی اداروں میں یہ احساس زیادہ پختہ ہوا ہے کہ اردو کو ڈیجیٹل عہد کی فعال زبان بنانے کے لیے اردو اطلاعیات اور اردو معلوماتیات کی نظریاتی و عملی بنیادوں کو مستحکم کرنا ناگزیر ہے۔ اسی مقصد کے تحت مختلف تحقیقی ادارے اور تنظیمیں اردو زبان کے لیے سافٹ ویئر لوکلائزیشن، ڈیجیٹل وسائل کی تیاری اور لسانی ٹیکنالوجی کی ترقی پر کام کر رہی ہیں۔

یہ شعبہ محض تکنیکی ترقی تک محدود نہیں بلکہ اس کا تعلق لسانی معیار سازی، ثقافتی تحفظ اور عالمی ڈیجیٹل نظام میں اردو کی موثر شمولیت سے بھی ہے۔ مثال کے طور پر نستعلیق رسم الخط کی پیچیدہ خطاطی کو ڈیجیٹل اسکرینوں پر معیاری انداز میں پیش کرنے کی کوششیں، یا اردو مواد کے لیے سرچ انجن آپٹیمائزیشن کی تکنیک، اردو انفارمیٹکس کے اہم موضوعات میں شمار ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں ہندوستان کے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی جیسے ادارے قابل ذکر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اردو انفارمیٹکس دراصل لسانیات، کمپیوٹر سائنس اور معلوماتی علوم کے باہمی اشتراک سے تشکیل پانے والا ایک بین الشعبہ جاتی میدان ہے۔ جدید دنیا میں کسی زبان کی بقا اور ترقی اب صرف ادبی پیداوار پر منحصر نہیں رہی بلکہ اس بات پر بھی منحصر ہے کہ وہ زبان ڈیجیٹل نظامات میں کس حد تک موثر طریقے سے شامل ہو سکتی ہے۔ اسی پس منظر میں کارپس لسانیات، قدرتی زبان کی پراسیسنگ (Natural Language Processing) تقریر کی شناخت (Recognition Speech) اور مشینی ترجمہ جیسے شعبے وجود میں آئے ہیں۔ اردو میں ان میدانوں میں تحقیق کا دائرہ ابھی محدود ضرور ہے، مگر گذشتہ برسوں میں اردو متنی ذخائر کی تیاری، خودکار املا تصحیح اور اردو سرچ انجن انڈیکسنگ جیسے منصوبے سامنے آئے ہیں، جو اردو انفارمیٹکس کی ترقی کے لیے اہم بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

اردو انفارمیٹکس کی عملی ترقی کے لیے صرف نظری مباحث یا اصطلاح سازی کافی نہیں بلکہ اس کے لیے وسیع لسانی وسائل (Linguistic Resources) کی دستیابی بھی ضروری ہے۔ جدید زبانوں میں کمپیوٹیشنل تحقیق کا زیادہ تر انحصار بڑے متنی ذخائر، لغوی ڈیٹا بیس، اور تشریح شدہ کارپس (Corpora Annotated) پر ہوتا ہے۔ ان وسائل کی مدد سے زبان کے صرفی، نحوی اور معنوی پہلوؤں کا تجزیہ ممکن ہوتا ہے، جس سے قدرتی زبان کی پراسیسنگ کے مختلف اطلاقات مثلاً خودکار ترجمہ، املا کی درستی، متن کی درجہ بندی اور معلوماتی بازیافت جیسے نظامات تیار کیے جا سکتے ہیں۔

اردو زبان کے لیے اس نوع کے وسائل کی تیاری ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے، تاہم گزشتہ برسوں میں متعدد تحقیقی منصوبے سامنے آئے ہیں جن میں اردو لغوی ذخائر کی ڈیجیٹل ترتیب، مشینی لغات کی تیاری، اور اردو کے بڑے متنی کارپس کی تشکیل شامل ہے۔ ان منصوبوں کی بدولت اردو زبان کو جدید ڈیجیٹل پلیٹ فارمز اور مصنوعی ذہانت کے نظامات میں بہتر طور پر شامل کرنے کے امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں یہ امر بھی اہم ہے کہ اردو کے لسانی وسائل کو اوپن سورس شکل میں دستیاب کیا جائے تاکہ دنیا بھر کے محققین اور سافٹ ویئر ڈیولپرز اردو زبان کے لیے نئی تکنیکی ایجادات پر کام کر سکیں۔

اردو ٹرمنالوجی کے بنیادی چیلنجز

اردو انفارمیٹکس کی ایک بنیادی جہت اصطلاح سازی اور معیار سازی ہے۔ اس میدان میں Information Technology, Information

and Communication Technology(ICT), Artificial اور Informatics, Data Science Intelligence جیسی انگریزی اصطلاحات کے بامحاورہ اور دقیق اردو متبادلات کی تلاش ایک اہم مسئلہ ہے۔

اردو میں انگریزی اصطلاحات کے لیے عموماً تین طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ پہلا طریقہ صوتی نقل (Transliteration) کا ہے، جیسے ٹیکنالوجی، کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور سافٹ ویئر۔ دوسرا طریقہ نیم ترجمہ ہے، جیسے اطلاعاتی ٹیکنالوجی یا ڈیٹا بیس۔ تیسرا طریقہ مکمل ترجمہ کا ہے، جیسے معلوماتی نظام یا خودکار ذہانت۔ یہ تنوع ایک طرف لسانی لچک پیدا کرتا ہے، مگر دوسری طرف تدریسی اور تحقیقی حلقوں میں اصطلاحی ابہام بھی پیدا کرتا ہے۔

اسی لیے ضروری ہے کہ اردو ٹرمنالوجی کے باب میں مفہومی باریکیوں، علمی روایت اور عالمی رجحانات کو مدنظر رکھتے ہوئے متفقہ اصطلاحات کی طرف پیش رفت کی جائے۔ مثال کے طور پر 'algorithm' کو صرف 'الگورتھم' کہنے کے بجائے 'حساباتی فارمولا' یا 'گنتی کا فارمولا' جیسے متبادلات بھی تجویز کیے گئے ہیں۔ اسی طرح database کے لیے 'ڈیٹا بیس' کے ساتھ 'معلوماتی ذخیرہ' کی اصطلاح بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔ ایسی اصطلاح سازی نہ صرف تدریس کو آسان بناتی ہے بلکہ اردو کو سائنسی و تکنیکی اظہار کی ایک موثر و مقبول زبان بھی بنا سکتی ہے۔

عالمی تناظر اور اردو کی کوششیں

بین الاقوامی سطح پر معلوماتی ٹیکنالوجی سے متعلق اصطلاحات کے مختلف مقامی تراجم رائج ہیں۔ عربی زبان میں تقنية المعلومات اور المعلوماتية جیسی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں، جبکہ ترکی میں Teknolojileri Bilisim اور جرمن میں Informatik رائج ہے۔ چین میں بھی Information Technology کے لیے مقامی زبان میں مخصوص اصطلاحات مستعمل ہیں۔ ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ مختلف زبانیں اپنی لسانی روایت اور علمی ضروریات کے مطابق اصطلاح سازی کا عمل جاری رکھتی ہیں۔

اردو میں بھی اس سلسلے میں مختلف اصطلاحات رائج ہیں، جیسے اطلاعاتی ٹیکنالوجی، معلوماتی ٹیکنالوجی اور معلوماتی و ترسیلاتی ٹیکنالوجی۔ صحافتی حلقوں میں

> **اردو میں دو قریبی الفاظ 'اطلاعات' اور 'معلومات' موجود ہیں۔ چونکہ جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی کا تعلق زیادہ تر ڈیٹا پراسیسنگ اور معلوماتی نظامات سے ہے، اس لیے بعض ماہرین کے نزدیک 'معلوماتیات' کی اصطلاح زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے۔ عربی زبان میں بھی 'المعلوماتية' جیسی اصطلاح رائج ہے جو Informatics یا Information Science کے لیے استعمال ہوتی ہے۔**

پہلی اصطلاح زیادہ استعمال ہوتی ہے، جبکہ جامعات اور تحقیقی اداروں میں دوسری اصطلاح کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔

اصطلاح سازی کا یہ مسئلہ صرف لسانی نہیں بلکہ ادارہ جاتی بھی ہے۔ مختلف ممالک میں علمی ادارے نئی سائنسی اصطلاحات کی معیار بندی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ عرب دنیا میں مجمع اللغة العربية اور ایران میں فرہنگستانِ زبان و ادب فارسی نے اس میدان میں قابل ذکر کام کیا ہے۔ اردو میں بھی اردو سائنس بورڈ، سنٹر فار لینگویج انجینئرنگ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جیسے ادارے مختلف لغات اور اصطلاحی فہرستیں مرتب کر چکے ہیں۔ تاہم ان اصطلاحات کا یکساں استعمال ابھی تک پوری طرح رائج نہیں ہو سکا۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی کا اردو مترادف

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اردو متبادل کے طور پر عموماً دو اصطلاحات سامنے آتی ہیں: اطلاعاتی ٹیکنالوجی اور معلوماتی ٹیکنالوجی۔ بظاہر دونوں مترادف معلوم ہوتی ہیں، مگر ان کے درمیان ایک باریک معنیاتی فرق موجود ہے۔

اطلاعاتی ٹیکنالوجی میں لفظ 'اطلاعات' دراصل اطلاع کی جمع ہے جس کا بنیادی مفہوم خبر رسانی یا آگاہی سے متعلق ہے۔ اسی وجہ سے یہ اصطلاح صحافتی اور ابلاغی تناظر میں زیادہ موزوں محسوس ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر وزارتِ اطلاعات، نظامِ اطلاعات اور اطلاعاتی نشریات جیسی تراکیب عام طور پر میڈیا اور خبر رسانی کے سیاق میں استعمال ہوتی ہیں۔ اس نقطہ نظر سے اطلاعاتی ٹیکنالوجی کو Information dissemination Technology کے قریب سمجھا جا سکتا ہے۔

اس کے برعکس 'معلومات' لفظ 'معلوم' سے بنا ہے اور اس کا تعلق علم، ڈیٹا اور علمی مواد سے ہے۔ چنانچہ معلوماتی ٹیکنالوجی کی اصطلاح ڈیٹا کے ذخیرہ، تنظیم اور تجزیے سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ کمپیوٹر سائنس کے تناظر میں Information Technology دراصل ان نظامات کا مجموعہ ہے جو معلومات کو محفوظ کرنے، پراسیس کرنے اور منتقل کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اسی لیے بعض ماہرین کے نزدیک معلوماتی

ٹیکنالوجی کی اصطلاح اس تصور کے زیادہ قریب ہے۔

ICT اور ترسیلاتی ٹیکنالوجی

کبھی کبھی اطلاعاتی ٹیکنالوجی کے بجائے 'ترسیلاتی ٹیکنالوجی' کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔ تاہم اس اصطلاح کا دائرہ نسبتاً محدود ہے کیونکہ اس کا تعلق بنیادی طور پر مواصلاتی نظامات سے ہے، جیسے ٹیلی کمیونیکیشن، براڈ کاسٹنگ اور انٹرنیٹ نیٹ ورک۔

انگریزی اصطلاح Information Technology دراصل تین بنیادی عناصر پر مشتمل ہے: معلومات کا ذخیرہ، معلومات کی پراسیسنگ اور معلومات کی ترسیل۔ اگر صرف ترسیلاتی ٹیکنالوجی کہا جائے تو اس سے Communication Technology کا مفہوم زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے Information and Communication Technology کی اصطلاح زیادہ جامع سمجھی جاتی ہے کیونکہ اس میں معلوماتی نظامات اور مواصلاتی نظامات دونوں شامل ہوتے ہیں۔

اطلاعیات یا معلوماتیات

بعض ماہرین نے انفارمیٹکس کے لیے اردو اصطلاح 'اطلاعیات' تجویز کی ہے۔ ایک ماہر لسانیات حافظ صفوان کے مطابق آئی ٹی دراصل آئی سی ٹی ہی کی ایک شکل ہے اور اس کے لیے 'اطلاعیات' کی اصطلاح پہلے سے موجود ہے۔ تاہم اس تجویز پر بھی علمی حلقوں میں بحث جاری ہے۔

اردو میں دو قریبی الفاظ 'اطلاعات' اور 'معلومات' موجود ہیں۔ چونکہ جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی کا تعلق زیادہ تر ڈیٹا پراسیسنگ اور معلوماتی نظامات سے ہے، اس لیے بعض ماہرین کے نزدیک 'معلوماتیات' کی اصطلاح زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے۔ عربی زبان میں بھی 'المعلوماتية' جیسی اصطلاح رائج ہے جو Informatics یا Information Science کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

اس طرح موجودہ صورت حال میں اردو میں تین اصطلاحی رجحانات نمایاں نظر آتے ہیں: اطلاعاتی ٹیکنالوجی، معلوماتی ٹیکنالوجی اور اطلاعیات یا معلوماتیات۔ ابھی تک ان میں سے کوئی ایک اصطلاح مکمل طور پر غالب نہیں آئی، مگر علمی حلقوں میں 'معلوماتیات' کو انفارمیٹکس کے لیے نسبتاً موزوں سمجھا جا رہا ہے۔

کارپس یا متنی ذخیرہ: ایک اصطلاحی بحث

اردو انفارمیٹکس میں ایک اور اہم اصطلاح 'Corpus' ہے جس پر حالیہ برسوں میں بحث ہوئی ہے۔ انگریزی میں Corpus سے مراد کسی زبان کے تحریری یا گفتاری مواد کا ایک منظم اور قابل تلاش ڈیجیٹل ذخیرہ ہوتا ہے جسے لسانی تحقیق میں استعمال کیا جاتا ہے۔

اردو میں اس اصطلاح کے دو ممکنہ متبادلات سامنے آئے ہیں: 'کارپس' اور 'متنی ذخیرہ'۔ پہلا طریقہ صوتی نقل کا ہے جس میں انگریزی لفظ کو اردو رسم الخط میں لکھ دیا جاتا ہے، جیسا کہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے ساتھ ہوا۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ عالمی علمی ادب سے اصطلاحی ربط برقرار رہتا ہے۔

دوسری طرف 'متنی ذخیرہ' ایک وضاحتی ترجمہ ہے جو عام قارئین کے لیے زیادہ بامعنی محسوس ہوتا ہے کیونکہ اس میں لفظ 'متن' اور 'ذخیرہ' دونوں مفہوم کو واضح کرتے ہیں۔ عملی طور پر لسانی تحقیق میں 'کارپس' کی اصطلاح زیادہ استعمال ہو رہی ہے جبکہ تعارفی تحریروں میں 'متنی ذخیرہ' بھی رائج ہے۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں یہی دہرا استعمال برقرار رہے۔

اردو انفارمیٹکس کا میدان ابھی ارتقائی مرحلے میں ہے اور آئندہ برسوں میں اس کے امکانات مزید وسیع ہونے کی توقع ہے۔ مصنوعی ذہانت، مشینی ترجمہ اور بڑے لسانی ماڈلز (Large Language Models) کی ترقی نے دنیا کی بڑی زبانوں کے ساتھ ساتھ نسبتاً کم ڈیجیٹل وسائل رکھنے والی زبانوں کے لیے بھی نئے مواقع پیدا کیے ہیں۔ اگر اردو کے لیے معیاری متنی ذخائر، لغوی ڈیٹا بیس اور مستند اصطلاحی لغات تیار کی جائیں تو اردو زبان بھی جدید لسانی ٹیکنالوجی کے میدان میں موثر کردار ادا کر سکتی ہے۔

اس تناظر میں اصطلاحی معیار سازی کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ جب تک علمی اور تکنیکی اصطلاحات میں یکسانیت پیدا نہیں ہوگی، اردو میں سائنسی تعلیم اور تحقیق کے فروغ میں دشواریاں برقرار رہیں گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ جامعات، تحقیقی ادارے اور سرکاری تنظیمیں باہمی تعاون سے اردو کی سائنسی و تکنیکی اصطلاحات کی ایک جامع فہرست مرتب کریں اور اسے تدریسی و تحقیقی سطح پر رائج کریں۔ اس طرح نہ صرف اردو انفارمیٹکس کے میدان کو مضبوط بنیاد ملے گی بلکہ اردو زبان جدید علمی و سائنسی مباحث میں زیادہ موثر انداز میں شریک ہو سکے گی۔

اس تناظر میں اصطلاحی معیار سازی کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ جب تک علمی اور تکنیکی اصطلاحات میں یکسانیت پیدا نہیں ہوگی، اردو میں سائنسی تعلیم اور تحقیق کے فروغ میں دشواریاں برقرار رہیں گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ جامعات، تحقیقی ادارے اور سرکاری تنظیمیں باہمی تعاون سے اردو کی سائنسی و تکنیکی اصطلاحات کی ایک جامع فہرست مرتب کریں اور اسے تدریسی و تحقیقی سطح پر رائج کریں۔ اس طرح نہ صرف اردو انفارمیٹکس کے میدان کو مضبوط بنیاد ملے گی بلکہ اردو زبان جدید علمی و سائنسی مباحث میں زیادہ موثر انداز میں شریک ہو سکے گی۔

حوالہ جات

- Urdu Informatics, Wikipedia
- اطلاعیات، اردو ویکیپیڈیا
- Shabdkosh, Terminology Technology Informaation
- درانی، عطش: اردو اطلاعیات (جلد 1 و 2)، اردو سائنس بورڈ لاہور
- Center for Language Engineering, UET Lahore: Urdu Localization Glossary
- NCPUL Digital Resources and Urdu Computing Initiatives
- ICT Terminology Dictionary, Telecommunication Development Resources Authority

Mukarram Niyaz
H.No 16.08.544, Dawood Residency
New Malakpet
Hyderabad- 500024 (Telangana)
Mob.: 8096961731
smniyaz@gmail.com

ذاکر احمد کمار

عصری ٹیکنالوجی اور اردو زبان

مسائل، حل اور امکانات

موجودہ عہد کو اگر کسی ایک نمایاں خصوصیت کے ذریعے بیان کیا جائے تو وہ بلا شبہ 'ڈیجیٹلائزیشن' ہے۔ ڈیجیٹلائزیشن محض ایک تکنیکی عمل نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت تبدیلی ہے، جس نے انسانی زندگی کے فکری، سماجی، معاشی اور تہذیبی ڈھانچوں کو ازسرِنو تشکیل دیا ہے۔ معلومات کی تخلیق، ترسیل اور ذخیرہ اندوزی کے روایتی طریقے اب ڈیجیٹل ذرائع میں تبدیل ہو چکے ہیں، جس کے نتیجے میں علم تک رسائی نہایت آسان اور تیز تر ہو گئی ہے۔ انٹرنیٹ، سوشل میڈیا، مصنوعی ذہانت اور دیگر جدید ٹیکنالوجیز نے دنیا کو ایک 'عالمی گاؤں' میں تبدیل کر دیا ہے، جہاں فاصلے اور سرحدیں اپنی معنویت کھوتے جا رہے ہیں۔

ڈیجیٹلائزیشن کے اس عمل نے نہ صرف انسانی روابط اور طرزِ زندگی کو متاثر کیا ہے بلکہ زبان و ادب کے میدان میں بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ زبان، جو انسانی فکر و شعور کی بنیادی ترجمان ہوتی ہے، اب ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر ایک نئی جہت کے ساتھ سامنے آ رہی ہے۔ اظہار کے انداز بدل رہے ہیں، ابلاغ کے ذرائع متنوع ہو رہے ہیں اور زبانوں کے مابین تعامل میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے۔ اس تناظر میں یہ سوال نہایت اہم ہو جاتا ہے کہ آیا تمام زبانیں اس تیز رفتار تبدیلی کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کر پا رہی ہیں یا نہیں۔ ڈیجیٹل دنیا میں وہی زبانیں زیادہ مؤثر اور فعال کردار ادا کر رہی ہیں جو ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہو چکی ہیں اور جن کے پاس معیاری ڈیجیٹل مواد، جدید سافٹ ویئر اور تحقیق و تدریس کے لیے موزوں وسائل موجود ہیں، جبکہ دیگر زبانیں بتدریج حاشیے پر جا رہی ہیں۔ یہی صورت حال اردو زبان کے حوالے سے بھی دیکھی جا سکتی ہے، جو ایک عظیم ادبی اور تہذیبی ورثے کی حامل ہونے کے باوجود ڈیجیٹل عہد کے تقاضوں سے خاطر خواہ طور پر ہم آہنگ نہیں ہو سکی۔

معلومات کی تخلیق، ترسیل اور ذخیرہ اندوزی کے روایتی طریقے اب ڈیجیٹل ذرائع میں تبدیل ہو چکے ہیں، جس کے نتیجے میں علم تک رسائی نہایت آسان اور تیز تر ہو گئی ہے۔ انٹرنیٹ، سوشل میڈیا، مصنوعی ذہانت اور دیگر جدید ٹیکنالوجیز نے دنیا کو ایک 'عالمی گاؤں' میں تبدیل کر دیا ہے، جہاں فاصلے اور سرحدیں اپنی معنویت کھوتے جا رہے ہیں۔

اکیسویں صدی کو بجا طور پر ڈیجیٹل انقلاب کی صدی قرار دیا جاتا ہے، جس میں ٹیکنالوجی نے انسانی زندگی کے ہر شعبے کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ ابلاغ، تعلیم، معیشت، تحقیق اور سماجی روابط کے تمام نظام اب بڑی حد تک ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے تابع ہو چکے ہیں۔ اس تغیر پذیر عالمی منظرنامے میں زبانیں محض اظہارِ خیال کا ذریعہ نہیں رہیں بلکہ علم کی ترسیل، تہذیبی شناخت اور عالمی سطح پر مقام کے تعین کا بنیادی وسیلہ بن گئی ہیں۔ اس تناظر میں اردو زبان کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے، کیونکہ یہ نہ صرف ایک ادبی زبان ہے بلکہ ایک بھرپور تہذیبی روایت کی امین بھی ہے۔ اس حوالے سے گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''زبان کسی بھی قوم کی تہذیبی شناخت کا سب سے مستحکم حوالہ ہوتی ہے۔ اس کے اندر اس قوم کی تاریخ، روایات، اقدار اور اجتماعی شعور محفوظ ہوتا ہے۔ جب کوئی زبان کمزور پڑتی ہے تو دراصل اس کے پس منظر میں موجود تہذیب بھی زوال کا شکار ہونے لگتی ہے، کیونکہ زبان ہی وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعے تہذیب اپنی بقا اور تسلسل کو برقرار رکھتی ہے۔''[1]

یہ اقتباس اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ اردو زبان کو درپیش مسائل محض لسانی نوعیت کے نہیں بلکہ ایک وسیع تہذیبی اور فکری تناظر رکھتے ہیں۔ ڈیجیٹل دور میں وہ زبانیں جو ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہو رہی ہیں، ترقی کے نئے افق تک رسائی حاصل کر رہی ہیں،

جب کہ دیگر زبانیں بتدریج حاشیے پر جا رہی ہیں۔ اردو زبان بھی اسی کشمکش سے گزر رہی ہے۔

اردو جو برصغیر کی ایک اہم تہذیبی و ادبی زبان ہے، اپنی وسعت اظہار، لطافت اور ادبی روایت کے باعث ایک منفرد مقام رکھتی ہے، تاہم ڈیجیٹل عہد میں اسے کئی پیچیدہ اور ہمہ گیر چیلنجز کا سامنا ہے۔ ان میں سب سے نمایاں مسئلہ انگریزی زبان کا عالمی غلبہ ہے، جو سائنس، ٹیکنالوجی، تحقیق اور ڈیجیٹل مواد کی بنیادی زبان بن چکی ہے۔ انٹرنیٹ پر دستیاب بیشتر علمی اور سائنسی مواد انگریزی میں ہونے کے باعث اردو صارفین کو یا تو انگریزی سیکھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے یا وہ جدید علم سے جزوی طور پر محروم رہ جاتے ہیں۔ اس صورت حال نے اردو کو ایک ثانوی حیثیت میں محدود کر دیا ہے۔

اردو زبان کی تشکیل و ارتقا میں عربی اور فارسی زبانوں کا نہایت اہم کردار رہا ہے۔ ان زبانوں سے ہزاروں الفاظ اردو میں شامل ہوئے، جنھوں نے اسے ایک وسیع، مالا مال اور متنوع زبان بنایا۔ علمی، ادبی اور مذہبی میدانوں میں اردو کی وسعت کا بڑا سبب یہی لسانی اشتراک ہے۔ تاہم، یہی عربی اور فارسی الفاظ بعض حوالوں سے اردو زبان کے لیے ایک چیلنج بھی بن گئے ہیں۔ سب سے پہلا مسئلہ غیر ضروری الفاظ کے اضافے کا ہے۔ سائنس، ٹیکنالوجی اور دیگر جدید شعبوں میں نئی اصطلاحات وضع کرتے وقت اکثر عربی اور فارسی الفاظ کو ترجیح دی جاتی ہے، جس سے اردو میں مشکل اور ثقیل الفاظ کا اضافہ ہوتا رہتا ہے اور زبان کی سادگی متاثر ہوتی ہے۔ دوسرا اہم مسئلہ عام تفہیم کا فقدان ہے۔ بہت سے عربی اور فارسی الفاظ عام لوگوں کے لیے مشکل ہوتے ہیں، جس کے باعث انھیں سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ اس سے زبان اور عوام کے درمیان ایک فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تیسرا پہلو لسانی خلوص اور شناخت کا ہے۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ حد سے زیادہ عربی و فارسی الفاظ کے استعمال سے اردو کی اپنی شناخت متاثر ہو رہی ہے اور اس کی اصل سادگی و روانی کم ہو رہی ہے۔ چوتھا مسئلہ نئے الفاظ کی تخلیق میں رکاوٹ ہے۔ جب ہر نئی چیز کے لیے عربی یا فارسی متبادل تلاش کیا جاتا ہے تو اس سے اردو میں نئے اور مقامی انداز کے الفاظ بنانے کی روایت کمزور پڑ جاتی ہے، جو زبان کی فطری ترقی کے لیے ضروری ہے۔ ان مسائل کے پیش نظر ضروری ہے کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے ایک متوازن حکمت عملی اپنائی جائے۔ عربی اور فارسی الفاظ اردو کا سرمایہ ہیں، مگر ان کے استعمال میں اعتدال ضروری ہے۔ سادہ، عام فہم اور بامعنی الفاظ کو ترجیح دی جائے، اور ساتھ ہی نئے اردو الفاظ کی تخلیق پر بھی توجہ دی جائے تاکہ زبان نہ صرف زندہ رہے بلکہ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہو سکے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''اردو زبان نے برصغیر کی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی جس جامع انداز میں کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے، مگر جدید دور میں اس کی ترقی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اسے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے، ورنہ یہ محض ایک ادبی زبان بن کر رہ جائے گی۔''[2]

اردو میں معیاری ڈیجیٹل مواد کی کمی بھی ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ اگرچہ ادبی مواد کسی حد تک موجود ہے، تاہم سائنسی، تکنیکی، فلسفیانہ اور جدید تحقیقی موضوعات پر اردو میں مواد نہایت محدود ہے، جو اس کی علمی ترقی میں رکاوٹ بنتا ہے۔ مزید برآں اردو زبان کے لیے جدید ٹیکنالوجی کی سہولیات، جیسے خودکار ترجمہ، اسپیچ ریکگنیشن اور مصنوعی ذہانت پر مبنی ٹولز ابھی ابتدائی مراحل میں ہیں۔ اصطلاح سازی کا مسئلہ بھی نہایت اہم ہے۔ موجودہ ڈیجیٹل عہد میں اردو زبان کو جن اہم چیلنجز کا سامنا ہے، ان میں سائنسی اور تکنیکی اصطلاحات کا ترجمہ

جدید سائنسی اور تکنیکی ترقیات کے باعث روزانہ کی بنیاد پر نئی اصطلاحات وضع کی جا رہی ہیں، جن کا بروقت اور معیاری اردو متبادل فراہم کرنا ایک بڑا علمی چیلنج ہے۔ اس ضمن میں تاخیر یا عدم توجہی کے نتیجے میں اردو زبان جدید علمی مباحث سے ہم آہنگ ہونے میں پیچھے رہ جاتی ہے۔

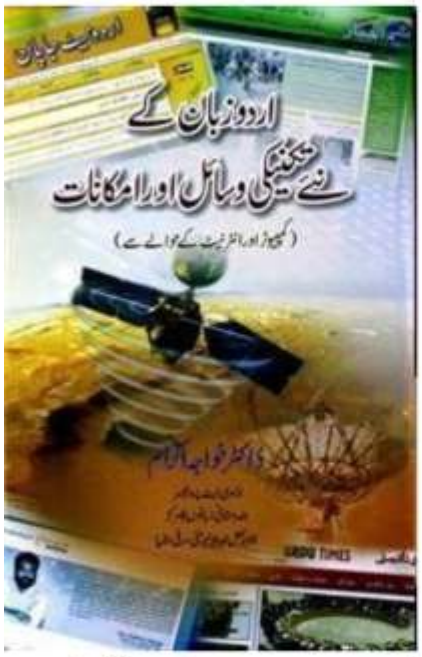

ایک نمایاں مسئلہ ہے۔ عصر حاضر میں سائنس، ٹیکنالوجی اور دیگر جدید علوم میں تیز رفتار ترقی کے نتیجے میں نت نئی اصطلاحات مسلسل معرض وجود میں آ رہی ہیں۔ ان اصطلاحات کو اردو زبان میں منتقل کرنا ایک نہایت پیچیدہ اور کثیر الجہتی عمل ہے، جو محض لسانی مہارت ہی نہیں بلکہ متعلقہ علمی میدانوں میں گہری واقفیت کا بھی متقاضی ہے۔ اصطلاحات کی برق رفتار تخلیق اس مسئلے کو مزید سنگین بناتی ہے۔ جدید سائنسی اور تکنیکی ترقیات کے باعث روزانہ کی بنیاد پر نئی اصطلاحات وضع کی جا رہی ہیں، جن کا بروقت اور معیاری اردو متبادل فراہم کرنا ایک بڑا علمی چیلنج ہے۔ اس ضمن میں تاخیر یا عدم توجہی کے نتیجے میں اردو زبان جدید علمی مباحث سے ہم آہنگ ہونے میں پیچھے رہ جاتی ہے۔

مزید برآں، بہت سی اصطلاحات ایسی ہیں جن کا براہ راست یا لفظی ترجمہ ممکن نہیں ہوتا، کیونکہ ان کے مفاہیم سیاق و سباق اور عملی استعمال سے وابستہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان اصطلاحات کے ترجمے کے لیے محض لغوی مطابقت کافی نہیں بلکہ مفہومی ہم آہنگی (Semantic equivalence) کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس میدان میں ماہرین کی کمی بھی ایک اہم رکاوٹ ہے۔ اردو میں سائنسی و تکنیکی اصطلاحات کی معیاری تشکیل کے لیے ماہرین لسانیات اور متعلقہ سائنسی شعبوں کے ماہرین کے باہمی اشتراک کی ضرورت ہے، جو فی الوقت محدود نظر آتا ہے۔ اس کمی کے باعث ایک ہی

اصطلاح کے متعدد اور غیر معیاری تراجم رائج ہو جاتے ہیں، جو علمی ابلاغ میں ابہام اور انتشار کا باعث بنتے ہیں۔ اس مسئلے کے متعدد منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اول، علمی و تحقیقی مواد کی اردو میں فراہمی متاثر ہوتی ہے، کیونکہ مناسب اصطلاحی متبادلات کی عدم دستیابی ترجمے کے عمل کو دشوار بنا دیتی ہے۔ دوم، یہ صورت حال اردو زبان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے، کیونکہ کسی بھی زبان کی وسعت اور بقا کا انحصار اس کی علمی و سائنسی استعداد پر ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ اصطلاحات کے فقدان کے باعث اردو زبان کا دائرہ کار محدود ہوتا جا رہا ہے، جس کے نتیجے میں یہ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے میں دشواری محسوس کرتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اردو میں سائنسی اور فنی اصطلاحات کی تیاری ایک منظم علمی کوشش کی متقاضی ہے، جس میں تسلسل، تحقیق اور ادارہ جاتی سرپرستی بنیادی حیثیت رکھتی ہے، بصورت دیگر زبان جدید علوم سے کٹ کر رہ جاتی ہے۔''[3]

سوشل میڈیا کے بڑھتے ہوئے استعمال نے اردو زبان کے معیار کو بھی متاثر کیا ہے۔ رومن اردو، غیر معیاری املا اور قواعد سے انحراف زبان کی ساخت اور اس کے جمالیاتی پہلو کو متاثر کر رہے ہیں۔ نئی نسل میں اردو سے دوری بھی ایک اہم مسئلہ ہے، جس کی ایک بڑی وجہ تعلیمی اور سماجی سطح پر انگریزی کو ترجیح دینا ہے۔ تاہم ان تمام چیلنجز کے باوجود اردو زبان کے لیے امکانات کے دروازے بند نہیں ہوئے بلکہ ڈیجیٹل دور نے اس کے فروغ کے لیے نئے مواقع بھی فراہم کیے ہیں۔ سب سے اہم ضرورت اردو کو جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے کی ہے۔ اس مقصد کے لیے اردو میں معیاری ڈیجیٹل مواد کی تیاری، آن لائن تعلیمی پلیٹ فارمز کا قیام اور جدید ایپلیکیشنز کی تخلیق ناگزیر ہے۔ اسی حوالے سے یونیسکو کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے:

''ڈیجیٹل ٹیکنالوجی زبانوں کے فروغ، تحفظ اور عالمی سطح پر ترویج میں کلیدی کردار ادا کر سکتی ہے۔ اگر مقامی زبانوں کو ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر مؤثر نمائندگی دی جائے تو وہ نہ صرف زندہ رہ سکتی ہیں بلکہ نئی نسل تک مؤثر طریقے سے منتقل بھی ہو سکتی ہیں، جو ان کے تسلسل کی ضمانت ہے۔''[4]

تعلیمی نظام میں اصلاحات کے ذریعے اردو کو ایک فعال علمی زبان کے طور پر فروغ دیا جا سکتا ہے۔ جامعات اور تحقیقی ادارے اگر اردو میں سائنسی اور تحقیقی مواد کی تیاری کو فروغ دیں تو طلبہ اپنی زبان میں جدید علوم تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اردو زبان کو فروغ دینا چاہتے ہیں تو ہمیں تعلیمی نظام میں اہم تبدیلیاں لانا ہوں گی۔ تعلیمی اداروں میں اردو زبان کو ایک لازمی مضمون کے طور پر شامل کیا جانا چاہیے تاکہ

> سوشل میڈیا کے بڑھتے ہوئے استعمال نے اردو زبان کے معیار کو بھی متاثر کیا ہے۔ رومن اردو، غیر معیاری املا اور قواعد سے انحراف زبان کی ساخت اور اس کے جمالیاتی پہلو کو متاثر کر رہے ہیں۔ نئی نسل میں اردو سے دوری بھی ایک اہم مسئلہ ہے، جس کی ایک بڑی وجہ تعلیمی اور سماجی سطح پر انگریزی کو ترجیح دینا ہے۔

طلبہ اس زبان سے وابستگی پیدا کریں۔ اردو زبان کی تعلیم کا معیار بہتر بنانے کے لیے اساتذہ کی تربیت ناگزیر ہے۔ انھیں جدید تدریسی طریقوں سے آگاہ کیا جانا چاہیے تاکہ وہ طلبہ کو دلچسپ اور مؤثر انداز میں اردو سکھا سکیں۔ نصابی مواد کو جدید موضوعات سے ہم آہنگ کرنا بھی ضروری ہے تاکہ طلبہ کی دلچسپی برقرار رہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں مشاعرے، تقریری مقابلے اور ادبی نشستوں کا انعقاد بھی اردو کے فروغ میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی طرح لائبریریوں کا قیام اور اردو کتب و رسائل کی دستیابی بھی اہم ہے۔

اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے میڈیا کا کردار انتہائی اہم ہے۔ میڈیا کے ذریعے اردو کو عام لوگوں تک پہنچایا جا سکتا ہے اور اسے ایک جدید اور زندہ زبان کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ٹی وی چینلز، ریڈیو پروگرامز، سوشل میڈیا پلیٹ فارمز جیسے فیس بک، ٹوئٹر اور انسٹاگرام پر اردو زبان کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ اردو بلاگنگ، ڈیجیٹل جرائد اور آن لائن پلیٹ فارمز بھی اس ضمن میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ غیر ملکی فلموں اور ڈراموں کو اردو میں ڈب کر کے عوام تک پہنچانا بھی ایک موثر ذریعہ ہے۔ عالمی سطح پر بھی اردو کے فروغ کے امکانات روشن ہیں۔ بیرون ممالک میں مقیم اردو بولنے والوں کی بڑی تعداد اور اردو ادب و ثقافت میں عالمی دلچسپی اس زبان کو ایک بین الاقوامی شناخت دے سکتی ہے۔ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے ذریعے اردو ادب، شاعری اور ثقافت کو دنیا بھر میں متعارف کرایا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ڈیجیٹل دور اردو زبان کے لیے چیلنجز اور امکانات دونوں لے کر آیا ہے۔ اگر سنجیدہ، منظم اور طویل المدتی حکمت عملی کے تحت اقدامات کیے جائیں اور ٹیکنالوجی کو اردو کے فروغ کے لیے مؤثر انداز میں استعمال کیا جائے تو اردو نہ صرف اپنی بقا برقرار رکھ سکتی ہے بلکہ جدید دنیا میں ایک فعال، مؤثر اور باوقار مقام بھی حاصل کر سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اردو کو محض ماضی کی یادگار کے طور پر نہ دیکھیں بلکہ اسے مستقبل کی زبان بنانے کے لیے عملی اقدامات کریں، کیونکہ زبان ہی کسی قوم کی شناخت اور تہذیبی تسلسل کی اصل بنیاد ہوتی ہے۔

حوالہ جات

1 گوپی چند نارنگ، اردو زبان اور لسانیات، رام پور رضا لائبریری، اتر پردیش، 2006، ص 45

2 جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، مجلس ترقی ادب، کراچی، 2006، جلد 1، ص 78

3 فرمان فتح پوری، اردو نثر کا فنی ارتقا، سنگ میل پبلی کیشنز، 2012، ص 112

4 UNESCO, Language and Digital Technology, پیرس: یونیسکو پبلشنگ، 2018، ص 67

Zakir Ahmad Kumar
Research Scholar
Central University of Kashmir
Kashmir - 190006 (J&K)
zakirahkumar@gmail.com
Mob.: 9797248155

سنسکرت شعریات

عتیق اللہ

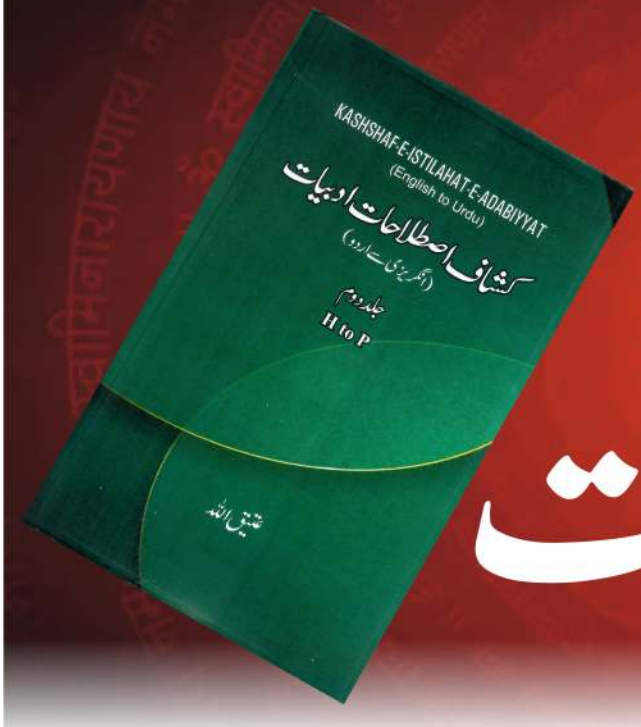

سنسکرت زبان کی وہ تاریخ جو منظر میں ہے وہ بھی صدیوں پر محیط ہے، اور وہ تاریخ جو ماقبل تاریخ ہے وہ کتنی صدیوں پر مشتمل ہے، اس کا تصور محال ہے۔ سنسکرت، ہند آریائی زبان ہے اور یونانی لاطینی کی ہم نژاد اور ان سلاوی Slavonic یعنی ہند یورپی زبانوں کے اس گروہ سے متعلق ہے جس میں روسی پولستانی اور چیک زبانیں شامل ہیں۔ سنسکرت کے قدیم ترین مقدس صحائف ویدوں کو پیرایۂ تحریر تو بہت زمانوں کے بعد ملا وہ نسل درنسل حافظے کے توسط سے منتقل ہوتے چلے گئے۔ ویدوں کو بھی الہامی کہا جاتا ہے ان میں نمایاں یا ذیلی سطحوں پر کیا تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں، کس قدر ترامیم اور اضافے ہوئے یا وہ من وعن اپنی ابتدائی صورت ہی میں ہیں۔ ان سوالوں کے جواب مشکل ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ ویدوں کی زبان، تنظیم آہنگ، جذباتی وفور میں جامعیت کو قائم رکھنے اور سلسلۂ خیال میں موزونیت اور پختہ کاری اور سب سے اہم چیز یہ کہ شعریت جس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر انھیں دو ہزار برس پہلے کے ساوی یا تخلیقی اعجاز سے موسوم کرتے ہیں تو یہ حد بندی بھی محض قیاسی ہے۔ ویدوں تک پہنچتے پہنچتے کئی صدیاں لگی ہوں گی۔ خود سنسکرت کا لوک ادب پردۂ خفا میں ہے۔ ویدوں کو نغمات زبور کی طرح مذہبی تقدیس کا درجہ ضرور حاصل ہے لیکن ان کی شعری عظمت کی اپنی ایک علاحدہ معنی خیز قدر ہے۔ سنسکرت میں کاویہ काव्य کے معنی بنانے کے ہیں اور مصدر بنانا میں شعور کا عمل مقدر ہے۔ عربوں میں بھی شاعری، شعور کے ساتھ مختص ہے لیکن شعری اظہار کا عمل بے ساختہ بھی نمو پذیر ہوتا ہے اور سوچ سمجھے منصوبے کے تحت بھی۔ منصوبہ بند طریقے سے شعر کا عمل شروع ضرور ہوتا ہے، مگر اس کی نوعیت محض محرک کی ہوتی ہے اور بعد کے مراحل میں زبان، روایت اور داخلی فیضان کے تحت شعور کا دباؤ ڈھیلا پڑتا جاتا ہے۔ اسی لیے سنسکرت سے منتقل ہونے والا یہ مشہور قول مسلمات میں سے ہے کہ: 'جہاں نہ جائے روی وہاں جائے کوی'

ویدوں کی تشریح وتفسیر کی ایک پوری تاریخ ہے۔ جس طرح قرآن مجید کی تفسیر میں محکمات اور متشابہات کو اخذ کیا جاتا ہے اسی طرح ویدوں سے جو معنی ظاہر ہے اسے اُکت उकुत کہا گیا ہے اور جو مخفی ہے وہ نِرُکت निरुकुत کہلاتا ہے۔ ویدوں کی تفسیر کی ایک پوری تھیوری ہے جس کی بنیاد پر وہ تفاسیر جو ساتویں صدی تک بیان کی گئیں اور ان تفاسیر کے مجموعے جو ساتویں سے تیرہویں صدی تک شنکر آچاریوں نے مرتب کیے، ان کی مذہبی قدر ومنزلت ہے۔ ان رشیوں منیوں کے لیے ان کی شعری ذکاوت اور جمالیاتی رنگ وآہنگ کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ رگ وید کو سب سے قدیم کہا جاتا ہے۔ وید ہوں کہ نغمات زبور یہ سب حمدیہ جذبات سے معمور ہیں۔ دیوتاؤں یا خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایسی زبان اور لحن کی ضرورت ہے جس میں روحانی کشش آوری اور عظمت و رفعت ہو۔ یہی وہ اوصاف ہیں جن کے باعث یہ صدیوں تک یادداشتوں میں محفوظ رہے اور ایک ہزار قبل مسیح میں ان کی باقاعدہ تدوین ہوئی۔ دنیائے لسانیات کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ پہلے زبان نے اپنی مکمل شکل بنائی، زبانی اور پھر پیرایۂ تحریر میں منتقل ہوئی جو صدیوں کے سفر کے بعد کی منزل ہے اور پھر اس کے قاعدے بنائے گئے یہی صورت شاعری کی ہے زبانی روایت جو صدیوں پر محیط ہوتی ہے، اس کے بعد پیرایۂ تحریر ملنے کے بعد بھی ایک زمانے تک اس کے قاعدوں کو مرتب نہیں کیا جاتا۔ پھر کوئی پانی पाणिणि جیسا عالم ودانش ور پیدا ہوجاتا ہے جو زبان کا مطالعہ بڑی نکتہ رسی سے کرتا ہے اور صرفی ونحوی قاعدے تشکیل دیتا ہے۔ دنیائے لسانیات میں پانی کی تصنیف کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔

پانی نے زبان اور اس کے قواعد یعنی لفظوں کے عمل پر اپنی تحقیق کی بنیاد وضع کی تھی۔ تب کہ آچاریہ بھرت نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف ناٹیہ شاستر नाट्य शास्त्र میں ڈراما اور شاعری کے قواعد ولوازم کی تلاش وجستجو کی اور انھیں ایک تھیوری کی شکل میں پیش کیا۔ سنسکرت میں شاستر علم کے معنی میں ہے۔ جیسے ارتھ شاستر अर्थ शास्त्र علم الاقتصادیات کہلاتا ہے۔ یونان وہند میں بھی رقص و موسیقی، مجسمہ سازی، مصوری وغیرہ فنون کی طرح ڈرامائی فن بھی قدیم ترین ہے جو یک لخت وجود میں

نہیں آیا۔ دیوتاؤں کی خوشنودی ان کا خاص مقصود تھا۔ آچاریہ بھرت کی تصنیف کے بارے میں یہی قیاس ہے کہ غالباً یہ پہلی صدی عیسوی کا کارنامہ ہے۔ ارسطو نے 'بوطیقا' میں ڈرامائی تکنیکوں، شعری زبان کے عمل اور شاعری کے اصولوں کو اس طور پر ہم آمیز کر دیا ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کے معنی خیزی کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ آچاریہ بھرت نے ناٹک میں کرنے کے عمل کو دیکھنے سے نسبت دیتے ہوئے اسے درشیہ کاویہ (باصراتی شاعری) اور شاعری کو شرویہ کاویہ (سمعیاتی شاعری) کہا ہے۔ ارسطو نے نقالی اور بیان سے تعبیر کیا ہے۔ ڈرامے میں شاعری کو ڈرامائی عمل اور ڈرامائی عمل کو شاعری سے الگ کر کے تعریف و تجزیہ تو کیا جاسکتا ہے لیکن قدیم ڈراموں میں دونوں پہلو ایک دوسرے میں حل ہوکر اسے جمالیاتی وحدت عطا کرتے ہیں۔ عنبر بہرانچی کہتے ہیں لفظ 'رَس' کے معانی کا سفر کثافت سے لطافت کی طرف عنصری کائنات سے ماورائی کائنات کی طرف ہوا۔

آچاریہ بھرت کے بعد سنسکرت پنڈتوں نے شاعری کے اصولوں کے تعین میں رسوں کو خاص اہمیت دی ہے۔ رَس रस کے لغوی معنی حاصل، نچوڑ، جوہر کے ہیں۔ مجازی معنی حظ وانبساط اور وصف و امتیاز کے ہیں یعنی ذہنی و جذباتی ردعمل سے پیدا ہونے والی وہ کیفیت یا کیفیات جن کا تعلق ہمارے نظام محسوسات سے ہے۔ ارسطو نے کیتھارسس (تزکیہ وتطہیر) کا جو تصور دیا تھا وہ المیہ میں جذباتی بحران کے بعد پیدا ہونے والے احساس طمانیت کے ساتھ مخصوص ہے۔ وہ کہتا ہے کہ المیہ رحم اور خوف کے ذریعے جذبات کا تنقیہ (اخراج) کرتا ہے، ارسطو نے رحم اور خوف جیسے جذبات کی برانگیختگی کی بات کہی تھی۔ سنسکرت جمالیات میں رس کا تصور کافی وسیع ہے۔ رس کے تصور کی وضاحت تو ویدوں میں نہیں ہے لیکن مختلف سیاقات میں اسم صفت کے طور پر اس کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ رگ وید ऋग्वेद، اتھر وید अथर्ववेद سے اُپنشدوں उपनिषदों تک رس کے معنی میں اختلاف کے بجائے بسط و کشادگی کی صورت پیدا ہوتی گئی۔

رس کی ایک صورت خالص ارضی اور دوسری مجازی ہے۔ ارضی سطح پر وہ تاثر جو حواسی ردعمل کے طور پر ہمارے اندر ارتعاش پیدا کرتا ہے، وہ از خود رونما نہیں ہوتا، اس کا کوئی معروض و محرک ہوتا ہے۔ کسی معروض و

سنسکرت، ہند آریائی زبان ہے اور یونانی لاطینی کی ہم نژاد اور ان سلاوی Slavonic یعنی ہند یورپی زبانوں کے اس گروہ سے متعلق ہے جس میں روسی پولستانی اور چیک زبانیں شامل ہیں۔ سنسکرت کے قدیم ترین مقدس صحائف ویدوں کو پیرایۂ تحریر تو بہت زمانوں کے بعد ملا وہ نسل در نسل حافظے کے توسط سے منتقل ہوتے چلے گئے۔

محرک کے بغیر ہمارے نظام محسوسات کا مرتعش ہونا اور اس کا کسی خاص کیفیت میں ڈھل جانا ممکن نہیں۔ 'کسی آواز کو سن کر' کسی بو کے شامی تجربے سے گزر کر، کسی خاص عمل کو دیکھ یا خود اس عمل کے تجربے سے گزر کر خواہ وہ جنسی حظ آگیں ہی کیوں نہ ہو یا کسی چیز یا ذی روح کو چھو کر یا کسی شے کو چکھ کر ہم مختلف نوع کے تجربے سے گزرتے ہیں اور ہر تجربے کا کوئی مخصوص نام ہے۔

کرشنا چیتنیہ نے بھی یہ اشارہ کیا ہے کہ آچاریہ بھرت نے تصور شعر کا جو خاکہ بنایا ہے اسے ڈراما، اسٹیج اور اس کے لوازم جیسے اداکار اور مختلف مناظر کے ساتھ ربط دے کر دیکھنا چاہیے۔ حتیٰ کہ تصور آفاق اور اسے ناٹک میں پیش کرنے کے بارے میں جو تصور ہے اس کا شاعری سے کم دکھانے کے عمل سے زیادہ ہے۔ شاعری میں دونوں ایک دوسرے میں تحلیل ہوکر لایتجزّا کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ شاعری میں تاثر کو عرب بھی خاص اہمیت دیا کرتے تھے۔ شاعری وہاں بھی بنیادی طور پر سنانے کی چیز تھی اور سنانے والا کاٹھ کا بنا ہوا نہیں ہوتا تھا، وہ پورے وجود کے ساتھ بولتا ہے۔ اس کی زبان ہی نہیں، آنکھ، ابرو، ہاتھ، گردن بھی زبان بولتے ہیں اور جو ابلاغ کے عمل پر بھی مہمیز کرتے ہیں۔ 'رَس' صحیح معنی میں اثر خیزی اور معنی خیزی کا منبع ہے۔ بھامہ اور دنڈی جیسے پنڈتوں سے لے کر پنڈت راج جگناتھ (18ویں صدی عیسوی) تک رس، النکار، ریتی रीति، دھونی ध्वनि، وکروکتی वक्रोक्ति، اَوچتیہ औचित्य وغیرہ پر بحث ہوتی رہی اور بیش تر صورتوں میں تشریح اور از سر نو تشریح کا سلسلہ جاری رہا۔ سنسکرت شعریات کا ساتویں اور آٹھویں صدی تک کے ناٹکوں اور شاعری پر اطلاق بھی ہوتا رہا لیکن اطلاق سے زیادہ شعریات کی گتھیاں سلجھانے اور الجھانے کی طرف زیادہ توجہ رہی۔ سب سے زیادہ ویدک، کالیداس اور بھرتہری کی شاعری حوالہ بنی رہی۔ سنسکرت زبان عوام کی زبان نہیں بن سکی اور جب تک درباروں کی رونق قائم رہی۔ سنسکرت کتھاؤں، ناٹکوں اور شاعری اور دوسرے فنون کی سرگرمیاں بھی عروج پر رہیں۔ محض امرا و روسا، راجہ مہاراجوں تک محدود ہونے اور عوام سے دوری کے باعث ایک عظیم زبان اور اس کے نظام روایت کے سوتے خشک ہوگئے۔

آچاریہ بھرت نے ارسطو اور ساختیات کی طرح رس کے اصولوں کو ڈرامائی تخلیقات سے اخذ کیا اور پھر ان کا اطلاق بھی کیا۔ آچاریہ بھرت نے ناٹیہ شاستر (ڈرامے کا فن یا علم) میں ڈرامے کے خارجی اور داخلی اجزا کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا اور نتائج اخذ کیے۔ رس پر انھوں نے ابواب 6 اور 7 میں جو بحث کی ہے وہ جتنی ٹھوس اور مجرد ہے اس سے کم فلسفیانہ نہیں ہے۔ رسوں ہی کی نسبت سے وہ ڈرامے اور ڈراما نگار کے فلسفہ زندگی اور تصور آفاق World view کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرتے ہیں۔ شاعری کے فن کو وہ اس سے الگ درجہ نہیں دیتے بلکہ ڈرامائی تکنیکوں اور وسائل وعوامل سے پرے تخلیقی تنظیم کو موثر ترین بنانے کے لیے شاعری کا کردار ساتھ ساتھ عمل آور ہوتا ہے۔ آچاریہ بھرت کی مطالعاتی دریافت میں ان کی فلسفیانہ بینش اور نفسیاتی ذکاوت جس طور پر بہر پہلو کارفرما ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ صدیوں سے ان پر بحث کا سلسلہ جاری ہے۔ بھرت کے مطالعات میں اضافے کی گنجائش تو نکالی جاتی رہی، انھیں کوئی مسترد کر سکا اور نہ انحراف کر سکا۔

آچاریہ بھرت رَس کے تعلق سے محسوسات کو معروضیانے کے عمل سے وابستہ کرتے اور معروضی تلازمات Objective correlatives کی تخلیقی تنظیم کو ایک تقاضے کے طور پر اخذ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ مختلف بھاؤ پر منطقی بحث کرتے ہوئے (جذبوں)، استھائی بھاؤ

Sthai bhavas (مستقل جذبہ)، وبھاؤ Vibhavas (مستقل جذبے کا محرک) انبھا Anubhavas (ان جذبوں کومعرض اظہار میں لانے کاعمل)، سنچاری بھاؤ Sanchari bhavas (ترسیلی یا عارضی جذبات) اور ساتوک بھاؤ Satwik bhavas (فطری جذبہ) کی عمل آوری کی توضیح کرتے ہیں۔ آچاریہ بھرت نے نمایاں طور پر جن چار رسوں کو بنیادی اہمیت دی ہے وہ ہیں۔ شرنگار رس (رومانوی یا احساس جمال کا مظہر) رَودر رس रौद्र रस (کراہیت اساس)، ویر رس वीर रस (رزم وشجاعت کا مظہر) وی بھتس رس वीभत्स रस (بھیانک اساس)۔ ان کے تحت کئی ضمنی رس بنائے گئے۔ بقول عنبر بہرائچی: آچاریہ بھرت نے بھاؤں یعنی جذبات کی تعداد 49 بتائی ہے۔ مستقل یا غالب جذبات کی تعداد 8 اور ویبھچاری بھاؤ کی تعداد 33 اور ساتوک सात्विक یعنی فطری جذبات کی تعداد 8 بتائی ہے۔ وبھاؤ، انوبھاؤ اور ویبھچاری بھاؤ کے باہمی اتصال سے اس کی نمو پذیری ہوتی ہے۔'' (سنسکرت شعریات) آچاریہ بھرت کا کہنا ہے کہ مشاہدہ خود ایک تجربہ ہے جو معنی کو متمول اور ابلاغ کو سہل بناتا ہے۔ جس کے بغیر تکمیل یافتہ اسلوب بھی کورا برتن ہے۔ رَس خود معنی اور معنی نما ہوتا ہے۔ بھرت نے نمایاں اور ذیلی جذبات کی تعداد ایک سو سے زیادہ بتائی ہے۔ ظاہر ہے یہ تمام جذبات انسان متعلق Human concern ہیں۔ محبت، نفرت، کراہیت، درد واذیت، ہنسی، مزاح، غصہ، خوف، حیرت، ولولہ، احساس جمال، شجاعت، بھیانک وغیرہ۔ واتساین نے شہوانیت کو عرفانیات کے ساتھ ربط دے کر اس کا ایک پاکیزہ تصور قائم کیا۔ رَس کو روحانی انبساط اور طمانیت سے بھی تعبیر کیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں آچاریہ بھرت کے ڈرامائی فن کو رسوں کے توسط سے جام جمشید کا نام دیا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ''صرف ڈراما ہی تنہا دنیا بھر کو محیط فن ہے جو انسانی فطرت لوک سو بھاؤ نجن، (Loka-savbhavanjan) سے سارا مواد اخذ کرتا ہے۔ ڈرامائی نمائندگی کے سلسلے میں وہ ایک سند (پرمان Praman) ہے۔ دنیا کے تعلق سے بھاؤ (جذبہ) اور چیشٹا Cheshta (اعصابی حرکت وسکنت سے داخلی جذبے کا اظہار)، طرزعمل) اور وہ جو حرکت میں ہے اور جو حرکت میں نہیں ہے۔ سب اس کے احاطے کی چیزیں ہیں۔ ڈراما دنیا کے کردار و عمل کا تنوع دکھاتا ہے۔ ڈراما Weltanschauurg تصور آفاق یا فلسفۂ زندگی کی نمائندگی کا ذریعہ اور جس دنیا کو وہ پیش کرتا ہے وہ حقیقت کا قابل اعتبار تصدیق کا سرچشمہ ہے۔ گویا رس ارضی تجربے کو مختص ہے وہ دنیاوی تجربے سے الگ کوئی چیز نہیں ہے البتہ رس کا وہ عمل جو ناظر، سامع یا قاری پر منتج ہوتا ہے اس کی نوعیت تجریدی ہے۔ یہاں پہنچ کر رس کی خارجی نوعیت باطنی عمل آوری کے ساتھ مربوط ہوجاتی ہے۔

آچاریہ بھرت نے رَس کو اپنی تھیوری میں عین مرکز میں رکھا ہے۔ النکار کاحوالہ ان کے یہاں کہیں نہیں ملتا لیکن صنائع کا ملتا ہے۔ ناٹک کے عمل کو سامنے رکھیں تو راست ترسیل اور اظہار کی شفافیت کی اہمیت دونی ہوجاتی ہے۔ بھرت کے یہاں ڈراما فلسفۂ زندگی کی نمائندگی کرتا ہے اور مختلف اداکاروں کی حرکت و سکنت اور ہر منظر رس اور زندگی کے فلسفے سے جڑ جاتا ہے۔

رس کی تھیوری کی معنی خیزی اس اعتبار سے مستحکم ہے کہ وہ شعر یا ڈرامے کو انسانی جذبات ونفسیات کے ساتھ ملحق کرتی ہے، دوسرے یہ کہ قاری کو بھی ایک بلند منصب عطا کرتی ہے۔ تیسرے یہ کہ ارسطو کے کیتھارسس کے تصور کے مقابلے میں وسیع الذیل معنی کی حامل ہے۔ چوتھے یہ کہ ساختیاتی سطح پر تخلیقی فن سے اصول سازی پر بنائے ترجیح رکھتی ہے لیکن یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ یہ ضروری تو نہیں کہ ہر جذبے کا ردعمل تمام قاریوں پر یکساں ہو۔ بعض قاری بے حد جذباتی اور حساس ہوتے ہیں۔ ان کے تاثر میں شفافیت اور شدت ہوتی ہے۔ بعض قاری منطقی ذہن رکھتے ہیں اور اسباب وعلل اور مناسبتوں پر غور کرتے ہوئے چلتے ہیں، ان کے لیے جذبے کا کوئی منطقی جواز ہونا لازمی ہے۔ بعض قاری کند ذہن یا سرسری دیکھنے اور پڑھنے والے ہوتے ہیں ہر جذبے کی قیمت کو سمجھنا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ اس طرح قاریوں کے الگ الگ حلقوں کے رسوں کی الگ الگ معنویت ہے۔ کوئی حس مزاح سے عاری ہوتا ہے اور کسی کے لیے عشق ومحبت دماغ کا خلل ہے اور کوئی بھیانک یا ڈراؤنے منظر یا بہروپ دیکھ کر ہنسنے لگتا ہے اور کسی کی نیندیں اڑ جاتی ہیں، اُتساین کی کام شاستر یا کھجراہو کے مباشرتی آسنوں کو دیکھ کر کوئی ان سے شہوانی تحریک اخذ کرتا ہے، کوئی اسے استغراق کی بلند ترسطح سے موسوم کرتا ہے اور کسی کے لیے وہ فن کے غیر معمولی تجربے کے مظہر ہیں۔ اسی لیے رس حرکت ہی حرکت ہے۔

آچاریہ بھرت نے رَس کو اپنی تھیوری میں عین مرکز میں رکھا ہے۔ النکار کا حوالہ ان کے یہاں کہیں نہیں ملتا لیکن صنائع کا ملتا ہے۔ ناٹک کے عمل کو سامنے رکھیں تو راست ترسیل اور اظہار کی شفافیت کی اہمیت دونی ہوجاتی ہے۔ بھرت کے یہاں ڈراما فلسفۂ زندگی کی نمائندگی کرتا ہے اور مختلف اداکاروں کی حرکت و سکنت اور ہر منظر رس اور زندگی کے فلسفے سے جڑ جاتا ہے۔ اسٹیج کرافٹ کی جھلکیوں کے معنی محض خارجی آرائش وزیبائش کے نہیں ہیں بلکہ رسوں کو شدید تر کرنے، اور زیادہ معنی خیز بنانے اور ابلاغ کے عمل کو مکمل کرنے میں بھی وہ معاون ہوتی ہیں۔ یہ جھلکیاں مافیہ اور مواد سے ان کے گہرے تعلق کی بھی مظہر ہیں۔

ایک سادہ بیان اور دوسرا صناعانہ بیان ہوتا ہے۔ نثر میں انشا پردازی کے جوہر دکھانے کا مقصود بھی زبان کی خارجی چمک دمک سے مرعوب کرنا ہے۔ انشا پردازی میں بھی مشابہتوں، لفظی ترکیبوں، بدیعیانہ وسیلوں کو جابجا استعمال کے ذریعے سجع کاری کی جاتی ہے۔ آچاریہ بھامہ کے بعد آچاریہ رُورٹ اور جے دیو، ڈنڈی اور آچاریہ وامن النکار کو شاعری کی شناخت کا اہم ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ بھامہ، معنی کی پیچیدگی کو ایک خاص وصف سے تعبیر کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ وصف خاص بھی صنائع بدائع اور تزئین کلام وترصیع کلام سے پیدا ہوتا ہے۔ النکار سے شعر میں جھنکار اور ارتعاش کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ عربی و فارسی میں بھی لفظ ومعنی کے تعلق سے جو مباحث ہوئے ہیں ان میں لفظ پر زیادہ ترجیح ہے۔ لفظ لغوی سے زیادہ مجازی معنوں میں متوجہ کرتا اور 'بلیغ' ہوتا ہے۔ صنائع ایک طرف ترصیع سخن کے موجب ہوتے ہیں اور دوسرے شعریت کی تاثیر کو دوبالا کرتے اور تیسرے کلام کو ایک خاص منصب کرتے

ہیں۔سنسکرت پنڈتوں نے اس کے علاوہ النکار کو بھی خاص اہمیت دی ہے۔کسی نے رَس کو النکار پر اور کسی نے النکار کو رس پر اور کسی نے دونوں کی مساویت پر ترجیح دی ہے۔ عمیق حنفی نے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ:

''بھامہ، دنڈی، ادبھٹ، رُودرت، ڑیٹک اور پی یوش ورش وغیرہ نے النکار کو ہی کاویہ کی آتما مانا ہے۔ آنند وردھن، وامن، کنتک، ممّٹ اور وشوناتھ کے نزدیک النکار شعر کے ظاہری حسن وتزئین کا وسیلۂ محض میں لفظ کا غیر معمولی استعمال النکار کی جان ہے۔''

(عمیق حنفی: چیزے دیگر است 1996، ص23)

اس کے بعد وہ کہتے ہیں:

''نویں صدی عیسوی سے شاعر اور علمائے شعر، النکاروں کے تکلف اور بوجھل آداب سے پنڈ چھڑانے کی کوشش میں لگے ہوئے نظر آتے ہیں، صناعی اور لفاظی ہی مقصد شاعری نہیں ہوسکتے نہ الفاظ سنگ و خشت ہیں اور نہ شاعری معماری۔'' (ایضاً، ص34)

دھونی ध्वनि صوت کی تھیوری میں لفظ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا گیا ہے، لیکن لفظ کے بعد لفظ سے پَرے اور لفظ کے اندر بھی ایک دنیا ہے۔شاعری میں لفظ کا ظاہری معنی ہی اس کا حقیقی معنی نہیں ہوتا۔شاعری اسی لیے شاعری ہے کہ وہ اپنی کم بساط میں بھی ایک جہان آباد کردیتی ہے جہاں توقع اور غیر متوقع، واقعی اور غیر واقعی، حقیقت اور غیر حقیقت کی تفریق بے معنی ہوجاتی ہے۔سنسکرت میں ویینجنا व्यंजना وہ بیان جو بغیر آواز کی مدد کے نہیں بولا جاسکتا، ہمارے اندر کے جذبوں وغیرہ کو ظاہر ہونے، کرنے یا واضح صورت میں ادا کرنے کا عمل یا جذبہ/ لفظ کی وہ طاقت جس سے سامنے کے علاوہ ایسے معانی یعنی مجازی، معنی سے بھی سابقہ پڑتا ہو جو مخفی ہوں۔اس طرح دھونی میں ویینجنا شکتی کی خاص اہمیت ہے۔ دھونی کا بنیادی نظریہ آچاریہ آنندوردھن کا تشکیل کردہ ہے جنھوں نے اپنی تصنیف دھونیا لوک (نویں صدی عیسوی) میں آواز کو شاعری کی آتما قرار دیا ہے۔ جسے وہ شاعری میں رس، النکار کے بعد تیسری قوت سے تعبیر کرتے ہیں۔ آنندوردھن کا نظریۂ صوت دراصل ترکیبی ہے انھوں نے سنسکرت شعریات کی روایت سے اخذ کرکے اس کی توسیع کی۔لفظ کو ایک قوت سے تعبیر کیا، جس کے ایک ظاہری، مروج اور لغوی معنی ہوتے ہیں دوسرے

آنندوردھن کا نظریۂ صوت دراصل ترکیبی ہے انھوں نے سنسکرت شعریات کی روایت سے اخذ کرکے اس کی توسیع کی۔لفظ کو ایک قوت سے تعبیر کیا، جس کے ایک ظاہری، مروج اور لغوی معنی ہوتے ہیں دوسرے مجازی جو محض اشارہ کرتے ہیں۔

مجازی جو محض اشارہ کرتے ہیں۔لفظ میں اگر یہ قوت نہ ہو تو شعر سے پس شعر کے اس جہاں آباد کا تصور بھی محال ہے، جس کی گرہ کھلنے کے معنی جادو اور انکشاف کے ہیں لیکن آنندوردھن کا کہنا ہے کہ لفظ کی اس قوت کو سمجھنا اور اسے ادا کرنا ہر شاعر کے بوتے کی چیز نہیں، مشق وممارست اور چیزوں کے باطن میں پہنچنے والی نظر بھی درکار ہے۔آنندوردھن کے ان خیالات کو آچاریہ کنتک कुन्तक نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

''مخصوص لفظ اور مخصوص معنی ہی شاعری ہے۔ لفظ، صرف ونحو میں اشاراتی صوت کی شکل میں موجود ہے اور معنی، دال کی شکل میں عام ہے لیکن شاعری میں ان دونوں کی شکلیں مختلف ہوجاتی ہیں کیونکہ شاعری ارضی ہوتے ہوئے بھی ماورائی عناصر سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔اس لیے شاعری میں مستعمل الفاظ اور معانی اپنی انھیں شکلوں تک محدود نہیں رہتے جو کہ دنیا میں عام طور پر مشہور ہیں۔ یہاں لفظ کے روپ میں وہ لفظ منتخب کیا جاتا ہے جس کے بغیر منشائے شاعر طلوع نہیں ہوسکتا۔'' (عنبر بہرائچی: سنسکرت شعریات، ص176)

سنسکرت شعریات میں مختلف علما نے لفظوں کے محاسن کی تعداد بھی بتائی ہے۔ الفاظ تزئین کے ساتھ متنوع معانی، اسمائے صفات، اقدار اور جذبات کے مظہر ہوتے ہیں۔'دھونی سدھانت نے ان کا رشتہ الفاظ کے معنوں سے نہیں سیدھے رَس سے جوڑا۔' بھرت اور دنڈی نے شبد کے دس گن گنائے تھے..... ممٹ نے انھیں تین قرار دیا۔ مادھریہ माधुर्य حسن، احساس مسرت، شیرینی، وقار اور لطف عطا کرنے والا وصف، دوسرا اوج ओज (قوت، جلال، مردانگی، طمطراق، ہمت وشجاعت، اشتعال اور جوش خودی بیدار کرنے والا گن۔ پرساد (प्रसाद) تبرک، تحفہ، ثواب، احسان دعاؤں کی قبولیت کے احساس کا یقین میں بدلنا، برکت کے حصول اور توسیع کا احساس۔(عمیق حنفی)

شعری اسلوب کی کمال آفرینی اور مجموعی تاثر کی سبیل نظام الفاظ ہوتا ہے۔ نظام الفاظ کے استعمال کی ہزار شکلیں ہیں۔ شاعر، میدان شاعری میں سب سے آزاد اور بے نیاز قوم ہوتی ہے۔آچاریہ وامن کا نویں صدی عیسوی سے تعلق ہے، ان کی تصنیف کاویہ النکار سوتر काव्यालंकार सूत्र میں ماضی کے علمائے شعریات کے تصورات کو نئے معنی بھی دیے اور شعری اظہار اور استعالات زبان کے ان اوصاف پر اپنے خیالات کی بنیاد رکھی جو ایک کو دوسرے سے متمائز کرتے ہیں۔ النکار پسند اظہار کے عمل میں لفظ کو خاص اہمیت دیتے ہیں اور وامن کی نظر میں بھی لفظ خیال یا دوسرے لفظوں میں معنی پر مرجح ہے۔ رس میں سارا زور محسوسات کے عمل پر ہے۔لفظ اپنے جوہر سے پہچانا جارہا ہے۔ کے سی پانڈے رس کو النکار پر ترجیح دینے کے باوجود النکار کو شعر کی روح قرار دیتے ہیں۔ افلاطون کے لیے جوہر ہی اوّل وآخر ہے۔ وامن محسوسات کے عمل کو شاعری کے ساتھ ربط ضرور دیتے ہیں، لیکن دستار فضیلت لفظ ہی کے لیے مخصوص ہے۔ وامن جمال پرست رومانی ہیں وہ لفظ کو شکتی مانتے اور شکتی کے کئی روپ ہیں۔لفظ کی شکتی حسن و جمال ہے اور جمال آفرینی اسلوب کا سروکار ہے۔عنبر بہرائچی نے وامن کے نظریۂ اسلوب پر بحث کرتے ہوئے وصف गुण کی معنویت کو بھی واضح کیا ہے:

''وامن نے شاعری کی زیب وزینت کی مخصوص علت، وصف کو مانا ہے۔ چونکہ علامتی شکل میں شاعری کو لفظ اور معنی کا اتصال مانا جاتا ہے۔اس لیے وامن نے وصف کی دو قسمیں بتائیں۔ اوّل وصف لفظ اور دوئم وصف معنی۔'' (ایضاً، ص78)

رَس اور النکار کے مباحث ہوں یا دھونی کے لفظ سے بات شروع ہوتی ہے اور کسی نہ کسی زاویے سے اس کا رخ معنی کی طرف ہوجاتا ہے۔ محض لفظ، اسلوب قائم کرتا ہے نہ محض معنی بلکہ دونوں کا اشتراک ہم بود و ہم وجود ہوتا ہے۔ درحقیقت لفظ 'معنی زائدہ ہوتا ہے'

معنی لفظ زائدہ نہیں ہوتا۔ ہم معنی کو لفظ کے آگے پیچھے اس کے باطن میں تلاش کرتے ہیں جب کہ وہ اس طور پر لفظ میں مضمر ہوتا ہے جیسے تاریکی وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے روشنی شروع ہوتی ہے اور روشنی بھی وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے تاریکی شروع ہوتی ہے اور ہم دونوں کو بانٹنے والی لکیر کو بس ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں۔

ایس کے ڈی، رس کی تھیوری کو سنسکرت شعریات کا منبع اور النکار، دھونی، رتی وغیرہ کو ایک دوسرے کی توسیع خیال کرتے ہیں۔ سنسکرت آچاریوں کا احساس جمال بہت حساس تھا۔ انھوں نے شعریات پر غور وفکر پر قدغن نہیں لگائی۔ وہ ماضی کے تصورات اور دریافتوں میں لطافت کا رنگ بھرتے رہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے مانجھتے چلے گئے۔

نویں دسویں صدی عیسوی کے آچاریہ کنتک نے بھی اسلوب پر بے حد دقیق بحث کی ہے۔ ان کی تصنیف वक्रोक्ति जीवितम (وکر وکتی جیوتم) میں انھوں نے تقریباً ان تمام عوامل کا احاطہ کرلیا ہے جو کسی اسلوب کو منفرد اسلوب میں بدلنے کا کارانجام دیتے ہیں۔ عمیق حنفی نے وکروکتی کے لغوی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ: وَکر वक्र یعنی ٹیڑھا میڑھا، آرا تر چھا اور اُکتی उक्ति یعنی بیان، اظہار، قول۔ گویا پیچیدہ قول۔ بیان مستدیر، اظہار منحنی، طنزیہ نگارش، گھُما پھرا کر کہی گئی بات وَکروکتی ٹھہری۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں: کنتک کے لیے وکروکتی اُم الصنائع ہے کیونکہ ہر صنعت اور ہر بدعت کسی لفظ 'بندش' محاورے، جملے یا مصرعے کے معانی وہ نہیں رہنے دیتی جو سطح پر نظر آتے ہیں یا جنھیں الفاظ اور ان کے رشتے ظاہر کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ تمام النکار انھیں ادا کرنے والے یعنی ان کے مصنف یا شاعر کے ارادہ ومقصد تک یا اس کے قریب پہنچا دیتے ہیں، ان کے برتنے سے شعر بلیغ ہوجاتا ہے۔ (ص106)

آچاریہ واس بھی صنائع بدائع کو شعری اسلوب کی محض ظاہری زیب و زینت تک محدود کرکے نہیں دیکھتے۔ انھیں شاعر کے احساس جمال کا آئینہ دار اور شعر کی قوت سے موسوم کرتے ہیں اور جو اسے قرأت نواز بناتے ہیں زبان و بیان میں معنیاتی پیچیدگی یا صنائع بدائع کا استعمال سادہ بیانی کے منافی نہیں ہے۔ شفافیت اور ابلاغ کی سب ہی نے تاکید کی ہے اور لفاظی اور اطناب سے گریز کو خاص اہمیت دی ہے جسے پرساد Prasad کہا گیا ہے۔ سنسکرت مثنوی روایت نے ویدربھی Vaidarabhi طرز اظہار کو گاؤدی Gaudi یعنی طویل مرکب پر ترجیح دی ہے۔ بھرت کا اصرار بھی اسلوب کے اس پہلو پر زیادہ ہے۔ سنسکرت شعریات کا سفر صدیوں پر محیط ہے اور تصور سازی سے زیادہ تصورات میں تال میل پیدا کرنے اور تشریح در تشریح کے عمل نے اسے ایک بسیط میدان فراہم کردیا۔ یونانی، عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں میں شعریات کے سلسلے میں جو تصورات قائم کیے گئے، جو تشریحات عمل میں آتی رہیں، اختلافات، ترمیمات اور اضافات

ایس کے ڈی، رس کی تھیوری کو سنسکرت شعریات کا منبع اور النکار، دھونی، رتی وغیرہ کو ایک دوسرے کی توسیع خیال کرتے ہیں۔ سنسکرت آچاریوں کا احساس جمال بہت حساس تھا۔ انھوں نے شعریات پر غور وفکر پر قدغن نہیں لگائی۔ وہ ماضی کے تصورات اور دریافتوں میں لطافت کا رنگ بھرتے رہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے مانجھتے چلے گئے۔

کی جو صورتیں پیدا ہوتی رہیں وہ خاص دلچسپ اور علم افزا ہیں۔ سنسکرت ادب کی تخلیق کا سلسلہ تو رک گیا، لیکن یونانی، عربی، فارسی، اردو اور ہندی کے علاوہ دوسری جدید ہند آریائی زبانوں میں جاری ہے۔ یونانی بھی یونان قدیم زمانے کی نہیں رہی۔ عربی و فارسی کے علاوہ دوسری جدید زبانوں کے ادب نے قدیم شعریات سے بہت کچھ اخذ کیا ہے جو اخذ کیا ہے وہ ان زبانوں کے لاشعور کا حصہ ہے۔ نئے سائنسی اور سماجی علوم کی غیر معمولی ترقی نے تخلیقی منظر نامہ بہت کچھ بدل دیا ہے۔ ہم صرف اور صرف قدیم شعریات کے اطلاق تک ادبی تنقید کو محدود کرکے تخیل کی سرگرمی پر قدغن نہیں لگا سکتے۔ گوپی چند نارنگ نے ساختیات، پس ساختیات سے عربی، فارسی اور سنسکرت کی شعریات کا جو تقابل کیا ہے اور نتائج اخذ کیے ہیں وہ بڑے بلیغ اور معنی خیز ہیں۔ مثلاً ان کا کہنا ہے کہ بھرتہری کا نظریۂ سپھوٹ ساختیاتی لسانیات کے تصور نشان Sign کا پیش رَو ہے (دیکھیے Structuralism)، آنندوردھن کا نظریہ دھونی، دراصل رَس کا ویہ پر تطبیق ہے۔ اس کی بعض تعبیروں میں معنی کے دوسرے پن Otherness پر جو زور ہے وہ معنی کے غیاب میں ہونے کے اس تصور سے ملتا جاتا ہے جسے دریدا نے شد و مد سے نظر بند کیا ہے.... آخری اور سب سے اہم بات یہ کہ نظریۂ رس جو سنسکرت شعریات کی جان ہے اور جس سے شعری جمالیات کے لاتعداد مباحث پیدا ہوئے ہیں، بالکل اسی طرح 'ناظر الاصل' ہے۔ جس طرح قاری اساس تنقید قاری الاصل ہے (تفصیل کے لیے دیکھیں Post-structuralism اور Reader-oriened Criticism)۔ گوپی چند نارنگ نے ناگارجن کے نظریۂ شونیہ یا شونیتا کو ردتشکیلی فکر یا معنی کے دوسرے پن یا معنی کے مستقلاً غیاب میں رہنے یا التوا میں رہنے سے ملتا جلتا بتایا ہے۔ تقابل و تجزیے کی یہ صورتیں قابل قدر ہیں جو ماضی فہمی اور حال فہمی اور ایک دوسرے کے ساتھ نئے معنوی رابطوں کی راہ وا کرتی ہیں۔ کس طرح قدامت کی دانش، حال کی دانش کی پیش روی کرتی ہے اور اجتماعی لاشعور کا حصہ بن کر بار بار اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

آخذ ومصادر

1 گوپی چند نارنگ: ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، 1993
2 عتیق اللہ: ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ (جلد اوّل) 1996
3 عنبر بہرائچی: سنسکرت شعریات، 1999
4 عمیق حنفی: شعر چیزے دیگر است 1983
5 T.Burrow, The Sanskrit Language (1973)
6 S.K. De, Studies in the History of Sanskrit Poetics (1923)
7 K.C. Pandey, Indian Aesthetics (1950)

■

ماخذ: کشاف اصطلاحات ادبیات، **مصنف:** عتیق اللہ، **سنہ اشاعت:** 2025، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

بلوندر سنگھ

رامائن کی معنویت

عصر حاضر کے تناظر میں

جدید سہولیات نے دنیا کو ایک بین الاقوامی گاؤں بنا دیا ہے۔ دور دراز ممالک سے واقفیت کے لیے ہمیں مہینوں لمبے سفر طے نہیں کرنے پڑتے۔ واقعہ یہ ہے کہ بے شمار مال و دولت اور لامحدود تکنیکی و سائنسی ترقی کے باوجود روحانی طور پر ہماری دنیا بے حد غریب ہوگئی ہے۔ روحانی اور اخلاقی طور پر ہم ایک دوسرے سے بہت دور ہوتے جا رہے ہیں۔ موجودہ معاشرہ اخلاقی اقدار سے کوسوں دور ہوتا جا رہا ہے، خصوصاً معاشی طور پر ترقی یافتہ مغربی دنیا میں سخت بے چینی و بے اطمینانی نظر آرہی ہے۔ اس لیے ایک ایسے پارس پتھر کی تلاش ہے جسے چھو کر انسانی ذہن سکون واطمینان حاصل کر سکے۔ ہندستان صدیوں سے رشیوں منیوں کی سرزمین رہی ہے، جس نے مادی ترقی سے پیدا ہونے والے مسائل کو پہلے ہی محسوس کر لیا تھا۔ ان دور اندیش افراد نے فطرت کی گود میں پوشیدہ تباہ کاریوں کو محسوس کرتے ہوئے مادہ پرستی کے برے اثرات سے انسانیت کو بہت پہلے آگاہ کر دیا تھا۔

ہمارے قدیم مفکرین نے اس موضوع پر متعدد گرنتھ تخلیق کیے ہیں، لیکن ان تمام گرنتھوں میں 'رامائن' واحد گرنتھ ہے، جو بے حد موثر اور صاف لفظوں میں، تباہی کے دہانے پر کھڑی انسانیت کے سامنے عملی طور پر ان دائمی اور جاوداں حقائق کو پیش کرتا ہے جو وجود کے تحفظ کے لیے لازمی ہیں۔ یہ گرنتھ واہموں کا شکار، مصیبت زدہ انسان، چاہے وہ مغرب کا ہو یا مشرق کا، ایک مثالی انسان بننے کی ترغیب دیتے ہوئے اس کی رہنمائی کرتا ہے۔

'رامائن' میں بیان شدہ واقعات میں اس عہد کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ قدیم دور میں نئی اقدار کے نئے سماج کی تشکیل ہوئی۔ مذہب نے انسان کو اچھائیوں کی ترغیب دی، لیکن محض دھرم کی تبلیغ سے سماج کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ انسانی اصلاح کے لیے اس کی عادات، کردار، معاشی و سماجی حیثیت مختلف اخلاقی معیارات، کم علمی، لاعلمی اور آرزوئیں غرض یہ سبھی اصلاح ضروری ہیں اور اس کی عکاسی 'رامائن' میں پوری سچائی اور ایمانداری سے ملتی ہے۔ 'رامائن' میں طاقتور، کمزور، بہادر، ڈرپوک، باعلم، بے علم، لالچی، دیش بھکت، فہیم اور کورمغز، ہر طرح کے کردار ہیں۔ ماتا 'سیتا' سے زیادہ خوبصورت، کومل اور پاکیزہ مثال کہاں ہے؟ بھگوان شری رام چندر جی سے زیادہ مہربان اور رحم دل کوئی ہے؟ بے ریا، بے غرض لکشمن سے بڑھ کر کون ہوسکتا ہے، جو اخلاص، سوامی بھکتی اور عقیدت کا مجسمہ ہے۔

آج ایسے مثالی کرداروں کا تذکرہ ہونا بے حد ضروری ہے، جو ہماری نئی نسل کے لیے قابل تقلید ہے۔ ہندستان میں ایسی متعدد عظیم ہستیاں پیدا ہوئی ہیں۔ ایک مشہور عالم کا قول ہے کہ لوک نایک وہ ہوتا ہے جو اپنے لوگوں کے جذبہ آزادی، خودمختاری اور دلیری کی نمائندگی کر سکے۔ 'رامائن' میں فرماں برداری، خودفراموشی، دیش بھکتی، شجاعت اور انصاف پسندی جیسے مثالی اوصاف کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ صدیوں سے ہماری روایات کا حصہ ہیں۔ گاؤں میں جہاں بیشتر افراد پڑھنا لکھنا نہیں جانتے، سب لوگ جمع ہو کر تریتا یگ کی پریرنا (الہام) دینے والی کتھائیں سنتے تھے۔

بھرت محل سے دور نندی گرام میں رام چندر جی کی کھڑاؤں کو سنگھاسن پر رکھ کر ایک سنیاسی کی طرح زندگی گزار رہا تھا اور شترو گن نندی گرام کی ڈیوڑھی پر پہرہ دے رہا تھا۔ لکشمن بن میں رام چندر جی کے ساتھ اور شترو گن بھرت کے ساتھ نندی گرام میں تھا۔ لکشمن کی پتنی ارملا (Urmila)، بھرت کی پتنی مانڈوی (Madavi) اور شترو گن کی پتنی شروتی کیرتی (Shrutakirti) تینوں راج محل میں ماتا کوشلیا کے پاس تھیں۔ ان کے تیاگ، تپسیا اور بلیدان کے بارے میں ہمیں بتایا نہیں جاتا۔ ایسی برہمچارنیوں کی مثال پوری دنیا کے کسی خطے یا مذہب میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔

ہندستان کے عہد ساز سیاست دان جانے انجانے 'رامائن' اور اس میں مذکور قدیم اقدار سے متاثر ہوئے ہیں۔ آج کچھ افراد یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ حالات بہت بدل چکے ہیں۔ اس عہد میں انسان دوستی، حب الوطنی اور سماج کے تئیں ذمے داریاں جیسے جذبات کی اہمیت اب گنے چنے لوگوں تک ہی محدود ہیں۔ موجودہ زمانہ بازار پر منحصر، معیشت کی ٹھیکیداری کا زمانہ ہے، جس میں دوسرے کسی نظام کا دخل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایشیا کے بیشتر ممالک اس نظام معیشت کو اپنا رہے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ان ملکوں کی پالیسی طے کرنے والے مدبر یہ بھی یقینی بنا رہے ہیں کہ بازار کو ہی سب کچھ نہ مان لیا جائے۔ یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ معیشت کی جانب بڑھنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم صدیوں سے چلے آرہے اپنے فلسفۂ حیات یا جیون درشن کو بھول جائیں۔ وہ جیون درشن جو 'رامائن' جیسے گرنتھوں میں بیان کیا گیا ہے۔

دنیا کو سب سے پہلے ہندستان نے غیر جانبداری کا اخلاقی سبق دیا، جس میں حق کی طرفداری شامل ہے کیونکہ 'رامائن' نے یہ سکھایا ہے کہ جب حق و باطل کے درمیان محاذ آرائی ہو، تب 'غیر جانبداری' بے معنی بن جاتی ہے، اور ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم حق کے طرفدار ہوں لیکن اسی کے ساتھ ہمیں رواداری بھی اپنانی چاہیے، 'جیو اور جینے دو' کا اصول بھی اپنانا ہوگا۔ کسی بھی ملک یا گروہ کو اپنے اعتقادات و نظریات دوسروں پر مسلط کرنے کا قطعی حق نہیں۔ غیر جانبداری کا مطلب

بے عملی اور لاتعلقی ہرگز نہیں ہے، غیر جانبداری کا مطلب اقوام عالم کو کسی ڈر، خوف اور دباؤ کے بغیر اپنا دوست منتخب کرنے کا حق دینا ہے۔ 'رامائن' نے اس سچائی کو ہزاروں برس پہلے بیان کر دیا تھا۔ آج کے حالات میں اگر غیر جانبدار تحریک کا وجود نہ ہوتا تو یہ دنیا کب کی تباہ ہو چکی ہوتی۔ انسانیت کو نگلنے کے لیے جب جب جنگ کی آگ بھڑکی ہے، تب تب اس تحریک نے 'فائر بریگیڈ' کا کردار ادا کیا ہے۔ نہ صرف برِاعظم، ایشیا بلکہ مغربی ممالک کے بیشتر علما کی پسند اور تحسین کی مستحق 'رامائن' کی تخلیق ہے۔ ادب، فلسفہ، معاشیات اور سماجی رویوں کے اس صحیفے کی اہمیت آج بھی مسلم ہے۔

اس صحیفے کے سب سے پہلے خالق مہارشی والمیکی جی ہیں۔ چتر کوٹ کے آس پاس 'تماسا' ندی (Tamasa River) کے کنارے مہارشی والمیکی جی کا آشرم تھا۔ یہاں ہی لبھ اور کش (Lave & Kusha) نے ماتا سیتا کے بطن سے جنم لیا تھا۔ چتر کوٹ کے بیچوں بیچ مندا کنی ندی (Mandakani Nadi) بہتی ہے۔ بھگوان شری رام جی، لکشمن جی اور ماتا سیتا نے بن باس کا کافی وقت یہاں صرف کیا تھا۔ یہاں کنارے پر رام گھاٹ ہے۔ روایات یہ بھی ہیں کہ تلسی داس نے یہاں ہی رامائن کی رچنا کی تھی۔ مہارشی والمیکی جی کو زندگی کے مختلف پہلو عزیز تھے اور وہ ان کا احترام کرتے تھے۔ چاہے آسمان میں اڑتا پرند ہو، جنگل میں گھومتا ہرن یا خود انسان وہ سب کے قریب تھے۔ ایک روز ان کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسا سانحہ ہوا جس نے انھیں مضطرب و بے حال کر دیا۔ 'تماسا' ندی کے کنارے کرونچ پرندے کا ایک جوڑا محو محبت تھا تبھی کہیں سے ایک تیر چلا اور ان میں سے ایک کو چھید گیا۔ دوسرے پرندے کی زبوں حالی اور تڑپ دیکھ کر بے اختیار والمیکی کے منھ سے ایک اشلوک نکلا، اس شعری نزول سے خود والمیکی سحر زدہ تھے کہ ندا آئی کہ وہ اسی چھند میں پرشوتم رام کی حیات لکھیں۔ تبھی والمیکی جی نے سات ابواب اور چوبیس ہزار اشلوکوں میں رام کتھا بیان کی۔ ان کے اس صحیفے میں تخیل، زبان اور اسلوب کے ساتھ ساتھ علم اور اعلیٰ آدرش وادی کی بے مثال ہم آہنگی پائی جاتی ہے، اور اس ہم آہنگی نے اس مکمل ادبی اور فلسفیانہ گرنتھ کو عالمی ادب کی عظیم المرتبت تخلیقات کے درجے میں نمایاں مقام دلا دیا۔ کئی صدیوں بعد ملٹن نے لکھا ''ایک اچھا گرنتھ وہ ہوتا ہے جس میں ایک عظیم آتما کا خون جگر شامل ہوتا ہے۔''[1]

یہ جملہ 'رامائن' ہی کو ذہن میں رکھ کر لکھا گیا ہوتا اگر ملٹن کو واقعی 'رامائن' کے مطالعے کا شرف حاصل ہوا ہوتا۔ بے اختیار اس کی زبان سے 'رامائن' کے لیے تعریف وتحسین کے کلمات ادا ہوئے ہوتے۔

مدھر، بے مثال اور پراز معانی 'رامائن' کے جذباتی واقعات کی ڈرامائی پیشکش صدیوں سے ہوتی آئی ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ 'رامائن' محض مذہبی تقریبات کے موقع پر ہی نہیں پڑھی جاتی تھی بلکہ ادبی محفلوں میں بھی اس کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ آج تک نہ جانے کتنے شاعروں، ادیبوں، ڈراما نگاروں اور نغمہ نگاروں کے لیے 'رامائن' ترغیب کا باعث رہی ہے۔ آج بھی 'رامائن' کی وہی عظمت ہے جو آج سے ہزاروں سال پہلے تھی، جب یہ معرض وجود میں آئی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ عوامی زندگی سے گہرا اور براہ راست ربط رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ انسان کے سامنے کوئی مافوق فطرت اور ناقابل عمل مقصد پیش نہیں کرتی۔ اس کے اقوال زندگی کے قریب ہیں، اسے انسان کی کمزوریوں اور اس کی حدود کا علم ہے۔ وہ ان کمزوریوں کو تمسخر کا ہدف نہیں بناتی بلکہ انسان کو ایک معین مقصد کے حصول کی راہ دکھاتی ہے۔ 'رامائن' ہمیں علم وانکسار سکھاتی ہے۔ جیسا کہ مہارشی اروند نے کہا: ''پھلوں سے لدی ہوئی ڈالی جھک جاتی ہے۔''[2]

'رامائن' انسان کے بنیادی وصف، عظمت اور پاکیزگی میں یقین رکھتی ہے۔ یہاں انسان سے مراد مرد اور عورت دونوں ہیں۔ 'رامائن' کے تخلیق کار نے عورت اور مرد کے مابین کبھی کوئی فرق نہیں برتا۔ اس نے دونوں کے جسمانی فرق کو تو قبول کیا، لیکن عورت کو کہیں بھی مرد سے کمتر نہیں مانا۔ 'سیتا' ماتا جی کی روشن اور تابناک کردار سازی اس کا بین ثبوت ہے۔

اس حوالے سے واضح ہے کہ 'رامائن' نسلی امتیازات کی قدامت پرستانہ ذہنیت کو افضلیت نہیں دیتی بلکہ اس کے برعکس اس کے نزدیک صاحب فہم، باکردار اور پاکیزگی پسند طبقہ زیادہ اہم اور پسندیدہ ہے۔ 'رامائن' کے مطابق اعلیٰ یا ادنیٰ ذات کا تعین قبل از ولادت سے نہیں کیا جاسکتا۔ ہر ذی روح کو معیار زندگی بہتر اور ایک مکمل انسان بننے کا تہذیبی، سماجی اور معاشی موقع ضرور ملنا چاہیے۔ اگر چہ اس طرح کا کوئی پیغام 'رامائن' میں واضح لفظوں میں نہیں دیا گیا ہے۔ لیکن یہ مفہوم اس کے بین السطور میں مضمر ضرور ہے، اسی لیے 'رامائن' کو سرسری نظر سے پڑھ لینا کافی نہیں ہے، اس کا مطالعہ بڑی باریک بینی اور غور وفکر کا تقاضا کرتا ہے۔ ایک صاحب فہم عقل پر 'رامائن' کو ہر بار کے مطالعہ سے کچھ نئی صداقتیں عیاں ہوتی ہیں۔

'رامائن' کا بنیادی سبق ہے 'خاندان کا وقار' خاندان سماج کا ایک چھوٹا روپ ہے۔ سماج کی طرح ایک خاندان کے بھی روز مرہ کے کچھ ضابطے ہوتے ہیں۔ خاندان کی یکجہتی کے لیے ایک دوسرے کے تئیں اعتماد اور اخلاص بہت ضروری ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا بڑی ذمے داری ہے۔ ہندوستان میں خاندان کی جتنی اہمیت ہے اتنی دنیا میں کہیں اور نہیں ہے۔ ہندستانی سیاق میں خاندان کی اجتماعیت نے ہمیں نسلی تفاوت، غریبی، غیر ملک کے حملے اور نا قابل قبول تہذیبی خرابیوں کے سامنے سپر ڈالنے نہیں دی ہے۔ یہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ اب ہمارے سماج میں خاندانی اجتماعیت کی اہمیت گھٹ رہی ہے اور اس کی جگہ ذاتی غرض کو ترجیح دی جانے لگی ہے۔ جدت کے نام پر بڑوں کا ادب، اخلاقی اقدار کا وقار اور اپنی تہذیب کی عزت مفقود ہوتی جارہی ہے۔ باپ، بھائی، پڑوسی، شہری، یہاں تک کہ انسان کے افتخار کو گہن لگتا جارہا ہے۔ عصر حاضر میں سماج جن مسائل سے دوچار ہے، نامانوس، غیر محفوظ اور مختلف غیر ملکی تہذیبی پس منظر میں خاندان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اہل برطانیہ نہ صرف ہم ہندستانیوں کی تندہی اور کاروباری وتعلیمی لیاقت کے سبب ہمیں عزت دیتے ہیں بلکہ ہماری خاندانی ہم آہنگی بھی ہمیں ان کی نظروں میں مستحسن بناتی ہے۔ خاندانی ہم آہنگی کا یہی جذبہ ہمیں وہ تحفظ، خلوص، سکون اور باقاعدگی عطا کرتا ہے جس سے خاندان کے ہر فرد میں خود اعتمادی اور رجائیت پیدا ہوتی ہے۔

'رامائن' نے بڑی مہارت سے ہمیں خاندان اور سماج کے قوانین سے متعارف کرایا ہے۔ بھگوان رام جی پر جب مصیبت آئی، تب انھوں نے اپنے معاشرے کے تعاون سے ہی راون جیسے مخالف طاقتور دشمن پر فتح پائی۔ 'رامائن' ہماری زندگی کا جزو ہے، جس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ اس کے صفحات ہم جب چاہیں اور جہاں سے چاہیں پلٹ کر روحانی آنند اور اخلاقی سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

بھگوان رام چندر جی کے ظہور سے قبل بھارت ورش مختلف ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ یہاں کے کھشتری راجے مہاراجے آپسی جنگ و جدل میں مشغول رہتے تھے، ملکی نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ بھگوان پرشورام نے کئی بار ان کا خاتمہ کر کے نظم ونسق کو درست کیا، لیکن بھگوان رام چندر جی نے اپنی زندگی میں پورے بھارت ورش کو ایک سوتر میں باندھ دیا اور وہ مثالی نظام پیش کیا، جسے آج تک ''رام راج'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

بھگوان رام چندر جی تریتا یگ کے نصف میں پیدا ہوئے۔ اس یگ کی عمر ہے 129600 برس، اس کا آدھا ہوا 64800 برس۔ اس کے بعد دواپر یگ آتا ہے۔ اس کی کل عمر ہے 86400 برس۔ بھگوان شری کرشن جی مہاراج اسی یگ میں پیدا ہوئے۔ بھگوان شری کرشن کو شریر تیاگے ہوئے اب تک 7550 برس ہو چکے ہیں۔ تب سے کل یگ کی شروعات ہوئی ہے۔ اگر ان برسوں کو جوڑ دیا جائے تو کل میزان 1519550 برس ہوتے ہیں۔ تو شاستروں کے حساب سے رام جی اتنے برس قبل پیدا ہوئے تھے اور 'رامائن' جو رشی والمیکی نے لکھی ہے وہ اتنی پرانی ہے اور ہمارے آریاورت کی تہذیب (سنسکرت) بھی اتنی ہی قدیم ہے۔ دنیا میں اس طرح کی تہذیب اور کوئی نظر نہیں آتی۔

مہارشی والمیکی نے 'رامائن' سنسکرت زبان میں لکھی، کیونکہ اس وقت یہی ملکی زبان تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ بھارت ورش میں سنسکرت سے کئی نئی زبانیں نکلیں، تو رامائن ان میں منتقل ہونا شروع ہوئی۔ بھارت ورش کا یہ زمانہ سخت گیر تھا، غیر ملکی طاقتیں بے رحمانہ انھیں کچل رہی تھیں۔ اسی دور میں سورداس، تلسی داس، گرونانک، نندداس، ملک محمد جائسی، رحیم، رس خان، کیشو داس اور کبیر داس جیسے سنت سامنے آئے۔ خاص طور پر اس پسپائی کے باجود تلسی داس اور کبیر داس نے ہندو فلسفہ کو بام عروج تک پہنچایا۔ انھوں نے اپنے بانی کے ذریعے 'رامائن' کی تعلیمات کو عوام تک پہنچایا ہی نہیں بلکہ 'رام نام' سمرن عوام کو سکھایا۔

'رام چرت مانس' کی تخلیق کے بعد تلسی داس کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ سنت کوی نابھا داس نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'بھکت مالا' میں تحریر کیا ہے:

''کل یگ میں عوام کو نجات دلانے کے لیے والمیکی نے تلسی کی شکل میں جنم لیا۔ 'تریتا' یگ میں والمیکی نے رامائن لکھی۔ اس مقدس گرنتھ کا ایک لفظ بھی برہمن ہتیا (قتل) کے دوش سے نجات دلا سکتا ہے۔ اب عقیدت مندوں کے لیے تلسی داس نے ایشور کے فضل کو از سر نو پیش کیا ہے۔ اپنے برت کے مطابق وہ شری رام بھکتی میں دن رات انہی کا نام جپتے رہتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے زندگی اور موت کے سمندر کو پار کرنے کے لیے یہ کشتی بنائی ہے جس سے اس کل یگ کے تمام مصائب زدہ ذی روحوں کی مکتی ممکن ہے۔''[3]

'رامائن' پر مبنی ایک ٹی وی سیریل بھی ٹیلی کاسٹ کیا گیا۔ پوری ایک دہائی تک اس سیریل نے ہندوستان اور غیر ممالک میں بسے ہندوستانیوں کو مسحور رکھا۔ اسی وجہ سے اس مہان پیشکش کے پروڈیوسر ڈائرکٹر رامانند ساگر کا موازنہ والمیکی اور تلسی داس تک سے کیا گیا۔ آج بھی جب دوردرشن پر یہ سیریل ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے لوگ اپنے کام کاج بند کر کے اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

شری ویاس جی نے ایک اور سمت قابل تعریف پیش رفت کی ہے۔ غیر ممالک میں آباد ہندستانیوں کی ایک پوری نسل، جو اب تک 'رامائن' کے فلسفیانہ پہلو اور اس کی مسحور کن موسیقی سے محروم تھی، انھیں شری ویاس جی نے موسیقی سے مرصع 'رام' کتھا سے متعارف کرایا۔ انہی کی ترغیب سے متعدد گایکوں اور موسیقی کاروں نے رام کتھا کا امرت باہر بسے ہوئے لاکھوں ہندستانیوں تک پہنچایا۔ جس کے لیے وہ ہمیشہ شری ویاس جی کے احسان مند رہیں گے۔ غیر ممالک میں شری مراری باپو، شری رومیش اوجھا جیسے عالم حضرات کے کامیاب پروگراموں کے پیچھے بھی شری ویاس کی انتھک کوششیں شامل رہیں۔ شری للن پرشاد ویاس کا قول ہے:

''آج جب پرانا نظام تباہ ہو رہا ہے اور مغربی دنیا کسی نئے نظام کا تصور بھی نہیں کر پا رہی ہے۔ ایسے میں جب اس چوطرفہ پھیلی ہوئی بیماری کی تشخیص میں دنیا خود کو قاصر پا رہی ہے تب ہمیں 'رامائن' کا خیال آتا ہے۔ وہی 'رامائن' جس میں حکمران خود روحانی اقدار سے محکوم ہوتا ہے۔ 'رام چرت مانس' میں بھگوان اپنی رعایا سے کہتے ہیں:

''نہیں انیتی نہیں کچھو پر بھوتائی سن ہوں کر ہو جو تم میں سہائی جو انیتی کچھو بھاشہو بھائی، تو موہی برجہو و بھئے بسرائی۔''[4]

ہم ایک بار پھر انسانی بھلائی کے سرچشمے بھگوان شری رام کی تعلیمات کی طرف لوٹتے ہیں جن پر ایک رام بھکت شری للن پرساد ویاس نے روشنی ڈالی ہے۔

کبھی کبھی مظالم کی تکلیف اتنی بڑھ جاتی ہے کہ انسان خود اپنی موت کی خواہش کرنے لگتا ہے۔ لیکن 'رامائن' اس طرح کی شدید یاسیت سے ابھرنے کی ترغیب دیتی ہے۔

کوئی بھی تخلیق، ابتدا میں کتنی ہی عظیم اور اہم کیوں نہ ہو، وقت گزرنے کے ساتھ اتنی قابل احترام نہیں رہ جاتی، عظیم تخلیق وہی ہوتی ہے جس پر وقت کا اثر نہ پڑے۔ 'رامائن' کا لاثانی وقار، شعری حسن اور انسان نوازی اسے ایسی عظیم تخلیق بناتے ہیں جو ہزاروں برس پہلے لکھے جانے کے باوجود موجودہ صدی کے بے چینی بھرے اور گمراہ کن حالات میں، بلکہ آنے والی صدیوں میں بھی اپنی اہمیت قائم رکھے گی۔

ہم انسان کی ترقی میں ایک اعلیٰ سطحی صورت حال کا تذکرہ اکثر کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک دوسری صورت حال ہے، جو انسان کے لیے چاہے اذیت ناک ہو، لیکن ناممکن نہیں ہے، وہ صورت ہے، انسانی ترقی کا عروج، اس کی اعلیٰ ترین حیثیت۔ دور سے دیکھنے پر وہ ایورسٹ کی چوٹی کی طرح عظیم الشان، ناقابل تسخیر ضرور لگتی ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کوشش کرنے سے ہی ایورسٹ کو فتح کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات ذہن نشین رکھتے ہوئے کہ انسان اپنی سرشت سے گناہ گار نہیں ہوتا، 'رامائن' کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ہم اگر متواتر کوشش کریں تو ہم انسانی ترقی کی ایورسٹ چوٹی تک چاہے نہ پہنچ سکیں لیکن اس دنیا کو یقیناً ایک قابل رشک مقام بنا سکتے ہیں۔ جہاں انصاف، رحم اور پیار کا سامراج ہوگا اور انسان دیوتاؤں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلے گا۔

مآخذ ومصادر

1 مہاراجہ رام چندر جی کا کردار: ایک سرسری جائزہ، عالمی اردو ادب (دھارمک نمبر) 2012 ص 203
2 ایضاً، ص 203
3 رام کی معنویت، ڈاکٹر وید یاساگر آنند (مرحوم) موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی 2015 ص 59
4 ایضاً، ص 62

Dr Balvinder Singh
Assistant Professor(Contructual)
Department of Urdu
University of Ladakh (UOL)
Kargil Campus-194103
Cell No-6006038989
E-mail-balvindersingh@bhu.ac.in

حنیف کیفی

اردو آزاد نظم کا پس منظر

جس عبوری دور میں اردو نظم معرا لنگڑا لنگڑا کر چلتے ہوئے اپنے قدم جمانے کی جدوجہد کر رہی تھی اسی زمانے میں اردو میں آزاد نظم کا وجود ہوا۔ تقریباً تمام جدید شعری تجربوں کی طرح اردو کی آزاد نظم کا وجود بھی انگریزی شعر و ادب کے اثرات کا رہین منت ہے۔ غیر مساوی مصرعوں پر مشتمل شعری ہیئتوں کا وجود عربی اور فارسی شاعری میں بھی پایا جاتا ہے۔ فارسی اور اس کے اثر سے اردو میں مستزاد ایک ایسی ہی ہیئت کی مثال پیش کرتا ہے۔ عربی شاعری میں یک رکنی اشعار اور موشحات میں غیر مساوی مصرعوں کی نشان دہی کی گئی ہے لیکن ان شعری ہیئتوں کی روایت نے نہ تو اردو کی آزاد نظم کے وجود کے لیے کسی محرک کا کام کیا اور نہ اس کی ترویج میں اس روایت کو تائید کے طور پر پیش کیا گیا۔ عربی شاعری تک تو اردو آزاد نظم کے علم برداروں کی رسائی ہی نہ تھی اور اگر ہوتی بھی تو محولہ ہیئتیں آزاد نظم کی صورت گری میں معاون نہ ہوتیں، کیونکہ ان کی ہیئت اور تکنیک آزاد نظم کی ہیئت اور تکنیک سے قطعی مختلف ہے۔ مولوی عبدالرحمٰن نے 'مراۃ الشعر' میں موشح اور یک رکنی شعر کا جو تعارف پیش کیا ہے اس سے یہ فرق واضح ہے۔ شعر میں 'وزن حقیقی و غیر حقیقی کی بحث' کے تحت مولانا رقم طراز ہیں:

''وزن حقیقی یہ ہے کہ شعر یا کسی نظم کا مصرعہ مصرعہ اپنے حروف ملفوظہ اور ان کی حرکات و سکنات کے اعتبار سے عروضی افاعیل و تفاعیل یا مذاق صحیح کی میزان میں برابر ہو جیسے عربی، فارسی، اردو کے عام اشعار ہوتے ہیں۔ اگرچہ بعض بحور میں زحافات نقص و زیادت سے مصرعوں میں خفیف سی کمی بیشی ہو جاتی ہے لیکن نہ بہت زیادہ۔ برخلاف اس کے وزن غیر حقیقی میں شعر کے مصرعے مساوی نہیں ہوتے۔ کوئی چھوٹا ہوتا ہے، کوئی بڑھ جاتا ہے۔ مثلاً ایک مصرع میں چار رکن آئے۔ دوسرے میں تین رہ گئے یا پانچ ہوگئے۔ ایک مصرعہ سیر بھر کا رہا اور دوسرا سواسیر کا ہوگیا یا تین پاؤ کا رہ گیا۔ تاہم وزن میں ان کے باہم کوئی ایسی مناسبت ضرور ہوتی ہے کہ شعر ناموزوں نہیں ہوتا۔''

(مولوی عبدالرحمٰن: مراۃ الشعر، ص 35)

'وزن حقیقی و غیر حقیقی' کی اس تعریف کے بعد لکھتے ہیں:

''بہت سی زبانوں کی شاعری میں وزن کی یہ صورت اب بھی موجود ہے۔ مصرعے باہم مساوی نہیں بلکہ چھوٹے بڑے ہوتے ہیں لیکن کچھ ایسی ترتیب و نظام پر کہ ذوق کو بھلے (بھلے) معلوم ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات مساوی الوزن مصرعوں سے زیادہ لطف دے جاتے ہیں۔ جاہلیت کا تمام دیوان اس قسم کے اشعار سے خالی ہے، کہتے ہیں کہ اول اول اندلس میں اس قسم کے شعر کا موشحات سے آغاز ہوا اور پھر وہاں سے ممالک شرقیہ تک پہنچا۔'' (ایضاً، ص 36)

موشح کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''موشحہ ماخوذ ہے وشاح سے جس کے معنی ہیں گنگا جمنی ہار، پس موشحہ وہ عروس سخن ہے جو لآلی و جواہرات رنگا رنگ کا ہار پہنے ہو۔ اسی لیے آپ موشحات کے وزن و قوافی میں رنگا رنگی پائیں گے۔'' (ایضاً، ص 36)

اس تعارف کے بعد موشحات کے آغاز اور رواج کے بارے میں مولوی عبدالرحمٰن، ابن خلدون کے حوالے سے، یہ آگاہی بہم پہنچاتے ہیں:

''ابن خلدون نے لکھا ہے کہ اندلس میں جب عربی شاعری کمال کو پہنچ گئی اور تحسین و تزئین حد کو تو شعرائے اندلس نے نئے نئے انداز سخن سنجی پیدا کئے۔ انھیں میں سے ایک کا نام موشح ہے۔ جس میں شاعر مختلف الآخر اجزائے شعر بہم پہنچاتا اور سلسلہ وار پروتا چلا جاتا ہے اور کئی کئی کے مجموعہ کو بیت قرار دیتا ہے، اور ایک ایک بیت میں کئی کئی قوافی کا التزام کرتا ہے اور اجزائے شعر کے اوزان میں بھی کہ ہم وزن اجزا ایک خاص ترتیب سے جو ابتدا میں برتی ہے تا بہ آخر پے در پے آتے چلے جاتے ہیں چونکہ یہ انداز لوگوں کو حسن ترتیب اور سہولت کی وجہ سے بہت پسند آیا، پھیلتا اور بڑھتا چلا گیا۔ اس فن کا موجد ابن معانی القبری ہے اسی سے ابن عبدربہ نے لیا اور پھر عام ہوگیا۔'' (مراۃ الشعر، ص 36)

موشح کی مثال کے طور پر مولوی عبدالرحمٰن عبادۃ القزاز کا یہ 'قول' پیش کرتے ہیں:

''بدرتم + شمس ضحیٰ + غصن نقا + مسک شم
ماأتم + ما اوضحا + ما اورقا + ما انم
لاجرم + من لمحا + قد عشقا + قد حرم''

(مصرع مصرع میں چار چار مساوی جز ہیں اور پھر چاروں باہم ہم وزن و ہم قافیہ ہیں)

''بدر کامل۔ خورشید خاور۔ سرو باغ۔ مشک بویا۔ کیسا بھرپور۔ کیسا روشن۔

کیا ہرا بھرا۔ کیسا خود نما ہے۔ اسی لیے جس نے دیکھا عشق ہو گیا مگر رہا حرماں نصیب۔'' (ایضاً، ص37)

موشح کے تعارف کے بعد اس سلسلے میں، مولوی عبدالرحمٰن اپنی اس رائے کا اظہار کرتے ہیں:

''میں کہتا ہوں کہ یہ انداز خود یک رکنی شعر سے نکلا ہے جو اس سے پہلے مشرق میں پیدا ہو چکا تھا۔''

(ایضاً، ص37)

اور اس یک رکنی شعر کی مثال وہ ان اشعار کے ذریعے پیش کرتے ہیں جو ''الھادی کی مدح میں سلم الخاسر'' نے کہے تھے۔

"موسی المطر [1] اغیث بکر ثم انھمر [2] الولمرد

کم اعتسر [3] و کم قدر، ثم غفر [4] عدل الیسر"

''موسیٰ مینہ ہے۔ وہ مینہ جو صبح کو آیا اور پھر ٹوٹ کر برسا۔ بڑا زور آور۔ ہٹ والا ہے۔ اکثر دشواریوں میں پھنسا اور غالب آیا مگر اس انصاف سیرت نے معاف کر دیا۔'' (ایضاً، ص37)

اور پھر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

''یک رکنی شعر کے بعد اقصر الشعر کہنا چاہیے، شعر طویل کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں رہتی کہ کئی کئی مصرعے کا اطلاق کر لیا جائے۔ اسی لیے یک رکنی شعر سے شعر طویل پیدا ہوا اور وہی موشحات کے تنوع کا باعث بنا... اس اختراع کا یہ نتیجہ ہوا کہ عربی شعر قصیدہ وارجوزہ کے ہم رنگ قوافی کی قید سے چھوٹ گیا کیونکہ اس طرز جدید میں قوافی کا التزام اس قسم کے شرائط اپنے ساتھ لایا تھا کہ طویل نظموں میں اس کا نباہ مشکل تھا ناچار شعرا نے چند چند ابیات تک ایک ایک قافیہ کا التزام رکھ کر اس کو بدلنا شروع کیا جس سے ایک طرف قصیدہ اور ارجوزہ کے قوافی کی یک رنگی رنگا رنگی سے بدل گئی اور مسمط بانواعہ پیدا ہو گیا اور دوسری طرف شاعر نے دیکھا کہ اس کے ایک مصرعے میں تین یا چار مساوی اجزا آئے۔ دوسرے مصرعے میں تیسرے اور چوتھے جز کی نوبت نہ آئی تھی کہ بات پوری ہو گئی۔ مصرعے غیر مساوی ہیں۔ مگر موزوں جس لفظ تک پہنچا تھا اسی کو دوسرا قافیہ بنا لیا اور لگا اسی اسلوب پر شعر کہنے۔ یوں وہ شعر پیدا ہو گیا جس کے مصرعے باہم برابر نہ تھے۔'' (ایضاً، ص37-38)

موشح اور یک رکنی شعر سے متعلق ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غیر مساوی مصرعوں کے ہوتے ہوئے بھی ان مصرعوں کی مخصوص ترتیب و تنظیم نیز وزن و قافیہ کے خاص التزام کے باعث ان ہیئتوں کی تکنیک آزاد نظم کی تکنیک سے قطعاً مختلف ہے۔ اب رہا مستزاد جسے مولوی عبدالرحمٰن کے نزدیک ''عربی موشح کی ایک قسم کا چربا کہنا چاہیے'' (ایضاً، ص46)

> **مغربی ادبیات میں تو آزاد نظم کی روایت بڑی پرانی ہے۔ ڈاکٹر جانسن جیسے اصول پرست نقادوں کی مخالفت کے باوجود آزاد نظم انگریزی شاعری ہی میں نہیں یورپ کی شاعری میں ایک بلند مرتبہ حاصل کر چکی ہے۔**

تو اس سے متعلق آزاد نظم کی تکنیک کے ضمن میں تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے اور یہاں اس کے اعادے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ آزاد نظم میں ارکان کی تخفیف کے سلسلے میں عموماً مستزاد کے اصول کو شعوری یا غیر شعوری طور پر بروے کار لایا جاتا ہے مستزاد کی ہیئت اور تکنیک کو آزاد نظم سے مماثل قرار دینا اور دور از کار بات ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ آزاد نظم کے محرکات وعوامل بھی کلیتاً وہ نہیں تھے جو موشح یا مستزاد کی اختراع کا باعث بنے۔ وزن و قافیہ کی سخت قیود سے آزادی حاصل کرنے کی خواہش کے ساتھ ساتھ آزاد نظم کی ایجاد میں کچھ ایسے عصری تقاضوں کی بھی کارفرمائی شامل تھی جو اسی زمانے سے مخصوص تھے۔ ان مخصوص عصری تقاضوں کے پس منظر میں انگریزی آزاد نظم کی ترویج نے اردو آزاد نظم کے لیے اہم محرک اور قابل تقلید نمونے کا کام دیا۔ لہٰذا اس بات میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ اردو میں آزاد نظم کا وجود براہ راست انگریزی شعر و ادب کے تیزی سے بڑھتے ہوئے اثرات کا نتیجہ ہے اور اس کی پیش قدمی بنیادی طور پر انگریزی فری ورس کی پیروی کی مرہون منت ہے۔

جس وقت اردو آزاد نظم کا وجود ہوا خود انگریزی شاعری میں فری ورس کی حیثیت نووارد کی تھی۔ پروفیسر محمد حسن کا یہ بیان حقیقت پر مبنی نہیں کہ:

''مغربی ادبیات میں تو آزاد نظم کی روایت بڑی پرانی ہے۔ ڈاکٹر جانسن جیسے اصول پرست نقادوں کی مخالفت کے باوجود آزاد نظم انگریزی شاعری ہی میں نہیں یورپ کی شاعری میں ایک بلند مرتبہ حاصل کر چکی ہے۔'' (پروفیسر محمد حسن: نظم جدید کا معنوی ارتقا، ص90)

نہ تو مغربی ادبیات میں آزاد نظم کی روایت پرانی ہے اور نہ ڈاکٹر جانسن کے زمانے یعنی اٹھارھویں صدی میں اس کا رواج تھا۔ رواج و روایت تو درکنار اس زمانے میں کسی نے اس کا نام تک نہ لیا تھا۔ ڈاکٹر جانسن کے انتقال 1784 سے پوری ایک صدی گزر جانے کے بعد فرانس میں پہلی مرتبہ مروجہ عروضی اصولوں سے منحرف غیر مساوی مصرعوں پر مشتمل نظموں کو Verse Libre کا نام دیا گیا اور انگریزی میں اسی کا ترجمہ Free Verse کیا گیا جو اردو میں 'آزاد نظم' کے نام سے معروف ہے۔

نظم کی وہ مخصوص قسم جو آج آزاد نظم کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے، فرانس میں انیسویں صدی کے اواخر میں اور انگریزی شاعری میں بیسویں صدی کے اوائل میں منظر عام پر آئی۔ البتہ بے ضابطہ اور منتشر طور پر اس کے ابتدائی نقوش مختلف الوزن غیر مقفیٰ مصرعوں کی شکل میں ملٹن کی 'Lycidas' Samson Agonistes ورڈزورتھ کی Old on Intimations Immortality اور شیلی کی Queen Mab میں نظر آتے ہیں لیکن خیال رہے کہ ان نقوش کی نشان دہی بھی جدید عہد کے ناقدین نے کی ہے۔ خود اس زمانے میں نہ تو شاعر کے ذہن ہی میں آزاد نظم کا کوئی تصور تھا اور نہ کسی ناقد نے اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ مزید برآں ملٹن وغیرہ کی نظموں میں غیر مساوی مصرعے آزاد نظم کی تکنیک کے برعکس باضابطہ اوزان میں تھے۔ اسی انداز کی نظم کے کچھ تجربے میتھیو آرنلڈ (Matthew

(Arnold)، پیٹمور (Patmore) اور ہینلی (Henley) نے بھی انیسویں صدی کے نصف آخر میں کیے۔ اسی زمانے میں امریکہ میں والٹ وٹمین (Walt Whitman) نے Leaves of Grass میں آزاد نظم کا تجربہ کیا۔ یہ تجربے آزاد نظم کے پیش رو کہے جاسکتے ہیں، لیکن اصل آزاد نظم کا تعلق ان شعرا سے ہے جنھوں نے باضابطہ طور پر Verse Libre یا Free Verse کے نام سے نظمیں لکھنے کا آغاز کیا۔

یہ آزاد نظم انگریزی شاعری کو فرانسیسی شاعری کی دین ہے جہاں انیسویں صدی کے خمس آخر میں اس کا خاصا رواج ہو چکا تھا۔ یوں تو وکٹر ہیوگو (Victor Hugo) نے مروجہ عروضی اصولوں سے بتدریج انحراف وانقطاع کے ذریعے فرانسیسی آزاد نظم کا سنگ بنیاد رکھ دیا تھا لیکن اس کی ترویج سمبالزم (Symbolism) کی تحریک کے تحت انیسویں صدی کے آخری دو دہائیوں کے دوران ہوئی۔ ایک تحریک یا اسکول کی حیثیت سے سمبالزم کا نام 1886 میں منظر عام پر آیا جب کہ Figaro میں اس کا اعلان نامہ شائع ہوا، لیکن ایک رویے یا رجحان کی حیثیت سے اس کا آغاز بادلیر (Baudelaire) کی شاعری سے ہو چکا تھا۔ بادلیر کے مقلدین رمبو (Rimbaud)، میلارمے (Mallarme) اور ورلین (Verlaine) نے اس رجحان کو فروغ دیا۔ 1886 کے قریب فرانس کے نوجوان جدت پسند شعرا جنھیں اپنی رہنمائی کے لیے کسی مناسب شخصیت کی تلاش تھی، میلارمے اور ورلین کی قیادت میں دو الگ الگ جماعتوں میں تقسیم ہوگئے۔ میلارمے کی پیروؤں 'ہارمنسٹ' (Harmonistes) یا 'ویرلیبرسٹ' (Vers-libristes) کہلائے۔ ان شعرا نے سمبالزم کے فروغ کے ساتھ ہی ساتھ پیرایۂ اظہار کی حیثیت سے 'ویرلیبر' یا آزاد نظم کی ترویج وتبلیغ کی۔ آزاد نظم کے مبلغ کی حیثیت سے گستاو کان (Gustave Kahn) کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ جول لیفارج (Jules Laforgue)، ویلیگریفیں (Viele-Griffin)، فرانسس جیمس (Francis Jammes)، آندرے اسپائر (Andre Spire) وغیرہ 'ویرلیبر' کے اولین علم برداروں میں سے ہیں۔

فرانس کے ان جدت پسند شعرا نے نثر ونظم کے باہمی امتیازات کو رد کر کے دونوں کے امتزاج سے ایک نئی ہیئت کی تشکیل کی جس کی بنیاد عروضی اوزان کی

انگریزی شاعری میں آزاد نظم کا ورود فرانس کی اسی آزاد شاعری کے زیر اثر ہوا جو انیسویں صدی کے اواخر میں فروغ پا رہی تھی۔ اس بنیادی محرک کے ساتھ ہی ساتھ کچھ اور بھی محرکات وموثرات تھے جو انگریزی آزاد نظم کی تشکیل وترویج میں معاون رہے ہیں۔

پابندی یا صوتی اجزا کے شمار کے بجائے آہنگ وایقاع کے اصول پر تھی۔ اس اصول کے تحت جذبات کے اتار چڑھاؤ اور الفاظ کے بہاؤ کے ساتھ کلام میں خود بخود روانی اور زیر وبم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ نیا پیرایۂ اظہار اپنے اس قانون ایقاع (Law of Cadence) کی حدود میں کسی بھی مطلق قسم کے اصولوں کا پابند نہیں تھا ورنہ پھر آزاد نظم آزاد نہ ہوتی۔ ان نظریات وخیالات میں نئے شعرا کے لیے کشش کا خاصا سامان تھا۔ قدیم اصولوں کی سخت گیری سے بیزاری اور نئے زمانے کی تیز رفتاری کا ساتھ دینے کے لیے بے روک ٹوک اظہار خیال کے وسیلوں کی ضرورت کے احساس نے ان شعرا کو آزاد نظم کو اپنانے اور رائج کرنے پر آمادہ کیا اور انیسویں صدی کے اختتام سے پہلے ہی فرانس میں اس کا رواج خاصا زور پکڑ چکا تھا۔

انگریزی شاعری میں آزاد نظم کا ورود فرانس کی اسی آزاد شاعری کے زیر اثر ہوا جو انیسویں صدی کے اواخر میں فروغ پا رہی تھی۔ اس بنیادی محرک کے ساتھ ہی ساتھ کچھ اور بھی محرکات وموثرات تھے جو انگریزی آزاد نظم کی تشکیل وترویج میں معاون رہے ہیں۔ ان کی طرف جان لوئکسٹن لویز نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

"it is sufficient to say that the present impulse (of writing free verse) comes primarily from France; that it found when it came, the ground prepared for it in differing ways by Arnold, and Whitman, and Henley, and others; and that it has since passed, or is passing, both directly and at second-hand, under the influence of Greek, Chinese and Japanese, and even Hebrew poetry.

(John Livingston Lowes: Convention and Reevolt in Poetry, p 167-68)

انگریزی میں آزاد نظم کا وجود ان چند شعرا کی مساعی کا نتیجہ ہے جنھوں نے فرانسیسی شعر وادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس کی ابتدائی نشو ونما امیجزم (Imagism) کی تحریک کے زیر سایہ ہوئی۔ اس تحریک کے بنیادی نقوش کی نشان دہی جی۔ ایس۔ فریزر نے اس طرح کی ہے:

"This (the Imagist movement) had its roots in a group of obscure but interesting poets, some- Tancred, Campbell, Stoner-now completely forgotten; two others, T.E. Hulme and F.S. Flint, remembered more as theorists and innovators than as poets in their own right, who used to meet at an institution called the Poets Club around 1907 and 1908.

(G.S Fraser: Metre, Rhyme and Free Verse, P 72)

'پوئیٹس کلب' میں جمع ہونے والے شعرا اواخر عہد وکٹوریہ کی شاعری سے اکتا چکے تھے جس میں ایک مخصوص وزن آیمبک (Iambic) بحر سے وابستگی اور باضابطہ ترتیب قوافی کی پابندی نے ایک میکانکی انداز پیدا کر دیا تھا۔ اس میکانکی شاعری سے ان شعرا کی بیزاری نے انھیں کلاسیکی یونانی شاعری، بائبل کی شاعری کی متوازیت، چینی اور جاپانی اصناف نظم بالخصوص ہائیکو (Haiku) اور فرانسیسی 'ویرلیبر' کی طرف مائل کر دیا۔ ان شعرا کا امام ٹی۔ ای۔ ہیوم تھا جسے امیجزم کی تحریک کا بانی قرار دیا جاتا ہے حالانکہ 'امیجزم' کا نام ازرا پاؤنڈ (Ezra Pound) کا عطا کردہ ہے۔

ہیوم نے اپنی نثر ونظم کے ذریعے ایک طرف تو امیجزم کے نظریے کی تشکیل وترویج کی دوسری طرف انگریزی میں 'فری ورس' کی بنیاد رکھی۔ ''شاعری سے

متعلق ہیوم کے رجحانات ونظریات کا اظہار 1912 میں ایک لیکچر کے ذریعے ہوا۔ اس لیکچر کا مرکزی خیال یہ تھا کہ نظم کی ایک نئی ہیئت کی ایجاد ہی شاعری کو زندگی عطا کرتی ہے اور ہر عہد اپنے بدلے ہوئے میلانات کے اظہار کے لیے نظم کی ایک نئی ہیئت کا متقاضی ہوتا ہے۔ جب تک اس نئی ہیئت کی دریافت نہیں ہوتی، شاعری میں تدریجی زوال اور نقالی ہی ممکن ہے۔ انیسویں صدی کی نویں دہائی میں فرانس میں 'ویرلیبر' کی ایجاد کے ذریعے شاعری کو جو آزادی اور نئی زندگی نصیب ہوئی تھی اس سے ہیوم متاثر ہوا تھا اور اس نے محسوس کیا کہ یہ نئے عہد سے ہم آہنگ ہے جس کا فلسفہ یہ تھا کہ صداقت مطلق نہیں بلکہ اضافی ہے۔ شاعری کی صفت دروں بینی ہے اور اس کا کام شاعر کے ذہن کی مبہم اور لمحاتی کیفیات کی ترسیل ہے، نیز یہ کہ شاعری اب بالجہر نہیں بلکہ خاموشی سے پڑھنے کے لیے ہے۔ اس نئی فضا کے لیے 'ویرلیبر' موزوں تھی اور اس کا آہنگ اس سے مناسبت رکھتا تھا لیکن محض ایک نئے آہنگ کی موجودگی ہی کافی نہیں۔ اسے اپنے ساتھ مشابہتوں کے نئے انداز بھی لانا چاہیے۔ تازہ استعارہ قاری کو عادت کے خمار سے چونکا دے۔ ہیوم کا خیال تھا کہ پیکر (Images) واضح، مختصر اور معین ہونے چاہییں۔ انھیں ذہن کے سامنے ایک ایسی تصویر پیش کرنی چاہیے جو واضح نقوش کی حامل ہو۔''

(A.S. Collins: English Literature of the Twentieth Century, P 39-40)

ہیوم کے ان خیالات اور اس کی نظموں کے ذریعے ان کی عملی صورت گری نے امیجز کے نظریے کی تشکیل کی۔ 1909 میں ہیوم کے متبعین نے اپنی جماعت کو 'اسکول آف امیجز' (School of Images) کے نام سے پیش کیا۔ اس سے پہلے 1908 میں ازرا پاؤنڈ جب انگلستان آیا تھا تو ہیوم اور پوئیٹس کلب کے دوسرے شعرا سے مل چکا تھا۔ اس پر ہیوم کے نظریات و خیالات کا بہت اثر ہوا اور 1912 میں اس نے 'Ripostes' کے دیباچے میں ہیوم کی تحریک کے لیے Imagisme کی اصطلاح وضع کی اور اس سے وابستہ شعرا کو Imagestes کا نام دیا۔ پاؤنڈ نے اس تحریک کی نمائندگی کے لیے از سر نو کچھ نوجوان شعرا کی جماعت تیار کی جن میں ایف ایس فلنٹ (F.S.Flint) رچرڈ آلڈنگٹن (Richard Aldington) اور ہڈاڈولٹل (Hilda H.D Doolittle) اہم ہیں۔ فلنٹ نے Poetry بابت مارچ 1913 میں امیجزم پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس کے تین اصولوں کا ذکر کیا۔ موضوع کا راست بیان ایک بھی غیر ضروری لفظ کے استعمال سے گریز اور، آہنگ کے اعتبار سے باقاعدہ موسیقی کی ترتیب کے بجائے مترنم فقرے کی ترتیب میں نظم لکھنا:

"Direct treatment of the 'thing', whether subjective or objective; to use absolutely no word that does not contribute to the prisentation; as regarding rhythm : to compose in the sequence of the musical phrase, not in sequence of metronome."

(بحوالہ ڈکشنری ورلڈ لٹریری ٹرمز، ص 158)

امیجسٹ شعرا کی نظمیں ابتدا میں مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ 1914 ' میں 'Egoist کا اجرا عمل میں آیا جو ان شعرا کا مخصوص اور مستقل وسیلۂ اظہار بن گیا۔ 1914 میں پاؤنڈ نے گیارہ امیجسٹ شعرا کی نظموں کا انتخاب Des Imagistes کے نام سے شائع کیا۔ اس امیجسٹ تحریک کی قیادت ایمی لاویل (Amy Lowell) کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے 1915 سے 1917 تک امیجسٹ شعرا کی نظموں کے تین انتخابات Some Imagist Poets کے عنوان سے ترتیب دیے۔ اس سلسلے کی نظموں کا آخری انتخاب تحریک کے ختم ہونے کے ایک مدت کے بعد 1930 میں Imagist Anthology کے نام سے شائع ہوا۔

انگلستان میں امیجزم کی تحریک بہت کم مدت تک قائم رہ سکی۔ جنگ عظیم کے اختتام کے ساتھ ہی یہ تحریک بھی ختم ہوگئی۔ ازرا پاؤنڈ تو پہلے ہی اس تحریک سے علیحدگی اختیار کر کے ایک نئی تحریک وارٹیسزم (Vorticism) سے وابستہ ہو گیا تھا۔ دوسرے شعرا بھی بعد میں اپنی اپنی پسند کے مطابق کیوبزم (Cubism)، دادازم (Dadaism)، سرریلزم (Surrealism) وغیرہ تحریکات سے متعلق ہو گئے۔ آزادی کی جو لہر ان شعرا کے ذہنوں میں پیدا ہو چکی تھی اس نے انھیں کسی ایک طریق اظہار پر قانع نہ رہنے دیا۔ ایچ-وی-روتھ (H.V.Routh) نے ان شعرا کے ذہنی پس منظر پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

"All wanted release from the older forms of verse; none wanted a control not of their own choosing. So they tended to subdivide into sects- vorticism, cubism, dadoism, unanimism, fantasism, surrealism- seeking freedom and a following under the dignity of a lable.

(H.V. Routh: English Literature and Ideas in the Twentieth Century, 1964, P 113)

'امریکہ میں امیجزم' بالخصوص اس کے آزاد نظم کے عنصر نے ولیم کارلاس (William Carlos Williams) کی مختصر نظموں اور بعد ازاں بلیک ماؤنٹین اسکول (Black Mountain Scholl) کے شعرا، جیسے رابرٹ کریلی (Robert Creeley) کی نظموں کے ذریعے نسبتاً خاصی زیادہ طویل عمر پائی اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں وہ آج بھی پھل پھول رہا ہے۔''

(G.S Fraser: Metre, Rhyme and Free Verse, P.73)

ایک طرح سے دیکھا جائے تو امیجزم کی تحریک کو انگلستانی کی بہ نسبت امریکی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ زیادہ امریکی شعرا کی اس سے وابستگی نیز امریکی ادب میں اس کے زیادہ دیرپا ہونے کے علاوہ اس کے پرجوش قائد اور ذی صلاحیت و باعمل ناظم دو امریکی شعرا ازرا پاؤنڈ اور مس ایمی لاویل ہی تھے۔

باوجودیکہ انگلستان میں امیجزم کی تحریک زیادہ دنوں تک نہیں چل پائی اس نے شاعری میں ایجاز و اختصار کی خصوصیت اور قدیم اصناف سخن کو ترک کر کے فری ورس کی ترویج کی بدولت شعرائے مابعد پر خاصے گہرے اور دیرپا اثرات چھوڑے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد کے شعرا کی نسل کا قدیم اصناف نظم کو رد کر کے فری ورس کو اختیار کرنا ایک طرح سے امیجسٹ شعرا کے

ایک طرح سے دیکھا جائے تو امیجزم کی تحریک کو انگلستانی کی بہ نسبت امریکی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ زیادہ امریکی شعرا کی اس سے وابستگی نیز امریکی ادب میں اس کے زیادہ دیرپا ہونے کے علاوہ اس کے پرجوش قائد اور ذی صلاحیت و باعمل ناظم دو امریکی شعرا ازرا پاؤنڈ اور مس ایمی لاویل ہی تھے۔

جرأت مندانہ اقدامات سے متاثر ہونے ہی کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے جیسا کہ کینتھ ایلٹ (Kenneth Allott) کے ان الفاظ سے مترشح ہے:

"...the rejection of conventional verse forms by many poets in the twenties owed something, I think, to the Imagist repudiation of flabby writing by the Georgians."

(The Penguin Book of Contemporary Verse, edited by Kenneth Allott (1970, Introducing, P.20)

بیسوی صدی کی انگریزی شاعری کو امیجزم کی دین کی دو اہم جہات ہیں۔ اسلوب میں ارتکاز خیال اور ایجاز کلام پر زور اور ہیئت کے اعتبار سے آزاد نظم کا استعمال۔ آزاد نظم کے وہ شعرا جو اس تحریک سے متعلق نہیں تھے انھوں نے بھی اس کے اثر سے ارتکاز و ایجاز کی ان خصوصیات کو اپنایا اور پھر آزاد نظم کی ترویج کے ساتھ ہی ساتھ یہ خصوصیات بھی ایک مستقل رجحان اور غالب انداز کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ البتہ ڈی۔ ایچ۔ لارنس (D.H.Lawrence) جیسے کچھ شعرا نے اپنی آزاد نظم میں اس کے برعکس تکنیک اختیار کی جس کی وضاحت فریزر نے اس طرح کی ہے:

"But some free verse poets like D.H.Lawrence, used an opposite technique, based on the Bible and Whitman, of expansive repetition with variation, of rhetorical parallelism, rather than condensation."

(G.S.Fraser: Metre, Rhyme and Free Verse, PP.73-74.)

انگریزی آزاد نظم کی تکنیک کے سلسلے میں یہ بات خاصی اہم اور دلچسپ ہے کہ تقریباً ابتدا ہی سے اس کے شعرا دو الگ الگ جماعتوں میں منقسم نظر آتے ہیں۔ انسائکلو پیڈیا برٹینکا' میں ان کی نشاندہی اس طرح کی گئی ہے:

"...almost from the beginning the free verse movement split into two separate groups, a formal one led by Pound, and a popular and confused one led by Amy Lowell."

(Encyclopaedia Britannica 1968, Edition, Volum 9, P 854, Quarter IV)

ٹی ایس ایلیٹ کی ابتدائی آزاد نظمیں جن کی تخلیق کے وقت وہ امیجزم کی تحریک سے باخبر نہیں تھا، فرانسیسی شاعر جؤل لیفارج کی آزاد نظموں سے متاثر ہوکر لکھی گئی تھی۔ ان بالکل ابتدائی نظموں کے بعد کی نظموں پر سترھویں صدی کے انگریزی ڈرامے کی کافی آزاد اور لچک دار بلینک ورس اثر انداز رہی۔" لیکن 1920 کے قریب اس نے باضابطہ اوزان کی طرف رجوع کیا۔ بیسویں صدی کے وسط تک بیشتر نوجوان شعرا نے ایلیٹ کی روش کی پیروی کی حتیٰ کہ وزن کی پابندی کی طرف پاؤنڈ کا جھکاؤ بھی پہلے سے زیادہ ہوگیا، البتہ بعض نسبتاً سن رسیدہ شعرا خصوصاً کارل سینڈبرگ (Carl Sandburg)، ولیم کارلاس ولیمز (Villiam Carlos Williams)، میریم مور (Mariame Moore) اور والیس اسٹیونز (Wallace Stevens) متنوع قسم کی فری ورس تخلیق کرتے رہے۔ ولیمز اور مور کی نظم نگاری میں فرانسیسی شعرا کی آزاد نظم کی تکنیک سے بے حد مماثلت پائی جاتی ہے۔'' (ایضاً)

ٹی ایس ایلیٹ کی ابتدائی آزاد نظمیں جن کی تخلیق کے وقت وہ امیجزم کی تحریک سے باخبر نہیں تھا، فرانسیسی شاعر جؤل لیفارج کی آزاد نظموں سے متاثر ہوکر لکھی گئی تھی۔ ان بالکل ابتدائی نظموں کے بعد کی نظموں پر سترھویں صدی کے انگریزی ڈرامے کی کافی آزاد اور لچک دار بلینک ورس اثر انداز رہی۔

تمام ناقدین اس امر پر متفق ہیں کہ فری ورس کی ترویج کے دو بنیادی محرکات تھے۔ قدیم اصناف و اسالیب نظم سے بغاوت اور ایسے نئے وسائل اظہار کی جستجو جو بدلتے ہوئے تیز رفتار زمانے کا ساتھ دے سکیں۔ اسی لیے فری ورس کی تحریک کو روایت مخالف تحریک (Anti-traditional Movement) تصور کیا جاتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد کچھ برسوں تک اس کی موافقت اور مخالفت دونوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جہاں اس کے پرستار اس کی پرزور وکالت کرتے تھے، روایت پرستانہ ذہن رکھنے والے لوگ اسے نظم ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ چنانچہ 1922 میں شائع ہونے والی رابرٹ گریوز (Robert Graves) کی کتاب On English Poetry میں اس خیال سے اتفاق کیا گیا تھا کہ 'ویرلیبر' جیسی کوئی چیز ممکن ہی نہیں، کیونکہ:

"...if it was 'vers' it couldn't be truly 'libre and if it was truly 'libre' it couldn't possibly come under the category of vers."

(بحوالہ 'ٹوینٹیتھ سنچری لٹریچر، اے سی وارڈ، ص 92-191)

بہر حال مخالفتوں کے باوجود بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے ابتدائی چند برسوں ہی میں انگریزی شاعری میں فری ورس کے قدم جم چکے تھے اور ادبی فضا اس کی آوازوں سے گونجنے لگی تھی۔

(اردو آزاد نظم کے مغربی پس منظر کا یہ جائزہ جن کتابوں کی مدد سے ترتیب دیا گیا ہے ان کی نشاندہی اقتباسات کے حوالوں کی صورت میں کردی گئی ہے۔ مقتبس عبارتوں کے علاوہ دیگر معلومات بھی انھیں کتابوں کا حاصل مطالعہ ہیں جنھیں مرتب کرکے میں نے اپنی زبان میں پیش کردیا ہے۔)

یہ آوازیں سمندر پار کرکے ہندوستان بھی پہنچیں اور اردو کے وہ نوجوان شعرا جو اپنے یہاں کی شعری روایات سے غیر مطمئن اور ناآسودہ تھے اور جنھیں ''ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی'' کی جستجو تھی انھوں نے ان آوازوں پر لبیک کہا، اور بہت ہی تھوڑے عرصے کے بعد اردو دنیا آزاد نظم کے انقلابی تجربے سے آشنا ہوگئی۔ یہ تجربہ اپنی انقلابیت اور ہنگامہ خیزی کی وجہ سے تو اہم تھا ہی میری نظر میں اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اردو شاعری کا یہ پہلا تجربہ ہے جو ہم عصر مغربی ادب کے کسی تجربے کے زیر اثر وجود میں آیا اور آئندہ اس قسم کے تجربوں کے لیے راہیں کھول دیں ورنہ اس سے پہلے کے تجربوں تک تو اردو کی رسائی اس وقت ہوسکی تھی جب وہ اصل زبان میں فرسودہ و پامال اور بہت سی صورتوں میں مردہ ہوچکے تھے۔

■

ماخذ: اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک)۔
مصنف: حنیف کیفی، **چوتھی اشاعت**: 2021، **ناشر**: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مظفر حسین غزالی

اردو ادب اطفال پر دیگر زبانوں کے اثرات

بچوں کا ادب ہر زبان کی تہذیبی و اخلاقی شناخت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کسی بھی معاشرے میں بچوں کے لیے تخلیق کیا جانے والا ادب دراصل اس معاشرے کے فکری رجحانات، تہذیبی اقدار اور تعلیمی ترجیحات کی عکاسی کرتا ہے۔ اردو میں بچوں کے ادب کی روایت انیسویں صدی کے اواخر میں ابھری اور رفتہ رفتہ ایک مضبوط اور باقاعدہ صنف کے طور پر سامنے آئی۔ اس مضمون میں اردو اور دیگر زبانوں میں بچوں کے ادب کا تقابلی مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ مختلف زبانوں کے ادب میں بچوں کی ذہنی تربیت، اخلاقی اقدار، تخیل اور سماجی شعور کو کس طرح پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ واضح کرنا ہے کہ اردو میں بچوں کا ادب ایک طرف عالمی ادبی روایات سے متاثر ہے تو دوسری طرف اپنی مقامی تہذیبی خصوصیات کے باعث منفرد حیثیت بھی رکھتا ہے۔

ادبِ اطفال ہر زبان میں آنے والی نسلوں کی فکری تشکیل کا ایک اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ ادب محض تفریح کا سامان نہیں بلکہ تعلیم، تربیت اور کردار سازی کا ایک موثر وسیلہ بھی ہے۔ بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہانیاں، نظمیں، نظمیہ ڈرامے، تمثیلی حکایات اور معلوماتی مضامین تخلیق کیے جاتے ہیں تاکہ بچے نہ صرف لطف اندوز ہوں بلکہ ان کی شخصیت کی مثبت تشکیل بھی ہو۔ اردو میں بچوں کے ادب کی بنیاد انیسویں صدی میں اس وقت پڑی جب مولوی اسماعیل میرٹھی، ڈپٹی نذیر احمد، افسر میرٹھی اور حکیم فصیح الدین جیسے اہل قلم نے بچوں کی ذہنی سطح اور نفسیاتی تقاضوں کے مطابق تحریریں پیش کیں۔ مولوی اسماعیل میرٹھی کی نظمیں مثلاً 'ہماری گائے'، 'بارش' اور 'پرندہ' آج بھی اردو نصاب کا حصہ ہیں اور بچوں میں سادگی، انسانی ہمدردی، فطرت سے محبت اور اخلاقی تربیت کے جذبات پیدا کرتی ہیں۔

ابتدائی دور میں بچوں کا ادب زیادہ تر شاعری یا پھر دادی نانی کی کہانیوں کی نثری شکل میں موجود تھا۔ گھریلو ماحول میں سنائی جانے والی لوک کہانیاں، جنات، پریوں اور دیووں کی داستانیں بچوں کے تخیل کو مہمیز دیتی تھیں۔ ان کہانیوں کا بڑا حصہ زبانی روایات کے ذریعے نسل در نسل منتقل ہوتا رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان داستانوں کو تحریری شکل دی گئی اور ادب اطفال کا ایک باقاعدہ ذخیرہ وجود میں آیا۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اردو ادب اطفال کی تشکیل میں دیگر زبانوں کی روایات کا بھی خاصا اثر رہا ہے۔ اگرچہ انگریزی اور چینی زبان میں بچوں کے ادب کی روایت زیادہ قدیم ہے، تاہم روسی اور اطالوی ادب میں بھی بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں اور ناولوں کی ایک مضبوط روایت موجود ہے۔ ہند آریائی زبانوں میں بھی ادب اطفال کی روایت زمانہ قدیم سے پرانوں اور لوک کہانیوں میں موجود رہی ہے۔ پنچ تنتر اور ہتوپدیش جیسی کہانیاں دراصل اخلاقی حکایات کا ایسا ذخیرہ ہیں جو صدیوں سے بچوں کی تربیت کا ذریعہ بنتے رہے ہیں۔

اگر دیگر زبانوں کے ادب اطفال کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اگرچہ بنیادی موضوعات مثلاً اخلاقی تربیت، علم دوستی، سچائی اور محنت کی اہمیت تقریباً تمام زبانوں میں مشترک ہیں، لیکن ہر زبان نے اپنے سماجی اور تہذیبی پس منظر کے مطابق اس صنف کو مختلف انداز میں فروغ دیا ہے۔ اردو ادب اطفال میں جہاں مقامی ثقافتی اقدار کو بڑی مہارت سے شامل کیا گیا ہے وہیں دیگر زبانوں کے اثرات بھی نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ عربی اور فارسی کی اخلاقی حکایات، ہندی ادب کی حقیقت نگاری اور انگریزی ادب کی مہم جوئی، سائنسی رجحان، ایجادات اور تخیلاتی فضا نے اردو ادب اطفال کو رنگا رنگ جہت عطا کی ہے۔ دیگر زبانوں سے تراجم نے اس کے دامن کو اور وسیع کیا ہے۔

اردو ادب اطفال کی ترقی میں بچوں کے رسائل نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں کئی رسائل منظر عام پر آئے جنھوں نے بچوں کے ادب کی تخلیق اور اشاعت کو فروغ دیا۔ لاہور سے شائع ہونے والا ''بچوں کا اخبار'' 1902ء بچوں کے ابتدائی رسائل میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد رسالہ ''پھول'' (1909، لاہور) اور ''کھلونا'' (دہلی) کو اردو ادب اطفال کے فروغ میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ماہنامہ ''بچوں کا اخبار'' کو بعض ناقدین بچوں کا پہلا باقاعدہ رسالہ قرار دیتے ہیں۔ تاہم امداد صابری نے اپنی کتاب تاریخ صحافت اردو میں ہفتہ وار اخبار ''خیر خواہ اطفال'' کے یکم اپریل 1872 کو لکھنؤ سے شائع ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اس اعتبار سے خیر خواہ اطفال کو اردو کا پہلا بچوں کا اخبار یا رسالہ کہا جا سکتا ہے۔ ان رسائل میں دلچسپ کہانیاں، نظمیں اور نئی نئی معلومات فراہم کی جاتی تھیں۔

یہ حقیقت مسلم ہے کہ رسائل اطفال نے نہ صرف بچوں کے ادبی ذوق کو پروان چڑھایا بلکہ انہیں تعلیمی اور سماجی شعور سے بھی آشنا کیا۔ ان رسائل نے ادیبوں اور شاعروں کو بچوں کے لیے لکھنے کی تحریک دی اور نئی نسل کے لکھنے والوں کو بھی سامنے لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اردو کے بہت سے بڑے ادیبوں اور شاعروں نے کسی نہ کسی مرحلے پر بچوں کے لیے ضرور لکھا۔ ان میں مولوی اسماعیل میرٹھی، علامہ اقبال، افسر میرٹھی، حکیم فصیح الدین فصیح، امام بخش صہبائی، ذکاء اللہ، برج نرائن چکبست، تلوک چند محروم، سرور جہاں آبادی، حفیظ جالندھری، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، رضیہ سجاد ظہیر، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عبدالحسین، شفیع الدین نیر، کرشن چندر، صالحہ عابد حسین، قدسیہ زیدی، عبدالغفار مدھولی، امتیاز علی تاج، حسین حسان، لیلیٰ خواجہ بانو، خسرو متین، متین طارق باغپتی، یوسف پاپا، سراج انور، خوشحال زیدی، احمد ندیم قاسمی، مظفر حنفی، پرکاش پنڈت، آصفہ مجیب، ظفر پیامی، مائل خیرآبادی اور ابوالمجاہد زاہد وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ان ادیبوں کی تحریروں میں بچوں کو سچائی، محنت، ایمانداری، ہمدردی انسان دوستی اور حب الوطنی جیسے اوصاف سکھانے پر زور دیا گیا ہے۔ بعد کے دور میں شمس الرحمٰن فاروقی، غلام حیدر، مرتضیٰ ساحل تسلیمی، رئیس صدیقی، سراج عظیم، فاروق سید، انیس اعظمی، نعیمہ جعفری پاشا، انور مرزا اور رخشندہ روحی جیسے ادیبوں نے ادب اطفال کو نئے اسلوب اور نئے موضوعات کے ساتھ آگے بڑھایا۔

انگریزی ادب اطفال کا اثر

انگریزی ادب اطفال نے دنیا بھر میں بچوں کی تخلیقی اور فکری دنیا کو نئی جہتیں عطا کی ہیں۔ لیوس کیرول کی مشہور تصنیف Alice in Wonderland (1865)، مارک ٹوین کی Tom of Adventures Sawyer (1876) اور جے کے رولنگ کی Harry Potter سیریز (1997–2007) بچوں کے تخیل، مہم جوئی اور حیرت انگیز واقعات سے بھرپور ادب کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اسی طرح کارٹون سیریز Jerry & Tom نے بھی بچوں کی تفریح اور تخیل کی دنیا پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

انگریزی ادب کے ان اثرات کی جھلک اردو ادب اطفال میں بھی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اردو کے کئی ادیبوں نے مہم جوئی، فنتاسی اور سائنسی فکشن کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ مثال کے طور پر شفیع الدین نیر کی کہانی ننھی پری کی دنیا، سراج انور کی خوفناک جزیرہ اور کالی دنیا نیلی دنیا، ظفر پیامی کی ستاروں کے قیدی، ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی کی سائنسی کہانیوں کی سیریز اور ڈاکٹر سلیم خان کی مختلف تحریریں اس روایت کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان کہانیوں میں دوستی، جستجو، سائنسی شعور اور امید کے عناصر نمایاں ہیں جو جدید انگریزی ادب کے اثرات کو ظاہر کرتے ہیں۔

ہندی ادب اطفال کا اثر

ہندی ادب میں بچوں کے ادب کی ایک مضبوط روایت موجود ہے۔ پریم چند اس میدان کے نمایاں ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر ہری کرشن دیوسرے، جے پرکاش بھارتی، مہادیوی ورما، سوہن لال دویدی، رام دھاری سنگھ دنکر، دواریکا پرساد مہیشوری، ڈاکٹر ناگیش پانڈے، نرنکار دیو سیوک، انت پئی اور شکنتلا کالرا جیسے ادیبوں نے بچوں کے ادب کو فروغ دیا۔ ہندی رسائل مثلاً لوٹ پوٹ، چمپک، نندن، بال بھارتی اور بال ہنس نے ادب اطفال کی اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ہندی کی مشہور مزاحیہ سیریز چاچا چودھری اور موٹو پتلو بچوں میں بے حد مقبول رہی ہیں۔

پریم چند کی کہانیاں اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں یکساں مقبول ہیں۔ ان کی مشہور کہانی عیدگاہ بچوں کے ادب کی ایک لازوال مثال ہے۔ اس کہانی میں نہ صرف اخلاقی سبق موجود ہے بلکہ طبقاتی مساوات، قربانی اور انسانی ہمدردی جیسے جذبات بھی بڑی خوبصورتی سے پیش کیے گئے ہیں۔ اردو ادب میں اس روایت کی جھلک عصمت چغتائی کی نانی کی کہانیاں اور کرشن چندر کی بعض تحریریں اور پنچ تنتر کی کہانیاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں جن میں حقیقت نگاری اور سماجی شعور کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔

عربی اور فارسی ادب کا اثر

اردو ادب کی طرح ادب اطفال بھی عربی اور فارسی ادبی روایات سے متاثر ہے۔ عربی کی کلاسیکی کتابیں جیسے کلیلہ و دمنہ اور الف لیلہ نے اردو کہانیوں میں تمثیل، حکایت اور اخلاقی سبق کو نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کہانیوں میں جانوروں اور خیالی کرداروں کے ذریعے انسانی صفات اور اخلاقی اصولوں کو بیان کیا گیا ہے۔

فارسی ادب میں سعدی کی گلستان اور بوستان ایسی تصانیف ہیں جن میں اخلاقی حکایات کے ذریعے انسان کی تربیت پر زور دیا گیا ہے۔ یہی طرزِ بیان بعد میں اردو ادب میں بھی اختیار کیا گیا۔ اردو کی مشہور توتا کہانیاں دراصل فارسی اور عربی روایات کا تسلسل ہیں جن میں تمثیلی اور اخلاقی انداز نمایاں ہے۔

عصری منظرنامہ

جدید دور میں ادب اطفال کے موضوعات کا دائرہ پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع ہو چکا ہے۔ اب یہ ادب صرف اصلاحی یا مذہبی نوعیت تک محدود نہیں بلکہ سائنسی، تفریحی، معلوماتی، ماحولیاتی تحفظ اور عالمی مسائل پر بھی گفتگو کرتا ہے۔ ٹیکنالوجی، خلائی تحقیق، ماحولیات، انسانی حقوق اور عالمی امن جیسے موضوعات بھی بچوں کے ادب میں شامل ہو رہے ہیں۔

آج کے ادیب بچوں کے ادب میں صنفی مساوات، ثقافتی ہم آہنگی، امن، رواداری اور سماجی ذمہ داری جیسے موضوعات کو بھی اہمیت دے رہے ہیں۔

اس کے علاوہ ڈیجیٹل میڈیا اور انٹرنیٹ کے ذریعے بچوں کے ادب کی نئی شکلیں سامنے آ رہی ہیں، جن میں آن لائن کہانیاں، آڈیو بکس اور اینی میشن بھی شامل ہیں۔ آج کے دور میں ڈیجیٹل میڈیا اور انٹرنیٹ اپنی بات پہنچانے کا انتہائی موثر ذریعہ ہے۔ کووڈ کے دوران جب سب کچھ ٹھپ ہو گیا تھا تب بچوں کو تعلیم سے جوڑنے کا یہی واحد ذریعہ تھا۔ اس وقت کتاب پڑھنے کے بجائے بچوں کا زیادہ وقت اسکرین پر گزر رہا ہے۔ اس کے منفی اثرات سے بچوں کو بچانے کے لیے سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے۔

اس مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اردو ادب اطفال عالمی ادب سے کسی طور کم نہیں۔ اس نے عربی اور فارسی کی اخلاقی روایت، ہندی ادب کی حقیقت نگاری اور انگریزی ادب کے تخیل و مہم جوئی کے عناصر کو اپنی تہذیبی روح کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب اطفال نہ صرف بچوں کی تعلیم و تربیت کا موثر ذریعہ ہے بلکہ اردو زبان کی ثقافتی بقا، فروغ اور ارتقا میں بھی اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

مستقبل میں ضروری ہے کہ بچوں کے ادب میں ڈیجیٹل دور کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نئے موضوعات اور نئے اسالیب کو شامل کیا جائے۔ ایسے انوویٹو Innovative پروگرام بنائے جائیں جو بچوں کو اسکرین پر وقت صرف کرنے کے بجائے کتابوں کی طرف متوجہ کریں۔ کیونکہ کتابیں علم و فن سے جوڑنے کا موثر اور بنیادی ذریعہ ہیں۔ ڈیجیٹلائزیشن اور تکنیکی وسائل نے نئی نسل کو زیادہ حساس، جذباتی، تیز رفتار اور باریک بیں بنا دیا ہے۔ اس لیے بچوں کے ادیبوں کو ایسا مواد تیار کرنا ہوگا جو ان کی ذہنی آسودگی اور دلچسپی کا ذریعہ بنے۔ تبھی بچوں کے کتاب کی طرف مائل ہونے کا امکان ہے۔ اگر اس سمت میں ادیب، ناشر اور تعلیمی ادارے سنجیدگی سے کام کریں تو اردو ادب اطفال نہ صرف قومی سطح پر بلکہ عالمی سطح پر بھی اپنی اہمیت کو مزید مستحکم کر سکتا ہے نیز وہ کتاب اور اسکرین کے درمیان توازن بھی قائم کر سکتا ہے۔

■

Dr. M H Ghazali
Sr. Journalist & columnist
F-18/14A, Abul Fazl Enclave-II
Shaheen Bagh, New Delhi-110025
E-mail:drmhghazali@gmail.com
Mob. 9810371907

تراجم

اردو زبان وادب کے فروغ میں ان کا حصہ

بلقیس مقبول

اردو زبان وادب کی ترویج میں ترجمے کی اہمیت ہمیشہ رہی ہے۔ ترجمہ زبان کو وسعت دیتا ہے، نئے مفاہیم سے روشناس کراتا ہے اور علمی سرمائے میں اضافہ بھی کرتا ہے۔ اس کے ذریعے مختلف زبانوں کے ادب تک رسائی اور ذہنی وفکری کشادگی پیدا ہوتی ہے۔ اردو میں ترجمہ نگاری کی روایت بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود اردو زبان کی تاریخ۔ اس کا آغاز برصغیر میں پندرھویں صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ ڈاکٹر ظ انصاری اردو کی ابتدائی تشکیل میں ترجموں کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اردو تو ایک باقاعدہ زبان بنی ہی ترجموں کی بدولت، ورنہ جب تک وہ کھڑی بولی کے روپ میں تھی اسے کسی بڑے قلم کار نے ادبی تصنیف کے قابل نہ سمجھا۔ بولی سے زبان تک کا طویل فاصلہ ایک صدی کے اندر طے کرنے میں ترجموں کا بڑا ہاتھ ہے''[1]

اردو زبان کے ابتدائی سفر میں صوفیائے کرام نے روحانی تعلیمات کے ساتھ ساتھ زبان کی تشکیل اور ترجمہ نگاری کی روایت کو بھی مضبوط کیا۔ شیخ عین الدین گنج العلم،، سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز، شاہ میراں جی شمس العشاق، شاہ برہان الدین جانم وغیرہ جیسے صوفی بزرگوں نے مختلف متون کو سادہ اور عام فہم زبان میں منتقل کیا، جس سے عوام تک پیغام رسانی آسان ہوئی اور اردو میں مکالمہ نویسی کی بنیاد پڑی۔ صوفیانہ نثر ونظم نے فارسی کی لطافت، عربی کی گہرائی اور مقامی حکمت کو یکجا کر کے اردو زبان کو کم عرصے میں وسعت اور مضبوط ادبی بنیاد فراہم کی۔

قطب شاہی، عادل شاہی اور ابتدائی مغلیہ دور میں اردو ترجمہ نگاری کو نمایاں فروغ ملا۔ حکمرانوں کی سرپرستی کے سبب مختلف زبانوں کی تخلیقات اردو میں منتقل ہوئیں اور ترجمے کی روایت مضبوط ہوئی۔ قطب شاہی عہد میں ملا وجہی کی ''سب رس''، غواصی کی ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' اور ابن نشاطی کی ''پھول بن'' نے دکنی اردو کو فکری اور ادبی طور پر مضبوط بنایا۔ یہ تمام کوششیں اردو کے بیانیہ اور ترجمہ نگاری کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں اہم سنگِ میل ثابت ہوئیں۔

اردو ترجمہ نگاری کا منظر اس وقت بدلنے لگا جب انگریزوں نے منظم تعلیمی سرگرمیوں کے ذریعے ترجمے کو ادارہ جاتی شکل دینے کا فیصلہ کیا۔ اس سے پہلے ترجمہ زیادہ تر انفرادی کاوشوں تک محدود تھا، لیکن فورٹ ولیم کالج کے قیام نے اس عمل کو ایک باقاعدہ سمت عطا کی۔ اس کالج میں عربی، فارسی، سنسکرت اور اردو میں ترجمے کیے گیے۔ ان میں اردو کو زیادہ اہمیت دی گئی اور نئے آنے والے انگریز افسروں کی تربیت کے لیے اسے بنیادی زبان کے طور پر پڑھایا جانے لگا۔ گلکرسٹ کو جب اس شعبے کی ذمہ داری ملی تو انھیں نصابی کتابوں کی شدید کمی کا سامنا کرنا پڑا، جس کے نتیجے میں کالج نے خود اپنی درسی کتابیں تیار کیں۔ ان کتابوں میں تراجم کے ساتھ ساتھ تالیفات اور تصنیفات بھی شامل تھیں، جن میں پابند اور آزاد دونوں طرح کے تراجم موجود تھے۔ فورٹ ولیم کالج کی کاوشوں نے اردو نثر کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اس سے پہلے اردو میں نثر تو موجود تھی، مگر وہ محدود، غیر مربوط اور ادبی معیار سے دور تھی۔ کالج نے عربی، فارسی اور سنسکرت جیسی بڑی زبانوں سے اردو میں منظم ترجمے کروائے اور ایسے نصابی و ادبی متون تیار کیے جو نہ صرف آسان زبان میں تھے بلکہ مستقبل کی اردو نثر کے لیے بنیاد بھی بنے۔ کالج میں میر شیر علی افسوس، مرزا فطرت، بہادر علی حسینی، للولال جی، میر امن اور دیگر اہلِ قلم کے تراجم اور تصانیف نے اردو کے اسلوب اور بیان کو ایک نیا رخ دیا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ کالج نے لفظی ترجمے کے بجائے مفہوم کو اردو کے مزاج میں ڈھال کر پیش کرنے کی روایت قائم کی، جس نے اردو نثر کو بے جا ثقالت اور غرابت سے نکال کر سادگی، روانی اور وضاحت کی طرف گامزن کیا۔ اگرچہ فورٹ ولیم کالج کا مقصد انگریز افسروں کو مقامی زبان سکھانا تھا، لیکن اس عمل کے نتیجے میں اردو کو وہ فائدہ پہنچا کہ یہ زبان پہلی مرتبہ تعلیم، ترجمہ، تحریر اور انتظامی امور کے لیے باقاعدہ زبان کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اس طرح فورٹ ولیم کالج اردو زبان کی ادبی تشکیل، ترجمہ نگاری کی مضبوط

روایت اور اردو نثر کے قیام میں سنگِ میل ثابت ہوا۔

فورٹ ولیم کالج کے بعد اردو زبان کی ترویج، اس کے علمی استحکام اور ترجمہ نگاری کی باقاعدہ روایت کو جس ادارے نے نئی جہت عطا کی، وہ دہلی کالج تھا۔ یہاں ہندوستانی طلبہ کو مغربی علوم سے روشناس کرانے کے لیے بڑے پیمانے پر انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا، اور اسی مقصد کے تحت 1842 میں دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم ہوئی۔ اس سوسائٹی نے جدید مضامین کی تالیف اور ترجمے کے ذریعے ہندوستانی زبانوں، خصوصاً اردو کے فروغ کو اپنا بنیادی مقصد بنایا۔ چونکہ اصل کتابوں کی پیچیدہ زبان طلبہ کے لیے فوری طور پر قابلِ فہم نہ تھی، اس لیے آزاد ترجمے کو ترجیح دی گئی تاکہ علمی مواد کو سادہ، رواں اور عام فہم اردو میں منتقل کیا جا سکے۔ ریاضی، فلسفہ اور تاریخ جیسے مضامین پہلی مرتبہ اردو کے ذریعے پڑھائے جانے لگے، مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ مغربی متون کے تراجم جامع اور منظّم ہوں۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر ایجوکیشنل کمیٹی قائم کی گئی، جس نے دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کو مزید مضبوط بنایا اور نصابی کتب کی تیاری اور ترجمے کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا۔ دہلی کالج پورے ہندوستان میں وہ واحد ادارہ تھا جہاں مغربی علوم کی تعلیم اردو کے ذریعہ دی گئی، جب کہ اس سے قبل عربی، فارسی اور سنسکرت ہی تدریسی زبانیں تھیں۔ دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کو فروغ دینے میں ڈاکٹر اشپرنگر، منشی کریم الدین، مولوی ذکاء اللہ، پنڈت رام کرشن اور پیارے لال وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ ماسٹر رام چندر اور امام بخش صہبائی انجمن کے روح رواں تھے۔ دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی خدمات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے انیسویں صدی کے اوائل میں اردو میں مختلف موضوعات پر ایسی کتابیں شائع کیں جنھوں نے اردو نثر کے دامن کو بے حد وسیع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مہدی افادی نے بجا طور پر کہا کہ:

''یہ کل کی چھوکری یورپ کی بڑی زبانوں سے آنکھ ملانے کے لائق ہوگئی''[2]

انیسویں صدی میں سرسید احمد خان کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی نے اردو ترجمہ نگاری میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ یہ سوسائٹی اس مقصد کے لیے قائم کی گئی تھی کہ جدید مغربی علوم کو ہندوستانی معاشرے تک ان کی اپنی زبان میں پہنچایا جائے، تاکہ لوگ سائنسی، سماجی اور معاشی موضوعات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ سائنٹفک سوسائٹی نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ انگریزی کتابوں بالخصوص سائنسی اور فکری نوعیت کی تصانیف کا اردو میں ترجمہ کیا جائے، اور ان تراجم کے ساتھ وضاحتی حواشی شامل کیے جائیں تاکہ عام قاری کے لیے مشکل اصطلاحات اور مغربی فکر کو سمجھنا آسان ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ اس سوسائٹی کے تراجم کم تعداد میں ہونے کے باوجود نہایت اعلیٰ علمی معیار کے حامل تھے اور انھوں نے اردو کو ایک فکری اور سائنسی زبان کے طور پر مضبوط بنیاد فراہم کی۔

> **اردو ترجمہ نگاری کا منظر اس وقت بدلنے لگا جب انگریزوں نے منظّم تعلیمی سرگرمیوں کے ذریعے ترجمے کو ادارہ جاتی شکل دینے کا فیصلہ کیا۔ اس سے پہلے ترجمہ زیادہ تر انفرادی کاوشوں تک محدود تھا، لیکن فورٹ ولیم کالج کے قیام نے اس عمل کو ایک باقاعدہ سمت عطا کی۔ اس کالج میں عربی، فارسی، سنسکرت اور اردو میں ترجمے کیے گیے۔ ان میں اردو کو زیادہ اہمیت دی گئی اور نئے آنے والے انگریز افسروں کی تربیت کے لیے اسے بنیادی زبان کے طور پر پڑھایا جانے لگا۔**

سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعے شائع ہونے والے تراجم میں یہ رجحان نمایاں تھا کہ مغربی نظریات اور اصطلاحات کو براہ راست اردو سانچے میں ڈھالا گیا، جس سے اردو نثر میں ایک نیا علمی مزاج پیدا ہوا۔ علاوہ ازیں سرسید نے سوسائٹی کے تحت ''انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' جاری کیا، جس میں سائنسی، اخلاقی، سماجی اور سیاسی موضوعات پر مضامین اور تراجم شائع ہوتے تھے۔ اس اخبار نے نہ صرف علمی مباحث کو عام کیا بلکہ سیاسی بصیرت اور معاشرتی شعور کو بھی فروغ دیا۔ سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ہونے والے تراجم نے معاشی، سائنسی اور فکری اصطلاحات کو اردو میں جگہ دی، اور مترجمین نے طویل حواشی کے ذریعے پیچیدہ مباحث کو آسان بنا کر پیش کیا۔ اس دوران عنایت اللہ دہلوی نے انگریزی ادب کی اہم اور مشکل کتابوں جیسے ''دانتے'' کی ''ڈیوائن کامیڈی''، اناطول فرانس کا ناول ''تائیس''، فلابیر کی ''سلامبو''، کپلنگ کی ''جنگل بک'' اور شیکسپیئر کے ڈراموں کے کامیاب تراجم کر کے اردو ادبی ترجمہ نگاری کو بھی ایک نیا وقار عطا کیا۔ سائنٹفک سوسائٹی کی انہی کاوشوں نے بعد کے زمانے میں کئی اداروں اور انجمنوں کو ترجمہ نگاری کی طرف راغب کیا اور اردو کو جدید علوم کے اظہار کا ایک وسیلہ بنا دیا۔

انجمن پنجاب لاہور، جس کا قیام 1865 میں عمل میں آیا، اردو زبان اور ادب کے فروغ میں ایک نمایاں سنگِ میل ثابت ہوئی۔ اس انجمن کا بنیادی مقصد پنجاب میں تعلیم کی ترقی اور علوم وفنون کی ترویج تھا، مگر بہت جلد یہ ادارہ اردو زبان کی علمی اور ادبی ترقی کا مرکز بن گیا۔ انجمن نے اپنے شعبۂ تصنیف، تالیف اور ترجمہ کے تحت نہ صرف جدید علمی موضوعات پر مضامین شائع کیے بلکہ ترجمہ نگاری کو ایک منظّم ادبی سرگرمی کے طور پر فروغ دیا۔ کچھ سال میں انجمن پنجاب میں شائع ہونے والے ایک سو چالیس سے زیادہ مضامین نے اردو نثر میں نئے علمی مباحث متعارف کرائے۔ انجمن کے خطبات اور جلسوں نے اردو میں تقریر، مقالہ نگاری اور تنقیدی شعور کو مضبوط کیا، جب کہ اس کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے مشاعروں نے اردو شاعری میں جدید رجحانات کی بنیاد رکھی اور نئے موضوعات کو فروغ دیا۔ انجمن نے یہ بات ثابت کی کہ اردو نہ صرف ادبی اظہار کی زبان ہے بلکہ علمی اور سماجی مباحث کے لیے بھی پوری طرح موزوں ہے۔ یوں انجمن پنجاب لاہور نے اردو زبان کی علمی، تخلیقی اور ادبی عظمت کو نئی سمت

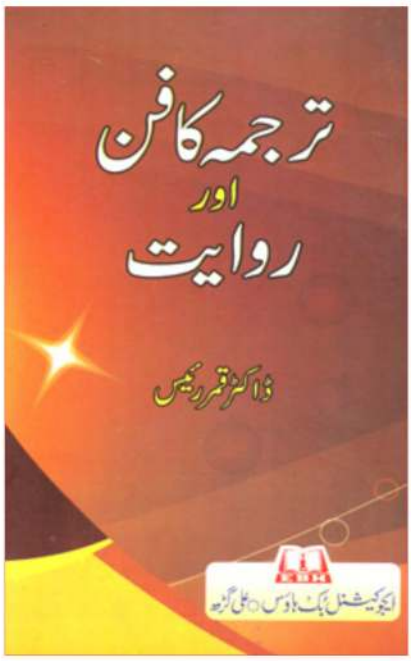

عطا کی اور اسے ایک زندہ، متحرک اور ترقی پذیر زبان کے طور پر مستحکم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

اردو ترجمہ نگاری کو ادارہ جاتی بنیاد فراہم کرنے میں سب سے نمایاں کردار جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے دارالترجمہ نے ادا کیا، جو برصغیر میں جدید علوم کو مقامی زبان کے ذریعے پڑھانے کی پہلی باقاعدہ کوشش تھی۔ 1918 میں جامعہ عثمانیہ کے قیام کے ساتھ ہی یہ فیصلہ کیا گیا کہ ذریعۂ تعلیم اردو ہوگی، اور اسی مقصد کی تکمیل کے لیے سررشتۂ تالیف و ترجمہ قائم کیا گیا۔ دارالترجمہ کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ جدید سائنسی، فنی، سماجی اور فلسفیانہ مضامین کی مستند کتابوں کو اردو میں منتقل کر کے ایسی علمی فضا پیدا کی جائے جس میں طلبہ اپنی زبان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ اسی مقصد کے تحت تقریباً پانچ سو سے زیادہ کتابوں کا ترجمہ کیا گیا، جن میں آرٹس، سائنس، انجینئرنگ، طب، قانون اور فلسفہ جیسے مضامین شامل تھے۔ ڈاکٹر وحیدالدین، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر سید عابد حسین، نظم طباطبائی اور دیگر اہلِ علم نے اس ادارے کے لیے معیاری تراجم کیے۔ مرزا محمد ہادی رسوا نے بھی دارالترجمہ میں اصول علم کیمیا، افلاطون و ارسطو اور فلسفیانہ متون کے تراجم کر کے اردو کے علمی ذخیرے میں گراں قدر اضافہ کیا۔ دارالترجمہ کی خدمات کا سب سے بڑا پہلو یہ تھا کہ اس نے اردو کو پہلی مرتبہ ایک مکمل تدریسی، سائنسی اور تحقیقی زبان کے طور پر یہ ثابت کیا کہ اردو جدید ترین علمی مباحث کو نہ صرف ادا کر سکتی ہے بلکہ انھیں اپنی فہم کے مطابق ڈھال بھی سکتی ہے۔ یوں جامعہ عثمانیہ اور اس کا دارالترجمہ اردو زبان کی علمی تاریخ میں ایک ایسے روشن باب کی حیثیت رکھتے ہیں جس نے ترجمہ نگاری کی روایت کو منظم، مضبوط اور ہمہ جہت بنایا۔

1936 کے بعد اردو ادب میں ادبی، تنقیدی اور تخلیقی تراجم میں نمایاں اضافہ ہوا ۔اس دور میں ارسطو کی بوطیقا کے کئی ترجمے کیے گئے۔جن میں عزیز احمد نے ''فنِ شاعری'' اور شمس الرحمٰن فاروقی نے ''شعریات'' کے نام سے بوطیقا کا ترجمہ کیا۔جمیل جالبی کی ترجمہ شدہ کتاب ''ارسطو سے ایلیٹ تک ''انگریزی مضامین کا ترجمہ'ایلیٹ کے مضامین' اور ہڈسن ولیم ہنری کی ادبی کتاب کے ترجمے نے اردو تنقید کو ایک نئے فکری رویے سے آشنا کیا۔ نیاز فتح پوری نے گیتانجلی کو''عرضِ نغمہ'' کے نام سے منتقل کیا، جب کہ سجاد حیدر یلدرم، حامد اللہ افسر، صادق الخیری اور دیگر مترجمین نے مغربی افسانوں کو اردو میں متعارف کرایا۔ فرانسیسی، روسی اور امریکی ادب کے تراجم نے اردو نثر کو نئے اسالیب اور نئے بیانیوں سے روشناس کیا۔ ناول اور افسانے کی جدید تکنیکیں بھی انہی تراجم کے ذریعے اردو میں آئیں، اور پریم چند، منٹو اور مرزا ہادی رسوا جیسے ادیبوں نے ان اثرات کو عملی صورت دی۔

اردو رسائل مخزن (لاہور)، زمانہ (کانپور)، نگار (آگرہ)، صلائے عام (دہلی) وغیرہ نے یورپی افسانوں کے تراجم شائع کرنے میں اہم خدمت انجام دی، جس سے اردو کا ادبی اور فکری دامن پہلے سے کہیں زیادہ وسیع اور پختہ ہوا۔ مختصر یہ کہ اس دور کی ترجمہ نگاری نے اردو ادب کو نئے رجحانات، نئی فکری سمت اور عالمی ادبی روایت سے گہرا ربط عطا کیا۔

اردو زبان و ادب کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ترجمہ نگاری نے اس زبان کی فکری، علمی اور ادبی تشکیل میں بنیادی اور فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ ابتدائی صوفیا کی کوششوں سے لے کر قطب شاہی اور عادل شاہی ادوار کے ادبی تجربات، فورٹ ولیم کالج کی منظم نثری روایت، دہلی کالج کی علمی و تعلیمی سرگرمیوں، سائنٹفک سوسائٹی کی سائنسی و فکری کاوشوں اور جامعہ عثمانیہ کے عظیم ادارۂ ترجمہ تک ہر دور میں تراجم نے اردو کو نئی جہتیں عطا کیں۔ ان اداروں نے نہ صرف مختلف زبانوں کے علمی و ادبی سرمایہ کو اردو میں منتقل کیا بلکہ اردو کو ایک کارآمد، بامقصد، سائنسی اور تحقیقی زبان کے طور پر مستحکم کیا۔ بیسویں صدی میں ترجمے کی رفتار اور اس کے دائرے دونوں وسیع ہوئے، مغربی تنقید، فلسفہ، ناول، افسانہ اور شاعری کے تراجم نے اردو کی ادبی وسعت میں بے پناہ اضافہ کیا اور اسے عالمی ادب کے ساتھ فکری و فنی سطح پر ہم آہنگ کیا۔ تراجم کے ذریعے اردو میں نئے اسالیب، نئی تکنیکیں، نئی فکری سمتیں اور نئی ادبی اصناف داخل ہوئیں، جنھوں نے اردو کے ادبی سرمائے کو نہ صرف توانا کیا بلکہ آنے والے زمانوں کے لیے ترقی و تخلیق کی نئی راہیں بھی ہموار کیں۔ اس طرح یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اردو زبان و ادب کی اشاعت، وسعت، گہرائی اور عالمی پذیرائی میں تراجم کا کردار بنیادی ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ ڈاکٹر ظ انصاری، ترجمے کے بنیادی مسائل، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس، تاج پبلشنگ ہاؤس جامع مسجد دہلی، 1976، ص 81

2۔ سید ضمیر حسن، دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس، تاج پبلشنگ ہاؤس جامع مسجد دہلی، 1976 ص: 320

Bilkees Maqbool
Research Scholar, Department of Urdu, AMU, Aligharh -202002
Mob. 7006231496
Email: justbilkees@gmail.com

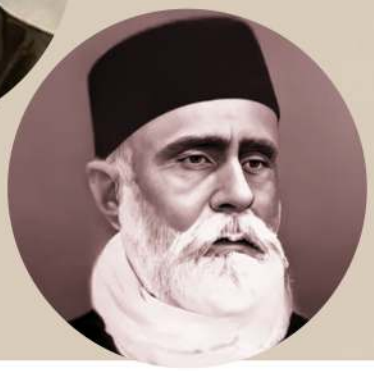

1857 کے بعد مثنوی اور نظم

تسنیم قمر

انقلاب 1857 میں ناکامی کے بعد حکومت پر انگریزوں کے تسلط سے زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح ادب میں بھی نئے نئے خیالات اور جدید نظریات آرہے تھے۔ داخلیت کی بجائے خارجی مسائل اور خارج کے وسیع سلسلوں کو شعری مواد اور اظہار کا وسیلہ بنایا جانے لگا۔ تصورات کی بجائے حقیقت پسندی اور واقعیت کا مقام بلند ہونے لگا۔ ادب میں مافوق الفطرت عناصر کی جگہ زندگی کے ٹھوس حقائق زیادہ اہمیت اختیار کرنے لگے۔ اس طرح جدید شاعری کی بنیاد پڑی۔ اس کی ابتدا انگریزی نظموں کے ترجمے سے ہوئی اور پھر جب ملک کے طول وعرض میں انگریزی زبان کی تعلیم عام ہوئی تو انگریزی نظموں کے ترجموں کے ساتھ ساتھ نئی طرز کی نظمیں لکھی جانے لگیں۔ اردو شاعری کی دیگر اصناف کے مقابلے میں صنف مثنوی پر ان جدید طرز کی نظموں کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ کیونکہ مثنوی ایسی صنف شاعری ہے جس میں دنیا کی شاہکار نظمیں لکھی گئی ہیں۔ یہ صنف بڑی وسعت وتنوع کی حامل ہے۔

1857 کے بعد مثنوی پر نظم نگاری کے اثرات کا جائزہ لینے سے قبل یہ ذہن نشیں کر لینا مناسب ہوگا کہ مثنوی وہ طویل اور مسلسل صنف سخن ہے جس کا ہر ایک شعر جداگانہ قافیہ وردیف رکھتا ہے اور تسلسل بیان کے لحاظ سے تمام اشعار زنجیر کی کڑیوں کی طرح آپس میں جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کا انداز بیان بیانیہ ہوتا ہے۔ اس میں شاعری کی باقی تمام اصناف سے زیادہ تنوع اور وسعت پائی جاتی ہے۔ اس میں ہر قسم کا مضمون کھپایا جاسکتا ہے۔ اس صنف کا دامن اتنا کشادہ ہوتا ہے کہ دل کے کیف پرور نغمے، جذبات، محسوسات کیفیات وسانحات کے ساتھ تخیل کی بے پناہ وسعتیں، نفسیاتی تجربات ومنظر نگاری اور معرفت کی گہرائیاں یہ تمام چیزیں اس میں سمیٹی جاسکتی ہیں۔ مثنوی کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تسلسل بیان اور واقعہ نگاری کا اسلوب ہوتا ہے جو نظم کی دیگر اقسام سے مثنوی کو الگ کرتا ہے۔ جبکہ نظم جو شاعری کی ایک خاص صنف کے لیے مستعمل ہے، یہ اشعار کا ایسا مجموعہ ہے جس میں ایک مرکزی خیال ہوتا ہے اور ارتقائے خیال کی وجہ سے تسلسل کا احساس ہوتا ہے۔ اس صنف کے لیے کسی موضوع کی قید نہیں اور نہ اس کی ہیئت ہی معین ہے۔ ایسی نظمیں اردو کے ان اصناف سخن جیسے مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، رباعی وغیرہ سے الگ رکھی جاتی ہیں۔

1857 سے قبل لکھی گئی مثنویوں کے موضوعات پر نظر ڈالی جائے تو زیادہ تر مثنویوں کا موضوع تصوف، عشق وغیرہ پر مبنی ہے۔ یعنی زیادہ تر قدیم مثنویوں میں داخلی جذبات واحساسات کی عکاسی کی گئی ہے۔ مافوق الفطرت کی فراوانی ہے۔ دیو، جن، بھوت، پریاں، جادوگر، جادو کے محل، سلیمانی ٹوپی وغیرہ جابجا نظر آتے ہیں۔ لیکن جدید مثنوی نگاروں کی مثنویوں پر نظم نگاری کے اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں، کیونکہ جدید مثنوی نگاروں نے مثنوی کے روایتی مضامین سے انحراف کرتے ہوئے زندگی کے خارجی مسائل کی طرف توجہ مرکوز کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انقلاب 1857 میں ہندوستانیوں کی ناکامی کے بعد اقتدار پر انگریزوں کا تسلط ہوگیا، جس کا اثر یہ ہوا کہ زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح ادب میں بھی نئے نئے خیالات اور جدید نظریات آنے لگے۔ داخلیت کی بجائے خارجی مسائل کو اظہار کا وسیلہ بنایا جانے لگا۔ نظم کی طرح جدید مثنویوں میں زندگی میں پیش آنے والے واقعات بیان کیے جانے لگے۔ کیونکہ اس وقت کے حالات اسی کے متقاضی تھے۔

مثنوی کی اس نئی طرز اور نئے اسلوب کو اختیار کرنے میں اولیت کا شرف محمد حسین آزاد کو حاصل ہے۔ ان کی ان کوششوں میں ان کا بھرپور ساتھ الطاف حسین حالی نے دیا۔ آزاد نے جو مثنویاں لکھیں ان میں متعین مقصد کے تحت روزمرہ زندگی کو شعر کے سانچے میں ڈھالا گیا۔ جبکہ حالی نے بھی ایسے ہی موضوعات پر مثنویاں لکھیں۔ آزاد اور حالی نے جس جدید نظم کی بنیاد رکھی وہ جدید اور قدیم کا معتدل آمیزہ ہے۔ پہلے موضوعات میں تبدیلی لائی گئی پھر ہیئت کے تجربے بھی کیے گئے۔ محمد حسین آزاد نے شعر کے حقیقی مطمح نظر کو اس طرح واضح کیا ہے:

''شعر گلزار فصاحت کا پھول ہے۔ گلہائے الفاظ کی خوشبو ہے۔ روشنی عبارت کا پرتو ہے۔ علم کا عطر ہے۔ قوائے روحانی کا جوہر۔ روح کے لیے آب حیات ہے۔ گرد غم کو دل سے دھوتا ہے۔ طبیعت کو بہلاتا ہے۔ خیال کو عروج دیتا ہے۔ دل کو استغنا اور بے نیازی۔ ذہن کو قوت پرواز دیتا ہے۔ گرد افکار سے دامن دل کو بلند رکھتا ہے۔ تنہائی میں دل لگی پیدا کرتا ہے۔''[1]

اقتباس میں مذکور مطمح نظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے محمد حسین آزاد نے حالی کے ساتھ اردو میں فطری شاعری کی بنیاد رکھی اور اپنی شعری تخلیقات کے ساتھ اسے ایک نیا موڑ دیا۔ آزاد اور حالی نے انگریزی شاعری کی طرز پر اردو میں نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی۔ اردو شاعری انہی کی بدولت نیچرل شاعری کے اصل معنی سے واقف ہوئی۔ انھوں نے کرنل ہالرائیڈ کی تائید وتعاون سے 'انجمن پنجاب' کی بنیاد رکھی جس میں قومی اور اخلاقی موضوعات پر نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ اس کا مقصد اردو شاعری کی

اصلاح اور ترقی تھا۔ جس میں مصرع کی جگہ عنوان دیا جاتا تھا۔ یہیں سے اس دور کا آغاز ہوا جس کا عہد حاضر بھی ممنون ہے۔ حالی اور آزاد نے شاعری میں نئی روح پھونک دی۔ شاعری میں ایک ایسا انقلاب آیا کہ اردو کا شاعر حسن کی تصوراتی دنیا سے الگ ہوکر حقیقت پسندی کی طرف آ گیا۔ معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں پر نظمیں لکھنے کی شروعات ہوئی اور وہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ آزاد نظم کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

''نظم درحقیقت ایک شاخ گل ریز فصاحت کی ہے جس طرح پھولوں کے رنگ و بو سے دماغ جسمانی تروتازہ ہوتا ہے۔ شعر سے روح تروتازہ ہوتی ہے۔ پھولوں کی بو سے مختلف خوشبوئیں محسوس دماغ ہوتی ہیں۔ کسی کی بو تیز ہے۔ کسی کی بو مست ہے۔ کسی کی بو میں نفاست و لطافت ہے۔ کسی میں سہانا پن۔ اسی طرح مضامین اشعار کا بھی حال ہے جس طرح پھول کہ کبھی چمن میں، کبھی ہار میں، کبھی عطر کھینچ کر، کبھی عرق میں جا کر کبھی دور سے کبھی پاس سے مختلف کیفیتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح مضامین شعری مختلف حالتوں اور مختلف عبارتوں میں رنگا رنگ کی کیفیتیں عیاں کرتے ہیں۔''[2]

محمد حسین آزاد نے جدید نظم نگاری کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسی لیے انھیں جدید رنگ کا بانی کہا جاتا ہے۔ شاعری کی دنیا میں انھوں نے نظم گوئی کی جو روایت شروع کی آج بھی شعرا کی پسند ہے۔ اردو ادب میں بطور شاعر ان کا مقام بہت بلند نہیں لیکن ان کی شاعری نظر انداز نہیں کی جاسکتی ہے۔

آزاد نے انگریزی نظموں سے خیالات اخذ کر کے متعدد نظمیں لکھیں۔ مثلاً 'محنت کرو'، 'ایک تارے کا عاشق'، 'جسے چاہو سمجھ لو'، 'شرافت حقیقی'، 'جشن جوبلی' وغیرہ۔ ان کی مثنویاں 'شب قدر'، 'صبح امید'، 'حب وطن'، 'خواب امن'، 'دادِ انصاف'، 'وداعِ انصاف'، 'گنج قناعت'، 'ابر کرم'، 'زمستان'، 'مصدرِ تہذیب'، 'شرافت حقیقی' وغیرہ خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ آزاد کے شعری مجموعے 'خم کدۂ آزاد' اور 'مجموعہ نظم' جو حسن و عشق کی قید سے آزاد ہیں، ان کے مطالعے سے اردو شاعری میں جدید کروٹ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ نظم آزاد میں مثنوی کے ساتھ ساتھ غزلیات، اشعار، قصائد، رباعیات اور کچھ اخلاقی نظمیں شامل ہیں۔ ان کی غزلوں میں سنجیدہ تغزل ملتا ہے۔ لیکن نظمیں شوخ اور لطیف رنگ میں ہیں۔ انھوں نے مولانا الطاف حسین حالی کے ساتھ مل کر شعرا کو جدید طرز کی نظمیں کہنے پر راغب کیا۔ انھوں نے مخالفت کے باوجود قدیم اردو شاعری کو عشق و عاشقی، گل و بلبل، مبالغہ، تکلف و تصنع کی قید سے باہر نکالا اور نئی طرز شاعری کو مقبول عام کیا۔ اردو شاعری میں نئی روح پھونک کر اسے نئے اسلوب و انداز سے روشناس کرایا۔ انھوں نے نیچر کی پیروی کی اور صاف زبان میں اپنی باتیں کہیں۔

> **محمد حسین آزاد نے جدید نظم نگاری کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسی لیے انھیں جدید رنگ کا بانی کہا جاتا ہے۔ شاعری کی دنیا میں انھوں نے نظم گوئی کی جو روایت شروع کی آج بھی شعرا کی پسند ہے۔**

'شب قدر' محمد حسین آزاد کی اہم مثنوی ہے۔ اس میں رات کی آمد اور رات میں مختلف پیشوں سے وابستہ افراد کی زندگی کی عکاسی بڑی ہنرمندی سے کی گئی ہے۔ مزدور، مسافر، طالب علم، نجومی، شاعر، اہل جہاز، ماں اور اس کے بیمار بچے اور چور وغیرہ کے رات کے مشاغل کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

مزدور جا بجا تھے جو دکھ درد پا رہے
اور پاؤں تک سروں کے پسینے بہا رہے
بارِ گراں غریبوں نے سر پر اٹھائے ہیں
جب چار پیسے شام کو لے گھر میں آئے ہیں
اے شب تمام دن کی مصیبت سے ہار کے
تیرے عمل میں پاؤں ہیں سوئے پسار کے
دن بھر کے ہیں مسافر محنت زدہ بہت
آوارہ تا بشام ہیں شامت زدہ بہت
آئے ہیں دن کی دھوپ میں منزل جو مار کر
رستہ میں بوجھ بھی نہیں رکھا اتار کر
اے رات تو نے ڈالا جو رحمت کا سایہ ہے
اس وقت ان بچاروں نے آرام پایا ہے[3]

'شب قدر' کے درج بالا اشعار میں مزدوروں کی محنت و مشقت اور ان کے مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔ آزاد کی اس مثنوی میں عاشقانہ جذبات و احساسات، داخلی کیفیات اور مافوق الفطرت عناصر کی بجائے نظم کی طرح زندگی کے خارجی مسائل کو اظہار کا وسیلہ بنایا گیا ہے۔

مثنوی 'زمستان' میں سردی کے موسم میں مختلف لوگوں کے حالات و کیفیات کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس میں برف سے ڈھکی پہاڑیوں، برف پر پھسلنے، قطبین کی یخ بستہ فضاؤں کا نقشہ، گانے بجانے، معمر خواتین کا یاد ماضی سے لطف اندوز ہونے کے تصویر کشی کی گئی ہے۔ اسی طرح آزاد کی مثنوی 'حب وطن' میں وطن سے محبت کا ذکر کیا گیا ہے۔

'خواب امن' محمد حسین آزاد کی طویل مثنوی ہے۔ جس میں امن، علم، زراعت، تجارت، صنعت و حرفت، دولت اور فتنہ انگیزی کو پیش کیا ہے۔ یہ تمثیلی مثنوی سورج کے ڈوبنے اور ایک دشت پر بہار سے شروع ہوتی ہے جہاں کے پتے پتے پر امن و امان رقم ہے اور جہاں شیر و بکری ایک ہی گھاٹ سے پانی پیتے تھے۔ اس مثنوی میں جہاں ایک طرف امن و امان کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کی اہمیت و افادیت کی عکاسی کی گئی ہے وہیں دوسری جانب بے عملی، جہالت اور بدامنی کے مضر اثرات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

آزاد کی مثنویوں کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ ان کی مثنویوں میں حب الوطنی، ملکی حالات، زندگی کے خارجی مسائل نمایاں مقام رکھتے ہیں، ان مثنویوں پر نظم نگاری کے اثرات ہیں۔ منظر نگاری بہت دلکش ہے۔ لطافت اور نزاکت کے ساتھ جوش و ولولہ بھی ملتا ہے۔ داخلی کیفیات کم ملتی ہیں۔ رعایت لفظی کی پابندی ملتی ہے۔ حقیقی مناظر کی خوبصورت تخیلی پیشکش ملتی ہے۔

جدید شاعری کی بنیاد رکھنے میں محمد حسین آزاد کے ساتھ ساتھ الطاف حسین حالی کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے سرسید کی تحریک کے زیر اثر جو نظمیں لکھی ہیں، ان کے موضوعات نئے ہیں۔ انہوں نے بھی آزاد کی طرح شاعری کو عشق و محبت کی قید سے آزاد کرانے کی کوشش کی اور عام زندگی میں درپیش مسائل کی طرف توجہ مرکوز کی۔

حالی کی شاعری بالخصوص ان کی مثنویوں 'جواں مردی کا کام'، 'برکھارت'، 'نشاط امید'، 'حب وطن'، 'مناظرۂ رحم

و انصاف'، 'تعصب و انصاف'، 'کلمۃ الحق'، 'بیوہ کی مناجات'، 'دولت اور وقت کا مناظرہ'، 'حقوق اولاد' اور 'روٹی کیونکر میسر آتی ہے!' وغیرہ میں ماضی کی روایات کا احساس بہت شدید ہے۔ ان میں مسلمانوں کے گزشتہ کارناموں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ مٹی ہوئی عظمتوں کی کہانیاں، اسلامی تاریخ کے زریں ادوار کی بنیادی خصوصیات کو پیش کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے گزشتہ کارناموں، مٹی ہوئی عظمتوں اور اسلامی تاریخ کے زریں ادوار کی یاد تازہ کرنے کا حالی کا مقصد واضح ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ قوم کے لیے شمع راہ ثابت ہوں تاکہ وہ ترقی کی منزلوں پر گامزن ہوسکے۔ حالی کی مثنویوں میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور اسے دور کرنے کا پیغام نظر آتا ہے۔

حالی نے اپنی مثنویوں میں دنیاوی زندگی میں مذہب کی اہمیت و افادیت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ ان کی مثنویوں میں معاشرے میں زندگی کو بہتر بنانے کا احساس موجود ہے۔ ان میں اخلاقی اقدار کی اہمیت بھی نمایاں ہے۔ علمی اور تعلیمی معاملات کا تذکرہ بھی ہے۔ عورتوں پر ظلم و ستم، ان کی بے بسی اور کسمپرسی کا نوحہ بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ایک لائحہ عمل بھی ہے۔ غرض یہ کہ اس وقت کی زندگی میں پیش آنے والے جتنے بھی موضوعات تھے، ان سب کی ترجمانی کسی نہ کسی صورت سے حالی نے اپنی مثنویوں میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے حالی شاعری کی دیگر اصناف کے مقابلے مثنوی کی اہمیت و افادیت کے قائل ہیں کیونکہ اس میں زندگی کے داخلی اور خارجی ہر طرح کے مسائل سموئے جاسکتے ہیں۔ مثنویوں کے موضوعات میں تنوع کے سلسلے میں حالی فرماتے ہیں:

''جنتی صنفیں فارسی اور اردو شاعری میں متداول ہیں، ان میں کوئی صنف، مسلسل مضامین بیان کرنے کے قابل، مثنوی سے بہتر نہیں ہے۔ یہی وہ صنف ہے جس کی وجہ سے فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔ عرب کی شاعری میں مثنوی کا رواج نہ ہونے یا نہ ہوسکنے کے سبب، تاریخ یا قصہ یا اخلاق یا تصوف میں ظاہراً ایک کتاب بھی ایسی نہیں لکھی جاسکی جیسی فارسی میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں لکھی گئی ہیں۔ اسی لیے عرب، شاہنامے کو قرآن العجم کہتے ہیں۔ اور اسی لیے مثنوی معنوی کی نسبت 'ہست قرآن در زبانِ پہلوی' کہا گیا ہے۔''[4]

درج بالا اقتباس سے حالی کے نزدیک مثنوی کی اہمیت اجاگر ہوجاتی ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ داخلی احساسات و جذبات اور عشقیہ مضامین کی بجائے حالی شاعری میں زندگی کے مسائل کو اہمیت دیتے ہیں اور ان مضامین کو باندھنے کے لیے مثنوی سے بہتر اور کوئی صنف نہیں ہوسکتی ہے۔ ان کی مثنویوں میں اس زمانے کی حالت، غور و فکر کا انداز، خیالات و تصورات، ذہنی و جذباتی رجحانات سب کچھ موجود ہے اور جگہ جگہ آفاقی نوعیت کے موضوعات کی ترجمانی بھی ہے۔

حالی نے اپنی مثنویوں میں دنیاوی زندگی میں مذہب کی اہمیت و افادیت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ ان کی مثنویوں میں معاشرے میں زندگی کو بہتر بنانے کا احساس موجود ہے۔ ان میں اخلاقی اقدار کی اہمیت بھی نمایاں ہے۔ علمی اور تعلیمی معاملات کا تذکرہ بھی ہے۔

'برکھارت' میں حالی نے برسات کی مختلف کیفیات کا ذکر کیا ہے۔ مثنوی کی ابتدا برسات ہونے سے قبل گرمی کی جو شدت ہوتی ہے اس کی حالت کو بیان کیا گیا ہے اور گرمی سے متعلق تمام جزئیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس گرمی میں جانداروں کا تڑپنا، کہساروں کا تپنا، دریا کے پانی کا کھولنا، جنگل میں گرمی کی شدت، باغوں کی ویرانی، آندھیوں کی تندی، لو کی شعلہ سامانی، انسانوں کی بے چینی، شہر کی کیفیت، چھوٹے بچوں کی بے حالی، ان سب کی تصویر کشی حالی نے بڑی ہنرمندی سے کی ہے۔

اس مثنوی میں یہ تصویر کشی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اصل موضوع کے خدوخال کو ابھارنے میں ان کو خاصا دخل ہے۔ گرمی کے پس منظر کو بیان کیے بغیر برسات کی تصویر واضح نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لیے حالی نے اس مثنوی کے ابتدائی حصے میں گرمی کی کیفیت کا ذکر اس قدر تفصیل سے کیا ہے۔ چنانچہ اس میں واقعہ نگاری، منظر نگاری اور جزئیات نگاری کی خصوصیات پیدا ہوگئی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

گرمی سے تڑپ رہے تھے جان دار
اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
بھو بل سے سوا تھا ریگِ صحرا
اور کھول رہا تھا آبِ دریا
تھی لوٹ سی پڑ رہی چمن میں
اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں
سانڈے تھے بلوں میں منہ چھپائے
اور ہانپ رہے تھے چار پائے
تھیں لو مڑیاں زباں نکالے
اور لو سے ہرن ہوتے تھے کالے
چیتوں کو نہ تھی شکار کی سدھ
ہرنوں کو نہ تھی قطار کی سدھ
تھے شیر پڑے کچھار میں ست
گھڑیال تھے رودبار میں ست
ڈھوروں کا ہوا تھا حال پتلا
بیلوں نے دیا تھا ڈال کندھا
بھینسوں کے لہو نہ تھا بدن میں
اور دودھ نہ تھا گئو کے تھن میں
گھوڑوں کا چھٹا تھا گھاس دانہ
تھا پیاس کا ان پر تازیانہ [5]

درج بالا اشعار میں گرمی کی شدت میں جانوروں کی کیفیات کی جزئیات نگاری کے ساتھ ساتھ گہرے مشاہدے اور احساس کی شدت بھی نظر آتی ہے۔

'نشاط امید' کا موضوع 'برکھارت' سے مختلف ہے لیکن اس مثنوی میں بھی وہی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اس دور میں حالی کے فن میں نمایاں تھیں۔ اس کا موضوع بھی آفاقی نوعیت کا ہے۔ زندگی کی عام حقیقت اس مثنوی میں بھی نمایاں ہوتی ہے اور اسے پیش کرنے کے لیے حالی نے تاریخ، تہذیب و تمدن، مذہب اور معاشرے کا سہارا لیا ہے اور امید کی خوشی کی اہمیت کو اس طرح ذہن نشیں کرایا ہے کہ اس کے تاثر میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

مثنوی 'مناظرۂ رحم و انصاف' میں حالی نے رحم اور انصاف کے درمیان مناظرے کی منظر کشی کی ہے۔ رحم اپنی برتری ثابت کرتا ہے جبکہ انصاف اپنی بڑائی جتاتا

ہے۔لیکن عقل ان دونوں کو صحیح راستہ دکھاتی ہے، جس سے ان دونوں پر یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ان دونوں میں کوئی برتر نہیں۔دونوں ایک دوسرے کے لیے لازمی ہیں۔ دنیا کی بہتری کے لیے ان دونوں کا ایک ساتھ رہنا ضروری ہے۔مثنوی 'مناظرۂ رحم وانصاف' کا موضوع بظاہر خشک معلوم ہوتا ہے،لیکن ہماری عملی زندگی میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔حالی نے اس کی اہمیت وافادیت کو محسوس کیا اور اس کو ایک نئے انداز میں مثنوی میں پیرونے کی کوشش کی ہے۔ اس مثنوی میں قومی اور اصلاحی رجحان کارفرما نظر آتا ہے، جو حالی کا مطمح نظر تھا۔

مولانا حالی نے قومی مسائل پر جو مثنویاں لکھی ہیں ان میں عورتوں کے مسائل پر لکھی گئیں ان کی مثنویاں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ کیونکہ حالی نے عورتوں کے ان مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے جن کی طرف اردو شاعری میں اس سے پہلے کسی نے توجہ دلانے کی کوشش نہیں کی۔ حالی کی اس قبیل کی مثنویوں سے قبل اردو شاعری میں عورت کو صرف اور صرف محبوب کا مرتبہ حاصل تھا۔ وہ محض تعیش کا ایک ذریعہ تھی۔اس کی سماجی اور معاشرتی حیثیت کی طرف توجہ مبذول نہیں کی گئی تھی۔اردو شاعری میں سب سے پہلے حالی نے عورتوں کے مسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے دو شاہکار مثنویوں 'مناجات بیوہ' اور 'چپ کی داد' لکھیں۔

حالی اور آزاد کے علاوہ اسماعیل میرٹھی نے بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی مثنویاں بچوں کی تربیت کی غرض سے لکھیں۔ میرٹھی کی 'خدا کی تعریف'، 'اسلم کی بلی'، 'ہوا چلی'، 'برسات کا موسم'، 'ہماری گائے' وغیرہ اہم مثنویاں ہیں۔

شوق قدوائی نے جدید مثنوی کے موضوعات میں وسعت پیدا کی اور انھوں نے سائنس اور مذہب اور حسن جیسے علمی اور فلسفیانہ مسائل کو اپنی مثنویوں میں جگہ دی۔ان کی قابل ذکر مثنویاں 'بہار'، 'ہندوستان کی برسات'، 'عالم خیال' اور 'حسن' ہیں۔ اس کے علاوہ چکبست، سرور اور شاد نے ہندو عقائد اور تاریخ وغیرہ پر مثنویاں لکھیں۔

اقبال نے مثنوی کے مروجہ اصولوں میں اجتہاد کیا اور مثنوی کو اپنے افکار کے اظہار کے لیے آزادانہ استعمال کیا۔ اس طرح مثنوی موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق صورت اختیار کر گئی، جس میں ہر قسم کے خیالات کے اظہار کی وسعت پیدا ہوگئی۔فنی طور پر اس میں بحر اور قافیہ کی ترتیب بدل جاتی ہے۔'ایک پہاڑ اور گلہری'، 'عشق موت'، 'پنجاب کے دہقان'، 'رخصت اے بزم جہاں'، 'انسان اور بزم قدرت'، 'خفتگان خاک سے استفسار' وغیرہ اقبال کی اہم مثنویاں ہیں۔

نظم نگاری کی طرز پر الگ الگ موضوعات پر مثلاً تاریخی، سیاسی، اخلاقی، نصیحت آموز مثنویاں لکھی گئیں۔ جدید مثنویوں میں سادگی، صفائی اور واقعیت کو اہمیت حاصل ہوئی۔ اسی لیے موجودہ دور کی مثنویاں بہت پراثر اور جذبات سے بھری ہوئی ہیں۔ قیمتی اور وسیع ذخیرۂ الفاظ، نئے مضامین، نئی تشبیہات و تخیلات، نئے خیالات اور ان کے استعمال و اظہار کی نئی طرزیں سامنے آئیں۔

1857 کے بعد لکھی گئیں جدید مثنویوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان مثنویوں پر نظم نگاری کے اثرات براہ راست مرتب ہوئے ہیں۔ کیونکہ 1857 سے قبل لکھی گئیں مثنویوں کا موضوع تصوف، عشق وغیرہ پر مبنی ہے۔یعنی زیادہ تر مثنویوں میں داخلی جذبات واحساسات کی عکاسی کی گئی ہے۔ مافوق الفطرت کی فراوانی ہے۔ دیو، جن، بھوت، پریاں، جادوگر، جادو کے محل، سلیمانی ٹوپی وغیرہ جابجا نظر آتے ہیں۔ لیکن 1857 کے بعد جدید مثنوی نگاروں نے مثنوی کے روایتی مضامین سے انحراف کرتے ہوئے زندگی کے خارجی مسائل کی طرف توجہ مرکوز کی اور نظموں کی طرح مختصر مثنویاں لکھیں جن میں زندگی میں پیش آنے والے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

نظم نگاری کے زیر اثر لکھی گئیں جدید مثنویوں کی نمایاں خصوصیت تغزل یا عاشقانہ رنگ کا مفقود ہونا ہے۔ لفظی صناعی، مفروضات اور نرے تخیلات کی بجائے حقائق اور واقعات جدید شاعری کا موضوع بنتے ہیں۔ بیکار کے مبالغے، تشبیہات، بے مزہ لفاظی کو ترک کر دیا گیا۔ نیچرل مضامین کو موضوع بنایا گیا۔ مثال کے طور پر پہاڑوں کے خوبصورت مناظر، ندیوں کی روانی، برسات، جاڑے اور گرمی کی بہاریں جدید مثنویوں کا موضوع بنے جو قدیم شعرا کے یہاں بہت کم ملتے ہیں۔

جدید مثنویوں میں قومیت اور وطنیت کا احساس اور آزادی کی روح پائی جاتی ہے۔ اردو شاعری میں قومیت اور وطنیت کا یہ خیال مغربی ادب کی مرہون منت ہے۔انگریزی شاعری کے زیر اثر 1857 کے انقلاب کے بعد اردو شاعری بالخصوص اردو کی جدید مثنویوں میں قومیت اور وطنیت کے جذبات پیش کیے گئے۔

جدید مثنویوں میں کائنات کے رازوں اور فطرت کے حقائق پیش کیے گئے۔ بہت سی مثنویاں مناظر، وقت اور موسم کی کیفیتوں پر لکھی گئیں۔ جبکہ قدیم مثنویوں میں منظر نگاری کے نمونے نسبتاً کم ملتے ہیں یا بہت مختصر اور غیر مسلسل ہیں۔اردو کی قدیم مثنویوں میں پند واخلاق تو پائے جاتے ہیں مگر یہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے ملتے ہیں جبکہ جدید مثنویوں میں اخلاق اور موعظت کو خاص مرتبہ حاصل ہے۔اس کے ساتھ تاریخی موضوعات پر بھی مثنویاں لکھی گئیں۔

مختصر یہ ہے کہ نظم نگاری کی طرز پر الگ الگ موضوعات پر مثلاً تاریخی، سیاسی، اخلاقی، نصیحت آموز مثنویوں لکھی گئیں۔ جدید مثنویوں میں سادگی، صفائی اور واقعیت کو اہمیت حاصل ہوئی۔اسی لیے موجودہ دور کی مثنویاں بہت پراثر اور جذبات سے بھری ہوئی ہیں۔قیمتی اور وسیع ذخیرۂ الفاظ، نئے مضامین، نئی تشبیہات وتخیلات، نئے خیالات اور ان کے استعمال واظہار کی نئی طرزیں سامنے آئیں۔

حواشی

1 محمد حسین آزاد، 'نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات'، مشمولہ نظم آزاد، ص4، 1926، مطبع کریمی

2 ایضاً، ص3

3 محمد حسین آزاد، مثنوی شب قدر، مشمولہ نظم آزاد، ص19، 1926، مطبع کریمی

4 الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر وشاعری، 203، 1995، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

5 الطاف حسین حالی، برکھا رت، مشمولہ مثنویات حالی، ص109، 1966، شیخ مبارک علی ناشر وتاجر کتب،

Tasneem Qamar
Research Scholar, Department of Urdu
Banaras Hindu University
Varanasi-110043 (U.P)
Email: qamartq1595@gmail.com

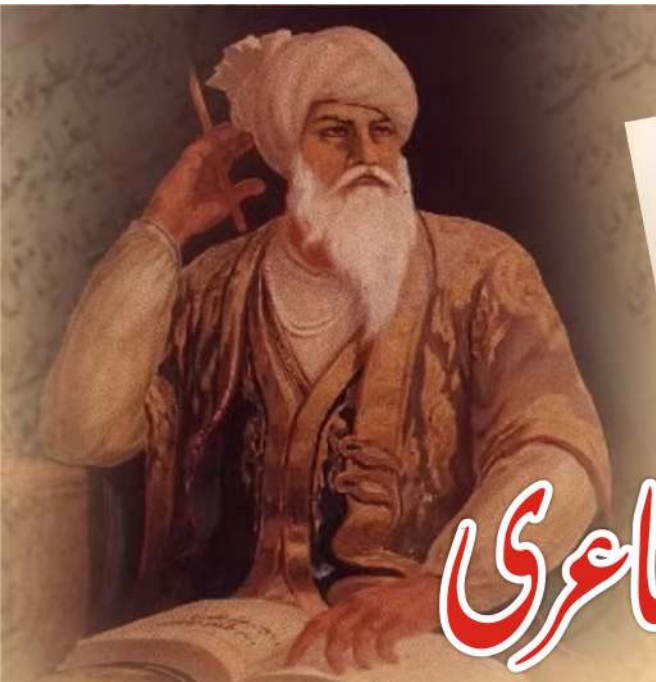

امیر عباس خان

نند لعل گویا کی فارسی شاعری

اور متقدمین شعرا

سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے ممتاز عالم، مفکر، ادیب، انشا پرداز اور صوفی شاعر منشی نند لعل متخلص بہ گویا 1633 میں پیدا ہوئے۔ عہد شاہجہانی میں ان کے والد منشی چھجومل کھتری معروف بہ چھجورام تلاش روزگار میں پنجاب سے دہلی پہنچے اور شاہی دارالانشا میں ملازم ہوگئے۔ سنسکرت اور ہندی زبان کے ساتھ علوم اسلامی، عربی اور فارسی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ یہاں ان کی ملاقات داراشکوہ سے ہوئی۔ شہزادہ ہندو علما و پنڈت کا پہلے سے قدردان اور دلدادہ تھا۔ لہٰذا منشی چھجومل کی علمی لیاقت اور ایمانداری نے شہزادہ داراشکوہ کے دل میں اس قدر گھر کر لیا کہ جب بادشاہ شاہجہاں نے 1639 میں اسے قندھار کی پہلی مہم پر روانہ کیا تو منشی چھجومل کو بطور میر منشی اپنے ساتھ غزنی لے گیا اور وہاں پہنچ کر دیوانی کے عہدے پر فائز کر دیا۔ وہ غزنی میں سکونت پذیر رہ کر اپنا فرض منصبی انجام دیتے رہے۔ دیوان چھجورام درویشانہ مزاج کے حامل تھے۔ اس لیے نند لعل کی تربیت بھی اسی طرز پر انجام پائی۔ فارسی کے عالم ہونے کے سبب گویا کو بھی فارسی زبان کی تعلیم دی۔ 19 سال کی عمر میں یعنی 1652 میں گویا کے والدین بھی اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ والدین کے انتقال کے بعد خاطر خواہ منصب نہ ملنے کے سبب گویا دل برداشتہ ہوگئے۔ غزنی چھوڑ کر مع اہل وعیال ملتان آ گئے۔ یہاں کے حاکم نواب وصاف خان نے گویا کی علمی لیاقت سے متاثر ہو کر میر منشی کے عہدے سے نائب صوبہ دار مقرر کر دیا۔ مگر عہد عالم گیر میں کسی سبب سے ان کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ چنانچہ کچھ عرصہ خلوت نشین رہ کر گویا نے دینی کتابوں کا مطالعہ کیا جس سے ان کی زندگی میں ایک اہم تبدیلی آئی اور انھیں سکھ مذہب اور آخری گرو گوبند سنگھ سے والہانہ عقیدت ہوگئی۔ وہ دیدار مرشد کے لیے ملتان سے آنند پور (پنجاب) آ گئے اور مرشد کے قدموں میں رہنے لگے۔ قلب وجگر کو اتنی راحت ملی کہ مرشد کے عاشق ہوگئے۔ بیساختہ کہہ اٹھے۔

به هوش باش که هنگام نو بهار آمد
بهار آمد و یارآمد قرار آمد

''ہوش میں آ کہ موسم بہار آ گیا۔ بہار آئی، محبوب آیا اور دل مضطر کو قرار آ گیا۔''

گویا نے تقریبا نو یا دس یادگار تصانیف چھوڑی ہیں۔ ان میں تین پنجابی اور باقی فارسی زبان میں ہیں: مثنوی زندگی نامہ، غزلیات یا دیوان گویا، توصیف وثنا، گنج نامہ، جوت بکاس (فارسی و پنجابی)، دستورالانشا، عرض الالفاظ، رہت نامہ یا تنخواہ نامہ۔ نند لعل کی تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام کتابیں آنند پور میں گرو گوبند سنگھ اور سکھ مذہب کے زیر اثر لکھی گئی ہیں جس میں گرو بھکتی، عقیدت مرشد اور عشق حقیقی کا رنگ غالب ہے۔

بعض ایام وہ آگرہ میں شہزادۂ معظم بہادر شاہ کے میر منشی بھی رہے۔ دوران ملازمت اپنے فرائض اس خوبی سے انجام دیے کہ شہزادہ ان کی دانشمندی اور علمی صلاحیت کا دلدادہ ہوگیا۔ ایک دن بادشاہ اورنگ زیب نے اپنے دربار میں علما وفضلا سے قرآن مجید کی کسی آیت کی تشریح طلب کی۔ حاضرین علما نے اپنے اپنے خیال ظاہر کیے۔ مگر بادشاہ کو ان سے تشفی نہ ہوئی۔ شہزادہ معظم بھی وہاں موجود تھے۔ دربار سے واپس آ کر یہ روداد اپنے میر منشی نند لعل کو سنائی۔ انھوں نے اس آیت کی فوراً ایسی تشریح کر ڈالی کہ شہزادہ دنگ رہ گیا۔ اگلے دن شہزادہ اپنے والد اورنگ زیب سے اسی آیت کا ذکر کرتے ہوئے تشریح کر دی۔ بادشاہ حیران رہ گیا اور کہنے لگا ہاں! یہ تشریح درست ہے۔ مگر یہ تمھاری فکر کا نتیجہ نہیں ہے۔ معظم نے بتا دیا کہ یہ تشریح میری نہیں ہے بلکہ میرے میر منشی کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ دوسرے دن بادشاہ نے دربار میں انھیں بلا کر انعام واکرام سے نوازا، اور خوش ہوا۔ اس سے نند لعل کی قرآن فہمی اور اسلامی معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔ مگر مرشد کی جدائی نے انھیں زیادہ دیر تک شاہی دربار میں رہنے نہ دیا۔ بالآخر آنند پور چلے آئے۔ جیسا کہ اس شعر سے ان کی فرقت کا پتہ چلتا ہے۔

دل من در فراق یار بسوخت
جان من بہر آن نگار بسوخت

''میرا دل محبوب کی جدائی میں بھنک کر رہ گیا۔ میری جان بھی اس کے سوز الفت میں سوخت ہوگئی ہے۔''

اور زمانہ تعلیم سے اس فن میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ مرشد کے دربار میں جہاں پنجابی اور فارسی زبان کے شاعروں کا ہجوم تھا۔ ان کا ذوق سخن چمک اٹھا اور ان کا کلام عقیدت مرشد اور عشق الٰہی کی آنچ میں تپ کر قلب وجگر کو گرمانے اور روح کو تڑپانے لگا۔ مرشد کو ان کے حقیقت و معرفت میں ڈوبے ہوئے اشعار بہت پسند آئے۔ لہٰذا انھیں اپنے دربار میں دیوانی کے عہدے پر فائز کرنا چاہا مگر نند لعل نے یہ التجا کی کہ انھیں اس منصب جلیلہ کے بجائے لنگر بانٹنے کے کام پر مقرر کیا جائے۔

گویا 1704 تک اپنے مرشد کے دربار آنند پور میں مقیم رہ کر ان کے لطف و عنایات سے فیضیاب ہوتے رہے۔ جب اہل وعیال کی یاد آنے لگی تو مرشد سے اجازت لے کر عازم ملتان ہو گئے۔ وقت رخصت ملتان سفر کے اشارات اس طرح نظم کیے۔

بہر کجا کہ روی جان من خدا حافظ
ببردۂ دل وایمان من خدا حافظ

''میری جان تو جہاں بھی جا رہا ہو میں تجھے خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ تو نے میرے دل اور ایمان کو لوٹ لیا اچھا خدا حافظ۔''

گویا اپنی زندگی کے آخری ایام ملتان میں ریاضت و مطالعہ اور خدمت خلق میں صرف کیے اور وہیں 1723 میں انتقال کر گئے۔

نند لعل کے اس مختصر احوال وکوائف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ گویا ایک صاحب علم ودانش، معزز رکن حکومت، معتمد مشیر سلطنت اور ایک مدبر اہل سیاست تھے۔ جنھوں نے تقریباً تیس برس مغل حکومت میں ملازمت کی۔ ان کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ ایک صاحب دل صوفی شاعر تھے اور اسی حیثیت سے آج بھی ان کے عقیدت مند انھیں محبت سے یاد کرتے ہیں۔

اُس وقت ہندوستان میں بھکتی اور تصوف کی فضا جو سارے ملک پر چھائی ہوئی تھی۔ باطنی طرز کی شاعری کے لیے سازگار تھی۔ نند لعل سے قبل اور ان کے زمانہ میں بہت سے ہندو اور مسلمان سخنور سلوک ومعرفت کے مضامین کو شعر کے حسین قالب میں ڈھال چکے تھے۔ اس لیے گویا کا جن کے دل میں اپنے مرشد کے فیضان سے عشق الٰہی کا جذبہ بیدار ہو گیا تھا۔ اس طرح شاعری کا اختیار کرنا کوئی ایسی غیر معمولی بات نہ تھی۔ خاص کر ان کے کلام میں غزلوں کی اہمیت کا راز یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کے میدان میں عام صوفی شاعروں کی طرح روایتی اور گھسی پٹی روش نہیں اختیار کی بلکہ ایک جدید اور نرالی راہ اختیار کی۔ وہ اوروں کی طرح ہجر معشوق کے درد و الم، مایوسی اور محرومی کا رنگ نہیں چھیڑتے بلکہ وصل محبوب کے کیف وسرور، عیش وعشرت اور کامرانی کا نغمہ سناتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اپنا مسلک باطنیت کے روایتی طریقوں سے جدا اور ایک منفرد شان رکھتا ہے۔

نند لعل کے اس مختصر احوال وکوائف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ گویا ایک صاحب علم ودانش، معزز رکن حکومت، معتمد مشیر سلطنت اور ایک مدبر اہل سیاست تھے۔ جنھوں نے تقریباً تیس برس مغل حکومت میں ملازمت کی۔ ان کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ ایک صاحب دل صوفی شاعر تھے اور اسی حیثیت سے آج بھی ان کے عقیدت مند انھیں محبت سے یاد کرتے ہیں۔

اس پس منظر میں گویا کی شاعری پر نظر ڈالیں تو اس میں ایک نرالی شان نظر آتی ہے جو اسے تصوف کے شاعروں کے کلام سے ممتاز کرتی ہے۔ اس کا موضوع تو وہی عشق حقیقی ہے جو اور صوفی شاعروں کا ہے، لیکن اس کا لہجہ اور مزاج بالکل الگ ہے۔ صوفی شاعروں کا کلام حزن ویاس، ترک دنیا، وصل محبوب اور معرفت الٰہی حاصل کرنے کی تعلیم دیتا ہے، مگر گویا یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ایک سچا طالب معرفت اسی دنیا میں وصل محبوب کی لذت وحقیقت کا عرفان حاصل کر سکتا ہے۔

گویا کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر روحانی سعادتوں ومسرتوں کی ترنگ میں سرشار اور باطنی کیف وسرور کے نشہ میں سرمست ہے۔ اس کا بہترین نمونہ گویا کی تیسری غزل جو حافظ کی ہم ردیف غزل ہے۔ یوں بھی اگر ان کی ساری غزلوں کو بغور پڑھیں تو تھوڑے سے قطع نظر کے ساتھ جن میں عام صوفی شاعروں کی قنوطیت اور المیت کی رسمی تقلید نظر آتی ہے۔ جیسے حافظ کی پہلی غزل، أَلا يَا أَيُّها السَّاقي! أدر كَاساً و ناوِلها، کے رنگ میں نند لعل کی غزل دیکھی جا سکتی ہے۔

بدہ ساقی مرا یک جام زان رنگینی دل ہا
بچشم پاک بین آسان کنم من جملہ مشکل ہا
مرا در منزل جانان ہمہ عیش وہمہ شادی
جرس بیہودہ می نالد کجا بندیم محفل ہا
خدا حاضر بود دائم ببین دیدار پاکش را
نہ گردابی درو حائل نہ دریاوساحل ہا
چرا بیہودہ میگردی بصحرا و بدشت ای دل!
چوآن سلطان خوبان کردہ اندر دیدہ منزل ہا
چوغیراز ذات پاکش نیست در ہر جا کہ می بینم
بگو گویا کجا بہ گذارم این دنیا و اہل ہا

''اے ساقی! مجھے اس شراب کا ایک جام پلا دے۔ جو دل کو معرفت کے رنگ میں رنگ دے تا کہ میں اپنی پاک بین آنکھوں سے ان ساری مشکلوں کو حل کر دوں۔ 2۔ محبوب کے گھر میرے لیے عیش ہی عیش اور مسرت ہی مسرت ہے۔ یہ قافلہ کا گھنٹہ بے کار شور مچاتا ہے۔ بھلا میں کہاں سفر کے لیے محمل باندھنے والا ہوں۔ 3 خدا ہمیشہ ہماری نظر کے سامنے موجود ہے۔ اس کے پاک دیدار کی راہ میں نہ کوئی بھنور حائل ہے نہ دریا نہ ساحل۔ 4 اے دل! آخر تو کیوں بیکار دشت وصحرا میں مارا مارا پھرتا ہے۔ جب وہ حسینوں کا حسین تیری آنکھوں میں بسا ہوا ہے۔ 5 جب یہ صورت ہے کہ جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہوں اس کی ذات پاک کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ تو اے گویا تو ہی بتا کہ اس دنیا کو کیسے چھوڑ دوں۔''

اس ردیف میں صائب تبریزی، عرفی شیرازی اور بیدل عظیم آبادی کے علاوہ بیشتر قادر الکلام شعرا نے سخن سرائی کی ہے۔ غزلوں میں گویا نے سعدی، امیر خسرو اور زیادہ تر خواجہ حافظ کی پیروی کی ہے اگر چہ بحور اور قوافی مختلف ہیں۔ تاہم بسوخت، باش، الغیاث،

شوی، عمر، فراق اور نرسد وغیرہ ردایف میں انکی غزلیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

جیسے ایک جگہ تزکیہ نفس کے متعلق گویا کہتے ہیں۔

دایما دل را بہ سو ی حق بیار
تا بہ آسان بگذری زین پل صراط

''ہمیشہ دل کو خدا کی جانب متوجہ رکھ۔ تا کہ تو زندگی کے پل صراط سے آسانی سے گذر جائے۔''

تصفیہ قلب، یعنی دل کو صاف کرنا چاہیے تا کہ معرفت حق حاصل ہو۔ گویا کہتے ہیں۔

گرزراہ شوق سازی سینہ صاف
زود بینی خویش را بی گراف

''اگر تو محبوب کے شوق میں اپنے سینے کو آلائشوں سے پاک کرلے۔ تو بہت جلد اپنے نفس کا محرم بن جائے گا۔ یہ حقیقت ہے فضول بات نہیں۔''

بیان عشق جس کی سرشت میں عشق ہے۔ وہ خود بخود خاموشی سے فدائے حق ہے۔ البتہ خام فریاد اور نالہ سے کام رکھتے ہیں۔ گویا کہتے ہیں۔

پروانہ وار گرد رخ شمع جان دہیم
چون عندلیب بیہودہ غوغا نمی کنیم

''پروانہ کی طرح میں شمع کے گرد پھر کر جان دے دیتا ہوں۔ بلبل کی طرح فضول شور نہیں مچاتا۔''

حافظ کہتے ہیں۔

آتش آن نیست کہ بر شعلہ اوخندد شمع
آتش آن ہست کہ بہر خرمن پروانہ زدند

''آگ وہ نہیں ہے جس کے شعلہ پر شمع مسکرائے۔ بلکہ آگ وہ ہے۔ جو انھوں نے پروانہ کے کھلیان میں لگادی۔''

بیان بادہ عشق و معرفت اور ساقی کی لیے گویا کہتے ہیں۔

بیار آن شراب چو آب حیات
کہ باید ز بویش دل ازغم نجات

''اے ساقی! لا اس آب حیات کی شراب کو کہ جس کی خوشبو سے دل کو غم سے نجات ملتی ہے۔''

ملامت غفلت پر گویا کہتے ہیں۔

وای بر نفسی کہ بیہودہ گذشت
الغیاث از غفلت ما الغیاث

''(افسوس ان لمحوں پر جو بیکار گزرے۔ خدا کی پناہ! ہماری غفلت سے خدا کی پناہ!''

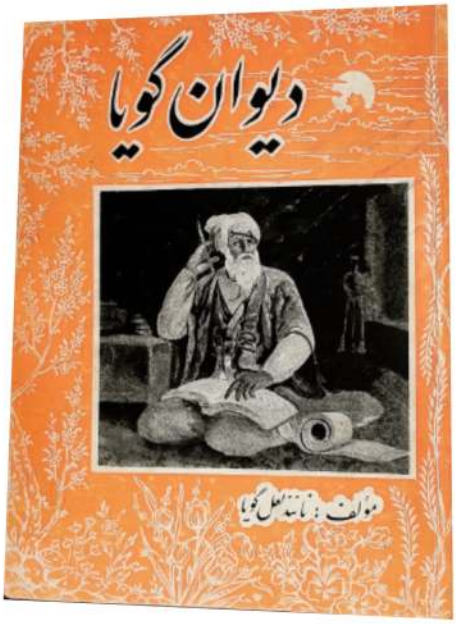

سعدی کہتے ہیں۔

ای! کہ پنجاہ رفت در خوابی
مگر این پنج روزہ در یابی

''اے دوست! اگر تمھارے پچاس دن خواب و غفلت میں گزر گئے ہیں۔ تم ان گزرے ہوئے ایام کا محاسبہ کرکے ان پانچ دنوں میں حاصل کرسکتے ہو۔''

ذکر خدا کی تفسیر و توقیر گویا بیان کرتے ہیں۔

غیر یاد خدا دمی کہ گذشت
این زوال است پیش اہل کمال

''خدا کی یاد کے سوا کسی اور شغل میں جو دم بھی گزرے۔ وہ کاملوں کے نزدیک زوال کی نشانی ہے۔''

عطار کہتے ہیں۔

زندہ دار از ذکر صبح وشام را
در تغافل مگذران ایام را

''صبح وشام خدا کے ذکر سے خود کو زندہ رکھ، اور ایام کو خواب وغفلت میں نہ گذار۔''

بیخودی در محبت الٰہی، فنافی العشق میں گویا کہتے ہیں۔

ما بندہ عشقیم خدا را نشناسیم
دشنام ندادیم دعا را نشناسیم

''میں تو عشق کا بندہ ہوں۔ خدا کو نہیں پہچانتا؟ مجھے نہیں معلوم گالی کیا اور دعا کسے کہتے ہیں؟''

خسرو کہتے ہیں۔

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آری آری میکنم با خلق عالم کار نیست

''خلق کہتی ہے کہ خسرو بت پرستی کرتا ہے۔ ہاں ہاں، میں کرتا ہوں مجھے خلق سے کوئی کام نہیں۔''

گویا کہتے ہیں۔

بیمار نرگسیم کہ نرگس غلام اوست
ما آرزوے خضر و مسیحا نمی کنیم

''میں اس نرگس چشم کا بیمار ہوں۔ جس کی غلامی پر نرگس کو فخر ہے۔ مجھے یہ آرزو نہیں کہ خضر اور مسیحا مجھے اچھا کریں۔''

خسرو کہتے ہیں۔

از سر بالین من برخیز ای نادان طبیب!
دردمند عشق را دارو بجز دیدار نیست

''اے! نادان طبیب میرے سرہانے سے اٹھ جا کہ عشق کے بیمار کے لیے دیدار یار کے علاوہ اور کوئی دوا نہیں ہے۔''

ضرورت مرشد پر گویا کہتے ہیں۔

ہمیشہ صحبت مردان حق طلب گویا
کہ طالبان خدا واصلان اللہ اند

''گویا ہمیشہ سچے مرشد کی صحبت اختیار کر کہ طالبان خدا اللہ سے منسلک ہیں۔''

حافظ کہتے ہیں۔

حافظ کیمائیست عجب بندگی پیر مغان
خاک او گشتم وچندین در جاتم دادند

''پیر مغان کی غلامی عجیب کیمیا ہے۔ میں اس کی خاک بنا اور انھوں نے مجھے اس قدر درجہ دے دیے۔''

اس شعر سے گویا کے کلام کی شیرینی اور حب الوطنی ظاہر ہوتی ہے۔

لذتی گویا نباشد بہ از آن
ہمچو شعری تو بہ ہندوستان لذیذ

''گویا اس سے بڑھ کر کوئی لذت نہیں ہوسکتی جیسی تیرے شعر سے لوگوں کو ہندوستان میں حاصل ہوتی ہے۔''

جہاں گویا نے متقدمین شعرا کی پیروی میں غزلیں کہیں وہیں وہ رباعیات میں خیام نیشاپوری سے سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں:۔ مثلاً

گویا تا کی این سرای معلوم؟
گاہی لازم شوی وگاہی ملزوم
تا کی چون سگان بر استخوان جنگ کنی؟
دنیا معلوم اہل دنیا معلوم؟

''گویا اس دنیا کے متعلق کس کو معلوم ہے؟ کبھی

یہ آپ کے لیے ضروری ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی۔ اس د نیا کے لیے کتے کے مانند کون ہڈی پر لڑے، دنیا بھی معلوم ہے اور اہل دنیا بھی۔''

خیام کہتے ہیں۔

دنیا دیدی وہرچہ دیدی ہیچ است
وآن نیز کہ گفتی وشنیدی ہیچ است
سرتاسر آفاق دویدی ہیچ است
وآن ہر کہ در خانہ خزیدی ہیچ است

''تم نے دنیا دیکھی اور جو کچھ دیکھا وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اور جو تم نے کہا اور سنا وہ کچھ بھی نہیں۔ آپ افق تک بھاگ گئے یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ (اور جو کچھ گھر میں سمٹ کر رہے وہ بھی کچھ نہیں)۔''

گویا نے مثنوی میں مولانا جلال الدین رومی کی پیروی کی ہے۔ مثلاً مثنوی زندگی نامہ کا رنگ، انداز اور بحر و وزن مولوی کی مثنوی سے ملتا ہے۔ جیسا کہ گویا کہتے ہیں۔

گر حضور باخدا باید بتو
در حضور مرشد کامل برو

''گر تو خدا کی قربت چاہتا ہے۔ تو مرشد کامل کی صحبت میں چلا جا۔''

مولانا کہتے ہیں۔

ہر کہ خواہد ہم نشین باخدا
او نشیند در حضور اولیا

''جو بھی خدا کی ہم نشینی چاہتا ہے اس کو کہو کہ اولیا کے حضور بیٹھا کرے) غرض مرید، مرشد کامل کے بغیر خدا تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔''

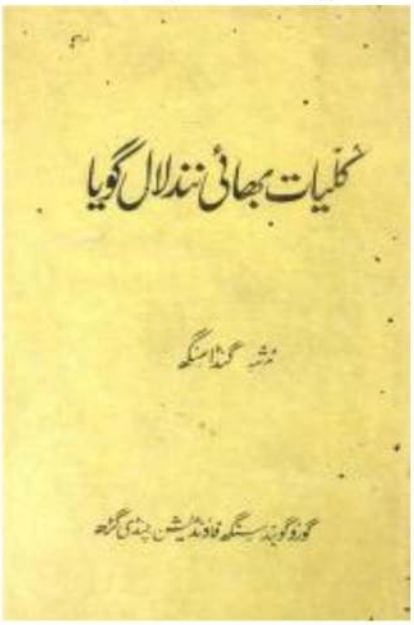

نند لعل گویا کی غزلیں اس علمی اور ادبی ہم رنگی اور روحانی ہم آہنگی کی ایک روشن مثال ہیں۔ جو عہد وسطی کی ہندوستانی تہذیب کا طرہ امتیاز ہے۔ نہ صرف ان کی غزلوں کی زبان ہندوستانی ہے۔ بلکہ اس کی بندش، طرزادا، تشبیہ واستعارات، تلمیحات، غرض ساری ہیئت وہی ہے جو اس عہد کے ہندو مسلم شعرا کا مشترک سرمایہ تھی۔ اور موضوع کلام بھی وہی جو ان کے ہم عصر ہندو اور مسلمان شاعروں کی غزلوں کا تھا۔ یعنی عشق حقیقی کی واردات و کیفیات، بیخودی در محبت مولا، فنافی العشق، بادہ عشق و معرفت اور ساقی، گرو بھکتی، جام ومینا، ضرورت مرشد کامل، تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب، مگر اس فرق کے ساتھ کہ ان کے یہاں سرور، محبت اور نشاط روح کی ایک جان فزا لے ہے۔ جو دوسروں کو نصیب نہیں ہوئی۔ ان کا کلام عشق الٰہی، محبت مرشد اور حب الوطنی کے جذبہ اور صوفیانہ کیف وسرور سے بھرا ہوا ہے۔

شاعری عطار، سعدی کی طرح اخلاقی ہے۔ کلام ناصحانہ اور تلسی داس کی طرح محبت وعقیدت سے لبریز ہے۔ غزلیات، حافظ کی طرح عارفانہ اور مستانہ اور نظمیں، سنائی کی طرح حکیمانہ ہیں۔ مثنوی، فردوسی، نظامی اور مولانا کی طرح قدرتی اور الہامی روانی رکھتی ہے۔ اور غزل، سعدی، خسرو اور حافظ کے مماثل ہے۔ غرض ہندوستان کے فارسی شعرا میں ان کا درجہ مسلم ہے۔

مختصر یہ کہ نندلعل گویا کی غزلیں اس علمی اور ادبی ہم رنگی اور روحانی ہم آہنگی کی ایک روشن مثال ہیں۔ جو عہد وسطی کی ہندوستانی تہذیب کا طرہ امتیاز ہے۔ نہ صرف ان کی غزلوں کی زبان ہندوستانی ہے۔ بلکہ اس کی بندش، طرزادا، تشبیہ واستعارات، تلمیحات، غرض ساری ہیئت وہی ہے جو اس عہد کے ہندو مسلم شعرا کا مشترک سرمایہ تھی۔ اور موضوع کلام بھی وہی جو ان کے ہم عصر ہندو اور مسلمان شاعروں کی غزلوں کا تھا۔ یعنی عشق حقیقی کی واردات و کیفیات، بیخودی در محبت مولا، فنافی العشق، بادہ عشق ومعرفت اور ساقی، گرو بھکتی، جام ومینا، ضرورت مرشد کامل، تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب، مگر اس فرق کے ساتھ کہ ان کے یہاں سرور، محبت اور نشاط روح کی ایک جان فزا لے ہے۔ جو دوسروں کو نصیب نہیں ہوئی۔ ان کا کلام عشق الٰہی، محبت مرشد اور حب الوطنی کے جذبہ اور صوفیانہ کیف وسرور سے بھرا ہوا ہے۔

مآخذ

1 سجاد حسین قاضی، دیوان حافظ، اردو بازار، لاہور، ص 149
2 سنگھ گنڈا، کلیات بھائی نندلعل گویا، گرو گوبند سنگھ فاونڈیشن، چنڈی گڑھ 1963۔ ص 10,11,17,20
3 سید عابد حسین ڈاکٹر، غزلیات بھائی نندلعل گویا، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی 1973 ص، 14، 15، 16، 19، 20،21
4 گویا نندلعل، دیوان گویا، کتابخانہ موسسہ پژوہش ومطالعات فرہنگی، تہران۔ 1365۔ ص مختصری در بارہ گویا
5 گیانی مہان سنگھ، تصنیفات گویا، خالصہ ٹریکٹ سوسائٹی، امرتسر، 1963، ص 2,7,8

Dr. Ameer Abbas khan (Aamir)
71-B,Okhla, Near Chapparwali Masjid, Jamia Nagar, New Delhi-110025
Mob: 9793214180
Email: abbasamee59@gmail.com

محمد حنیف خان

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی تنقیدی بصیرت

اردو تنقید زبان و ادب کا ایک اہم اور وقیع سرمایہ ہے جس کا دائرہ شاعری سے لے کر افسانوی اور غیر افسانوی ادب تک پھیلا ہوا ہے۔ تنقیدی ادب کے اس بحر ز خار کی بنیاد شاعری کی تنقید ہے۔ دوسری اصناف سخن کے مقابلے آج بھی شاعری کی تنقید نہ صرف کمیت میں زیادہ ہے بلکہ کیفیت میں بھی بالا و برتر ہے، جس کا سبب شاعری کی تخلیق کا طویل دورانیہ اور اس کی تفہیم کی علمی کوششیں ہیں۔ 'تنقید' کی اصطلاح جدید ہے جس کے توسط سے صدف و خزف کے مابین تمیز کی جاتی ہے البتہ غیر اصطلاحی سطح پر اس کی کوششیں میر تقی میر کے 'نکات الشعرا' سے شروع ہوگئی تھیں۔ اس کے بالمقابل اردو میں افسانوی اور غیر افسانوی ادب کی تخلیق پر محض ڈیڑھ سو برس کا عرصہ گذرا ہے جب کہ اس کی تنقید اس سے بھی زیادہ کم عمر ہے۔ اردو میں تحریکات سے ماقبل مشرقی معیار نقد کے مطابق شاعری کی تنقید ہوتی رہی ہے جس کی ایک طویل روایت ہے، لیکن اس کے بعد اردو تنقید نے سائنسی اور بین العلومی رخ اختیار کیا۔ جس کی وجہ سے سیاسی، سماجی، تاریخی اور نفسیاتی تناظرات میں ادب کی تعبیر و تشریح کا رواج عام ہوا۔ موجودہ تنقید کا آغاز اردو میں تذکرہ نگاری سے ہوا، جو میر تقی میر کے تذکرہ 'نکات الشعرا' (تسوید 1165ھ) اور فتح علی گردیزی کے 'تذکرہ ریختہ گویان' (تکمیل 1165) سے شروع ہوا۔ تقدم زمانی کے لحاظ سے اختلافات ہیں البتہ بقول پروفیسر محمود الٰہی ''ان دونوں تذکروں کے ضمن میں تقدم زمانی کی بحث کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ اہمیت ہے اس طرز فکر کی جس کے عمل اور رد عمل کے یہ دونوں تذکرے مظاہر ہیں۔''

اردو تذکروں کی ایک مضبوط روایت ہے۔ نکات الشعرا، مخزن نکات، تذکرہ ریختہ گویان، چمنستان شعرا، تذکرہ ہندی، ریاض الفصحا، عیار الشعرا، عمدہ منتخبہ، مجموعہ نغز، گلشن بے خار، آب حیات اور گل رعنا وغیرہ اہم تذکرے ہیں۔ عام طور پر یہ تذکرے اس لیے ترتیب دیے گئے تا کہ شعرا سے متعلق اہم معلومات اور ان کا کلام دست برد زمانہ سے محفوظ ہو جائے۔ ان تذکروں کا صرف یہی ایک سبب نہیں ہے، بہت سے تذکرے اس لیے بھی وجود میں آئے تا کہ شعرا کو ان کا جائز مقام دلایا جا سکے۔ ان تذکروں میں شعرا کے کلام کے انتخاب کے لیے کوئی مسلمہ اصول نہیں تھا وہ خالص تذکرہ نگاروں کے ذوق پر منحصر تھا، جس کی آبیاری مشرقی معیار نقد نے کی تھی۔

تذکرہ نگاری کا تعلق تاریخ سے ہے، جس کا آغاز عربی سے ہوا اور فارسی کے توسط سے اردو میں آیا۔ اردو شاعروں کے ابتدائی تذکرے فارسی میں ہی لکھے گئے، جن میں انہی اصول و ضوابط کی پابندی کی گئی جن کے مطابق فارسی تذکرے لکھے گئے تھے، یہ تتبع واضح کرتا ہے کہ اردو شاعروں کے فارسی تذکرہ نگاروں نے اس کے لیے الگ سے اصول نہیں وضع کیے، انھوں نے احوال جمع کرنے، درجہ بندی اور شعروں کے انتخاب میں فارسی تذکرہ نگاری میں مستعمل اصولوں کو ہی اپنا معیار بنایا۔ اسی طرح شعرا کے کلام پر تبصروں میں بھی عربی و فارسی معیار نقد کو ہی ملحوظ خاطر رکھا جس میں عروض، بیان و بدیع اور علم معانی کو اولیت حاصل تھی۔ اسی لیے جب اردو شاعروں کے تذکروں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہاں انہی چاروں کے ارد گرد تبصرے نظر آتے ہیں۔ مروجہ تنقید چونکہ ماضی قریب کی زائیدہ ہے اس لیے تذکروں میں اس معیار کی تنقید کی تلاش کار عبث ہے البتہ اردو تنقید کے حوالے سے مشرقی شعریات کے ماخذ کے طور پر ان کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔

متذکرہ تذکروں میں اپنے حسن انتخاب اور رائے کی صلابت کی وجہ سے 'گلشن بے خار' حد درجہ اہمیت کا حامل تذکرہ ہے۔ شیفتہ نے اس میں اپنی تنقیدی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو آرا شعرا کے بارے میں دی ہیں وہ بہت اہم ہیں۔ ان میں اردو شاعری کی تنقیدی بنیادیں نظر آتی ہیں۔ اردو تذکرہ نگاری میں اپنی نپی تلی رائے کی وجہ سے نواب مصطفے خاں شیفتہ کی اہمیت آج بھی مسلم ہے بلکہ اگر محمد حسین آزاد سے قبل انھیں پہلا تذکرہ نگار نقاد تسلیم کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ شیفتہ کو شاعری سے زیادہ ان کی سخن فہمی اور اس کی بنیاد پر ظاہر کی گئی رائے نے انھیں ادبی تاریخ میں اعلیٰ مقام دلایا ہے۔

نواب مصطفے خاں شیفتہ (1806-1869) انیسویں صدی کے متبحر عالم و شاعر تھے۔ غالب کے ایسے شاگرد تھے جن پر انھیں ناز تھا۔ شیفتہ کی سخن فہمی، نکتہ رسی اور معقولات و منقولات کے علم نے انھیں ایک مسلم الثبوت استاد کا درجہ دیا تھا۔ ان کے والد عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضی خاں بہادر مظفر جنگ بنگش تھے، جن کا آبائی تعلق کوہاٹ صوبہ سرحد سے تھا۔ ان کے دادا ولی دادخاں فرخ سیر کے عہد میں یہاں آئے اور فرخ آباد میں مقیم ہوئے۔ شیفتہ کی تعلیم و تربیت اس وقت کی علمی و روحانی شخصیات کی زیر نگرانی ہوئی جن میں حاجی نور محمد دہلوی نقشبندی، شیخ عبد اللہ سراج حنفی اور شیخ محمد عابد سندھی کے نام اہم ہیں۔ وہ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی

کے نواسے شاہ محمد اسحٰق محدث سے بیعت بھی تھے، ان کے انتقال کے بعد غلام علی نقشبندی خلیفہ مرزا مظہر جان جاناں کے دونوں خلفا شاہ ابوسعید اور شاہ احمد سعید سے تعلق قائم کیا اور فیوض باطنی سے بہرہ مند ہوئے۔

شیفتہ اور غالب کے مابین بہت گہرے تعلقات تھے، وہ استاد و شاگرد بھی تھے اور ندیم بھی، جن کی رائے کا غالب بہت احترام کرتے تھے، ان کی سخن سنجی کے حد درجہ معترف تھے۔ شیفتہ سے متعلق غالب نے کہا تھا۔

غالب بفن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
نوشت در دیوان غزل، تا مصطفے خاں خوش نہ کرد

ان کی مضمون آفرینی کی داد یوں دی ہے۔

غالب ز حسرتی چہ سرایم کہ در غزل
چوں او تلاش معنی و مضموں نکردہ کس

مصطفے خاں شیفتہ فارسی میں 'حسرتی' تخلص کرتے تھے۔ غالب نے کئی مقامات پر شیفتہ کا ذکر بہت احترام سے کیا ہے جس کا اہم سبب ان کا علمی قد، تخلیقی وفور، مضمون آفرینی اور نکتہ رسی تھی۔ شیفتہ کے زمانے تک نہ تو تذکرہ نگاری کے اصول مرتب ہوئے تھے اور نہ ہی تنقیدی ضابطے وجود میں آئے تھے اس کے باوجود انھوں نے 'گلشن بے خار' کی صورت میں ایک جامع انتخاب کیا، اور شعرا کے کلام سے متعلق ایسی رائیں دی جو ان کا شناخت نامہ بن گئیں۔ تذکرے کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیفتہ صدف کو خزف سے الگ کر رہے ہیں، حالانکہ ان کا یہ طریقہ کار ہر شاعر کے بارے میں نہیں ہے۔ اس تذکرے میں تبصروں کی صورت میں جو تنقیدی اشارے پائے جاتے ہیں ان سے شیفتہ کی تنقیدی بصیرت جھلکتی ہے۔ سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شیفتہ کا یہ تذکرہ لکھنے کا مقصد کیا تھا۔

شیفتہ گلشن بے خار کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

نظم مستعد دلربائی است، و عذرای خود آرائی نثر، مشتاق تماشائی شمع خانہ خورشید است، و خورشید نامہ فروغ افزا یعنی بیاضی جمع آید، روشن تر از سپیدۂ صبح صادق، گلستانی آراستہ شد رنگیں تر از صفحۂ خیال عاشق تذکرہ ترتیب یافت مشتمل بر اشعار منظومان فصاحت گستر و ریختہ گویانِ بلاغت طراز۔

ترجمہ: نظم کی حسین ادائیں رکھنے والی محبوبہ دلربائی کے لیے آمادہ ہے اور نثر کی خود پسند معشوقہ جلوہ دکھلانے کے لیے بے چین ہے۔ قلم شمع کی طرح سورج کے سامنے آ گیا ہے، اور ایک سورج جیسی جگمگانے والی کتاب یعنی ایک بیاض مرتب ہوگئی ہے۔ صبح صادق کی روشنی سے زیادہ روشن ایک باغ آراستہ ہوگیا ہے جو رنگینی میں عاشق کے صفحہ خیال سے زیادہ رنگین ہے اور ایک تذکرہ نے ترتیب پائی جو فصیح شاعروں کے اشعار اور بلیغ ریختہ گویوں کے اشعار پر مشتمل ہے۔[1]

آگے چل کر وہ اس تذکرے کا مقصد لکھتے ہیں:

چوں مدنگاہ ازیں تالیف و مطمح نظر ازیں تصنیف فرد آوردن، اشعارِ دل آراست نہ شمار اسامی شعرا ازانکہ سامعہ فریب بیتے بنظر نرسید، عام تر از مجاہیل و معارف و احیا و اموات نامش دریں سفینہ چوں ابیاتش درج نگردید۔

شیفتہ اور غالب کے مابین بہت گہرے تعلقات تھے، وہ استاد و شاگرد بھی تھے اور ندیم بھی، جن کی رائے کا غالب بہت احترام کرتے تھے، ان کی سخن سنجی کے حد درجہ معترف تھے۔

ترجمہ: چونکہ پیش نظر اس تالیف کے اور مقصد اس کتاب لکھنے سے دل کو لبھانے والے اشعار جمع کرنا ہے اور محض شاعروں کے نام گننا نہیں ہے اس لیے کوئی غیر مؤثر شعر نگاہ کے سامنے نہ آیا۔ اور عام لوگوں، جاہلوں اور اہل علم زندہ اور مردہ کا نام اس کتاب میں اس کے شعروں کی طرح درج نہ کیا۔''[2]

شیفتہ نے اپنے مقدمے میں کسی طرح کے اصول کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے بس انھوں نے اپنے مذاق کی بنیاد پر اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ عام طور پر ابتدا میں تذکرہ نگاروں نے کچھ اصول بیان کیے ہیں مگر ان کا تعلق راست طور پر تذکرہ نگاری سے ہے تنقید سے نہیں، جن اصولوں کے مطابق منتخب شعرا کے کلام پر تبصرے کیے ہیں وہ اصول نہیں بیان کیے ہیں بلکہ یہ عربی و فارسی کے اصول ہیں جن کے مطابق اس زمانے میں شاعری کی جاتی تھی۔ اس کے باوجود تذکروں کو تنقید کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے حالانکہ اس حوالے سے پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے بہت صائب رائے کا اظہار کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''شعرائے اردو کے تذکروں میں ترتیب اور درجات کی تقسیم، زمانے کے تعین حتی کہ شعروں کے انتخاب میں فارسی تذکروں کے تتبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس صورت حال میں اردو شاعروں کے تذکرہ نگاروں سے توقع رکھنا درست نہیں کہ وہ فارسی معیار نقد کے علاوہ کسی نئے تنقیدی شعور کا ثبوت دیں گے چونکہ فارسی میں ادبی تنقید کی روایت کا تعلق عموماً عروض، معانی بدیع اور بیان تک محدود رہا اس لیے یہی روایت اردو تذکروں میں بھی منتقل ہوئی۔''[3]

تذکروں میں عام طور پر ایسی رایوں کا اظہار کیا گیا ہے جو شعرا کے پورے کلام کے مطالعے سے ابھرتی ہیں، یہی حال شیفتہ کا بھی ہے، یہاں متن کے تحلیل و تجزیے یا تقابل کی چنداں کوشش نہیں کی گئی ہے اس لیے یہ رائیں بعض مرتبہ درست اور بعض مرتبہ نادرست بھی ثابت ہوئی ہیں۔ عام طور پر ایسے تبصرے کیے گئے ہیں جنھیں کسی پر بھی چسپاں کیا جاسکتا ہے مگر بعض شعرا پر ایسے تبصرے کیے گئے ہیں جنھیں آج بھی ناقدین تسلیم کرتے ہیں۔ 'گلشن بے خار' ایک ایسا تذکرہ ہے جو شعرا کے کلام سے متعلق تذکرہ نگار کی اصابت رائے اور احوال جمع کرنے میں زیادہ محتاط رویہ اختیار کیے جانے کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہوگیا ہے۔ اس میں ظاہر کی گئی رایوں کے تحلیل و تجزیے سے نواب مصطفے خاں شیفتہ کی تنقیدی بصیرت تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

گلشن بے خار (1835) میں مکمل ہوا۔ جس میں 676 شعرا کے احوال اور ان کے کلام کا انتخاب کیا گیا ہے۔ حنیف نقوی لکھتے ہیں:

''گلشن بے خار کی تالیف میں شیفتہ کی تمام تر توجہات پسندیدہ اشعار کے انتخاب اور ایک خاص نظم اور سلیقے کے ساتھ ان کی ترتیب پر مرکوز رہی ہے۔ دوسرے الفاظ میں انھوں نے تذکرہ نگاری کے دوسرے مطالبات اور تقاضوں کو بنیادی طور پر ناقابل اعتنا تصور کیا ہے۔''[4]

مشہور محقق محمود الٰہی نے گلشن بے خار کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''یہ پہلا تذکرہ ہے جس میں شاعروں کے کلام پر متوازن انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے اور مذاق سلیم کو انتخاب اشعار کی بنیاد بنایا گیا ہے''۔ بعض شاعروں کے بارے میں شیفتہ کی رائیں آج بھی قطعی اور حتمی تسلیم کی جاتی ہیں جبکہ حنیف نقوی کہتے ہیں کہ

پرتکلف انداز بیان کی وجہ سے ان کی تنقیدی بصیرت پس پشت چلی گئی ہے، اگر وہ معروضی انداز بیان اختیار کرتے تو ان کی رائے زیادہ واضح طور پر سامنے آتی:

''شخصیت کے خط و خال کی باز آفرینی اور تخلیقی صلاحیتوں کی تحسین کے لیے انھوں نے جو پرتکلف اور مرصع انداز بیان اختیار کیا ہے وہ اس فن سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ان کی تحریروں میں نقاد کے حقیقت طراز قلم سے زیادہ انشا پرداز یا شاعر کا فلک پیما تخیل کارفرما نظر آتا ہے وہ تجزیے کے بجائے حاشیہ آرائی سے کام لیتے ہیں، اور رنگینی عبارت و شگفتگئی تحریر کی خاطر نفس مطلب کا رشتہ تشبیہات و استعارات سے جوڑ کر ایک طلسمی کیفیت پیدا کرنے کے عادی ہیں۔ یہ طلسم بندیاں شخصیت کے تنوع اور ہمہ جہتی کے ساتھ پیچیدہ تر ہوجاتی ہیں۔حتی کہ بعض اوقات اصل مفہوم الفاظ کے پیچ وخم میں گم ہوکر رہ جاتے ہیں۔''5

شیفتہ کی زبان پر حنیف نقوی نے تنقیدی زبان کے تعلق سے جو سوال اٹھایا ہے وہ بجا ہے، مگر حنیف نقوی نے ان کی زبان کا محاکمہ مروجہ تنقیدی زبان کے تناظر میں کیا ہے جو درست نہیں ہے۔انھوں نے اپنے مقدمے کا آغاز جس انداز سے کیا ہے وہ کیف کی زبان ہے، وہ اس تذکرے کی تکمیل پر شرسار تھے، اس لیے انھوں نے نثر میں شاعری کرتے ہوئے نثر کو ایک ایسی معشوقہ قرار دیا ہے جو اپنا جلوہ دکھلانے کے لیے بے قرار ہے۔ان کا یہ دعوی میر، غالب، سودا اور مومن کے بیان میں اوجِ ثریا پر ہے۔انھوں نے معروضی زبان کے بجائے ایک ایسی زبان استعمال کی ہے جسے پڑھ کر ممدوح سے محبت ہوجائے اور ان کے اشعار کی قرات کے لیے دل بیتاب ہوا ٹھے۔دراصل جس سطح کے اشعار کا انھوں نے انتخاب کیا ہے اسی کے بالمقابل اپنی نثر قائم کی ہے، وہ نثر میں بے محابا تشبیہات و استعارات اور ان کے تلازمات کا استعمال کرتے ہیں۔اس کے باوجود اس میں کوئی شک نہیں کہ شیفتہ سے بہتر کسی نے بھی شاعروں کے کلام پر تبصرے نہیں کیے ہیں۔ان پر علاقائی عصبیت اور اشرافیہ نوازی کا بھی الزام لگایا جاتا ہے جس میں کچھ صداقت بھی ہے۔انھوں نے نظیر جیسے شاعر کو شاعروں میں شمار کرنے سے بھی انکار کیا۔ان تمام باتوں کے باوجود ان کے تنقیدی تبصروں پر اگر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک باشعور قاری اور سامع تھے جو صدف وخزف کی پہچان رکھتے تھے۔انھوں نے جو رائیں

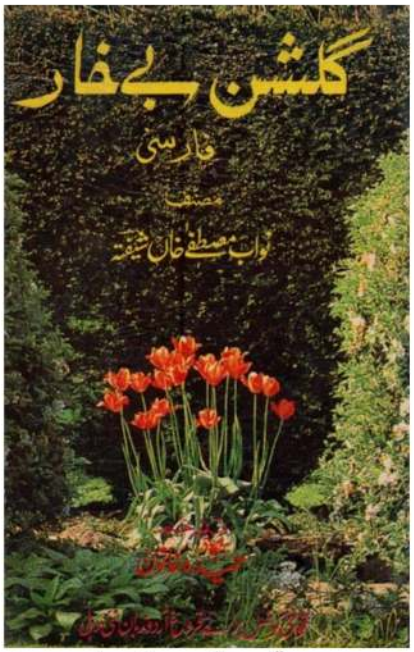

پونے دو سو برس قبل دی تھیں آج بھی قائم ہیں۔ ذیل میں چند شعرا سے متعلق ان کی کچھ آرا نقل کی جاتی ہیں:

شاہ مبارک آبرو: از زبان آوران نامیٔ طبقہ پیشین است۔ بصنعت ایہام مائل بود۔6

زبان ریختہ کے متقدمین میں ہیں، صنعت ایہام کی جانب مائل تھے۔

رضا قلی آشفتہ: شعرش شستہ و صاف، فکرش مطبوعِ طبع اہلِ انصاف۔7

ان کے اشعار شستہ اور صاف ہیں اور فکر اہل انصاف کی طبیعت کے مطابق ہے۔یعنی فکری سطح پر روایتی ہیں۔

خواجہ میر درد: از لطافت طبع و شستگئی نظم و رشاقت مضمون پیداست،.....فکرش صحیح، گفتارش از رکاکت و اغلاط پاک.....واکثر ابیات باعلوِ معانی وسمو مضامین دلکش وحالی..8

ان کے کلام میں لطافت، نظم میں شستگی اور مضمون چست ہے، فکر درست ہے، کلام رکیک الفاظ اور غلطیوں سے پاک ہے۔اکثر اشعار معانی کے اعتبار سے بلند اور مضامین کے اعتبار شاندار ہیں۔

شرف الدین مضمون: فکرے مقصور بر ایہام است کہ شیوہ اہل زبانش بودہ9

ان کی فکر ایہام پر مبنی ہے جو اہل زبان کا شیوہ تھا۔

سودا: ''حلاوتِ کلامش چاشنیٔ نوش لب شکرین، شاہدان شیریں شمائل می دارد، فکرش چمنِ جنت است کہ گلہای کس نچیدہ ازان می خیزد و اندیشہ اش چشمۂ خلد است کہ جوئے شیر، ازان می ریزد، ذوقِ کلامش ہم اثرِ شراب است، امانہ شرابی کہ از رگ تاک برآید.....بر اصناف سخن قدرت تام و آنکہ بین الانام شہرت پذیر کہ قصیدش بہ از غزل است حرفیست مہمل بزعم فقیر غزلش بہ از قصیدہ است وقصیدہ اش بہ از غزل۔10

ان کے کلام کی شیرینی معشوقوں کے لب شیریں کی حامل ہے، ان کی فکر جنت کا باغ ہے کہ اس کے پھول ان کے علاوہ کسی اور نے نہیں توڑے، ان کا تخیل جنت کا چشمہ ہے جس سے جوئے شیر بہہ رہی ہے ان کے کلام میں شراب کا سا لطف ہے مگر وہ شراب نہیں جو انگور سے بنتی ہے۔.....تمام اصناف سخن پر ان کو قدرت تامہ حاصل ہے جیسا کہ عوام میں مشہور ہے کہ ان کے قصائد غزل سے بہتر ہیں مگر اس فقیر کی رائے میں یہ ایک مہمل و بے معنی رائے ہے۔ان کی غزل قصیدے سے بہتر اور قصیدہ غزل سے بہتر ہے۔یہاں شیفتہ کے بجائے عوام میں مشہور بات زیادہ بہتر ثابت ہوئی۔آج بھی سودا قصائد کے حوالے سے ہی معروف ہیں۔

میر محمد سوز لکھنوی: کلامش از جادہ مستقیمہ بر کراں۔11

ان کا کلام روایت کے مطابق ہے۔

غالب: غزلش چوں غزل نظیری بے نظیر، وقصیدہ اش چوں قصیدہ عرفی دل پذیر، مضامین شعری کما ھو حقہ 12

ان کی غزل نظیری کی طرح بے نظیر ہے اور قصیدہ عرفی کی طرح دل پذیر ہے۔شعر کے مضامین کا انھوں نے حق ادا کردیا ہے۔

مصحفی: ہر چند بتقاضایے شیوۂ بسیار گویان اکثر کلامش کم پایہ واز لطائف خالی است، اما گزیدہ اشعارِ او درنہایت رتبت والا و مرتبت عالی است 13

بسیار گوئی کی وجہ سے ان کا کلام لطف سے خالی ہے البتہ منتخب اشعار عالی مرتبت ہیں

میر تقی میر: ورشحہ قلمش درشگفانیدن گلہای مضامینِ تازہ، ہمرنگ ابرِ نو بہار، صدآہِ دردناک بتاثیر یک مصرع اونیست..... بافنون نظمیہ ربطِ تمام دارد، لا سیما در غزل سرائی و مثنوی گوئی سبقت می رباید۔پست و بلند کہ در کلامش بینی و رطب و یابس کہ در ابیاتش بنگری نظر نکنی .....در قصیدہ فکر خوشی نداشتہ چنداں کہ غزلش بلند مرتبہ تر است ہمچنان قصیدہ اش پست پایہ تر۔14

ان کا نوک قلم مضامین نو کے پھول کھلانے میں ابر نو بہار کے مشابہ ہے سو پر درد آہیں تاثیر میں ان کے ایک مصرع کے برابر نہیں۔شعر گوئی میں مہارت ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ غزل اور مثنوی گوئی میں ان سے

کسی کی مسابقت نہیں،ان کے کلام میں جو پستی و بلندی دیکھتے ہیں وہ ان کے اشعار میں رطب و یابس دیکھتے ہیں۔کیا یہ بات نظر سے نہیں گذری کہ اگر شعر میں اعجاز ہے تو بلندی و پستی کوئی معنی نہیں رکھتی۔قصیدہ کے لیے ان کی طبیعت موزوں نہ تھی جس قدر کہ ان کی غزل نہایت بلند مرتبہ ہے اسی قدر ان کا قصیدہ کم رتبہ ہے۔

میر سے متعلق غزل اور قصیدے کے سلسلے میں جس رائے کا ظہار شیفتہ نے کیا تھا آج بھی ناقدین اسی کو تسلیم کرتے ہیں۔

نظیر اکبر آبادی: اشعار بسیار دارد کہ بر زبان سوقیین جاری است و نظر بہ آں ابیات در اعداد شعرا، نشایدش شمرد۔[15]

ان کے بہت سے اشعار بازاری لوگوں کی زبان پر جاری ہیں،ان اشعار کے مدنظر ان کا شمار شعرا میں نہیں ہونا چاہیے۔یہی وہ نکتہ ہے نظیر کے بارے میں جس نے ایک اور تذکرہ کی ترتیب کی راہ ہموار کی اور قطب الدین باطن کا تذکرہ 'گلستان بے خزاں' وجود میں آیا۔

انعام اللہ خاں یقین: کلامش سیر نمک است۔ حلاوت دل خواہ دارد۔[16]

ان کے کلام میں نمکینی اور دل کو پسند آنے والی حلاوت ہے

شیفتہ کی مندرجہ بالا رایوں کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کا تعلق عروض و لسانی قواعد،صنائع و بدائع،اور علم معانی سے ہے۔ان آرا سے اب ہم کچھ اصول تنقید مرتب کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو آج بھی مروج ہیں، جن کے توسط سے شاعری کی تنقید کی جاتی ہے۔اس سے شیفتہ کی تنقیدی ژرف نگاہی کا اندازہ ہوگا جو باتیں انھوں نے کہی تھیں وہ کس طرح اردو تنقید کی اساس قرار پائیں۔

فکری بلندی اور اسلوب کی خوبصورتی (میر حسین تسکین)۔روایت کی پابندی (میر محمد سوز)۔صنعت کا ہونا (شاہ مبارک آبرو)۔شعر میں شستگی و صفائی کا ہونا تاکہ اثر انگیز ہو (رضا قلی آشفتہ)۔کلام میں نمکینی، حلاوت اور اس کا شیریں ہونا۔کلام کا شور انگیز ہونا (احسن اللہ بیان و انعام اللہ خاں یقین)۔خیالات کی رنگینی یعنی مضامین کا تنوع۔ (الٰہی بخش معروف)۔ مضمون بندی میں مہارت،نکتہ رسی اور لطیف مضامین باندھنا۔شعر کا لسانی اغلاط اور رکیک الفاظ سے پاک ہونا۔شعر میں اعلیٰ مضمون کو نظم کرنا۔فکر کا صالح ہونا (خواجہ میر درد اور نظام الدین ممنون)۔مضامین کی تازگی اور ان کا نو بہ نو ہونا۔کلام کا پر درد و پر تاثیر ہونا۔شاعری کے فن سے واقف ہونا۔موازنہ غزل اور قصیدے کے مابین موازنہ اور شاعر کا صنفی لحاظ سے تعین قدر۔ (غزل میں میر تقی میر اور قصیدے میں سودا کی برتری)۔دوسری زبان کے شاعروں سے موازنہ۔غزل میں نظیری اور قصیدے میں عرفی کے ہم پلہ قرار دینا (غالب)۔خیال میں ندرت اور بیان میں تاثیر کا ہونا (سودا)۔منتخب اشعار کی بنیاد پر تعین قدر (نظیر اکبر آبادی و مصحفی)۔بسیار گوئی سے کلام میں فنی سطح پر کمزوری کی طرف اشارہ (مصحفی)۔کسی ایک صنعت پر انحصار کو غیر مناسب تصور کرنا (شرف الدین مضمون)۔

موجودہ مروجہ تنقید کی حدود کا موازنہ اگر ہم شیفتہ کی تنقید سے کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہر چند ان کی رائے محض تاثراتی ہے، کہیں بھی تحلیل وتجزیے سے کام نہیں لیا ہے اس کے باوجود ان کی یہ رائیں مروجہ تنقید پر کھری اترتی ہیں اور ان کے یہ تنقیدی اشارے آج کی تنقید کی بنیاد معلوم ہوتے ہیں حالانکہ انھوں نے حالی کی طرح تنقید کے اصول وضع نہیں کیے مگر ان کی منتشر آرا کو جمع کرکے جب ان کی چھان پھٹک کی جاتی ہے اور اس سے اصول تنقید مستنبط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو موجودہ تنقید کا ایک ہیولی نظر آنے لگتا ہے۔اردو تنقید کی حدود میں قرات، تفہیم، تحسین، تجزیہ، تقابل اور تعین قدر شامل ہیں۔

موزونی طبع کے باوجود شعری لوازمات سے عدم واقفیت سے فنی سطح پر شعر کا کمزور ہونا (منیر) وغیرہ۔

نواب مصطفے خاں شیفتہ کے تبصروں سے مرتب مندرجہ بالا اصول و ضوابط میں مشرقی شعریات یعنی عربی و فارسی اصول تنقید (صنائع و بدائع،علم معانی، قافیہ اور اوزان) کی بازگشت نظر آتی ہے۔اس کے باجود کچھ نئی باتیں ہیں مثلاً شیفتہ موازنہ پسند ہیں، وہ شاعر کا موازنہ اصناف کے تناظر میں تو کرتے ہی ہیں اس کے ساتھ ہی دوسری زبان کے شعرا سے بھی موازنہ کرتے ہیں۔اسی طرح تنقید کے لیے اصناف سخن کے اصول و ضوابط سے ان کی گہری واقفیت انھیں اس لائق بناتی ہے کہ وہ صنفی اعتبار سے شعرا کا تعین قدر کرسکیں۔

موجودہ مروجہ تنقید کی حدود کا موازنہ اگر ہم شیفتہ کی تنقید سے کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہر چند ان کی رائے محض تاثراتی ہے،کہیں بھی تحلیل و تجزیے سے کام نہیں لیا ہے اس کے باوجود ان کی یہ رائیں مروجہ تنقید پر کھری اترتی ہیں اور ان کے یہ تنقیدی اشارے آج کی تنقید کی بنیاد معلوم ہوتے ہیں حالانکہ انھوں نے حالی کی طرح تنقید کے اصول وضع نہیں کیے مگر ان کی منتشر آرا کو جمع کرکے جب ان کی چھان پھٹک کی جاتی ہے اور اس سے اصول تنقید مستنبط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو موجودہ تنقید کا ایک ہیولی نظر آنے لگتا ہے۔اردو تنقید کی حدود میں قرات، تفہیم، تحسین، تجزیہ، تقابل اور تعین قدر شامل ہیں۔مندرجہ بالا اصول وضوابط کا اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو اس میں صرف تجزیہ نہیں ہے، اس کے علاوہ سبھی اصول پائے جاتے ہیں۔اس سے نواب مصطفے خاں شیفتہ کی تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔انھوں نے اردو شاعری کی تنقید کو اپنی ژرف نگاہی سے مضبوط بنیادیں فراہم کیں، محمد حسین آزاد اردو ادب کے عناصر خمسہ میں شامل ہیں جن کی تنقید کی بنیادوں میں نواب مصطفے خاں شیفتہ کی فکر شامل ہے۔شیفتہ نے اپنی تنقیدی آراء سے بعد میں آنے والوں کے لیے راہ ہموار کی۔انھوں نے شاعری کی تفہیم اور تعین قدر کو ایک سنجیدہ اور اصولی شکل دی۔جس نے بعد میں منظم تنقید کی شکل اختیار کی۔

ماخذ و مصادر:

1 گلشن بے خار: نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، اتر پردیش اردو اکادمی 1982 ص4
2 ایضاً، ص 6-5
3 مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت: پروفیسر ابوالکلام قاسمی، 1992 ص 16-115
4 حنیف نقوی۔شعرائے اردو کے تذکرے، اتر پردیش اردو اکادمی، 1998۔ص 682
5 ایضاً، ص 94-693
6 گلشن بے خار: نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔اتر پردیش اردو اکادمی، 1982 ص6
7 ایضاً،13، 8 ایضاً،68، 9 ایضاً،81، 10 ایضا،99
11 ایضاً،104، 12 ایضاً، 138، 13 ایضاً، 178
14 ایضاً، 210، 15 ایضاً، 231، 16 ایضاً، 232

Mohd Haneef Khan
Asisstant Prof (Cont)
Department of Urdu (Womens College)
Aligarh Muslim University
Aligarh- 202002 (UP)
Mob:9359989581
Email: haneef5758@gmail.com

جگر کی کلاسیکیت

اکرم پرویز

اردو غزل کی روایت میں جگر مرادآبادی کا فنی اختصاص و انفراد مستحکم ہے لیکن اس کے باوجود ان کے فن کے معروضی محاکمے میں کئی نکات سد راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔مثال کے طور پر ان کے کردار کے متعدد پہلو ایسے ہیں جو ان کی شعری انفرادیت ،فنی اختصاص یا ان کے معروضی مطالعے میں مانع ہیں۔جیسے ان کی شراب نوشی، ان کا قیافہ، ان کی شعر گوئی کا منفرد لحن، مشاعروں میں ان کی آمد اور روانگی، اصغر اور ان کے تعلقاتِ دیرینہ، ان کا ترقی پسندانہ رویہ، ان کا شریفانہ مزاج، غرض کہ اس نوع کے بے شمار کرداری انسلاکات ہیں جو جگر اور ان کی شاعری کے درمیان قاری کو الجھانے اور بھٹکانے کا کام کرتے ہیں۔کلام جگر کا مطالعہ خاص طور سے ان کی غزلوں کا مطالعہ غزل کی شعریات کے دائرے میں کیا جانا چاہیے لیکن ہم غزل کی شعریات کا التزام نہ کرتے ہوئے جگر کی شاعری کو ان کی عمر رفتہ میں تلاش کرتے ہیں اور ان کی غزل گوئی کو ان کی نفسیات کا آئینہ بنانے کے درپے رہتے ہیں۔

اس حوالے سے دوسری بات یہ ہے کہ عام طور پر جگر مرادآبادی کو جدید اردو غزل کا ایک امتیازی نشان قرار دیا جاتا ہے۔لیکن یہاں یہ سوال قائم ہوتا ہے کہ کیا جدید غزل کی شعریات، کلاسیکی (قدیم یا پرانے کے بجائے نمونہ یا مثال کے معنی میں) غزل کی شعریات/کلاسیکی شعریات سے مکمل طور پر علاحدہ ہے؟ ظاہر ہے ایسا ممکن نہیں کہ شعریات کوئی جامد شے نہیں ہے بلکہ اس میں روانی و تحرک ہے۔غزل کی شعریات ان اصولوں ،قدروں اور تصورات سے عبارت ہے جو اس کی وجودیات مرتب کرتے ہیں۔اسی کی اساس پر غزل کی قرأت کے آداب وضع ہوتے ہیں۔یہ ایک متحرک اور سیال سلسلہ ہے جس کے مختلف پڑاؤ ضرور ہیں لیکن اس کا بنیادی ساختیہ سدا غیر مبدل رہتا ہے۔جس طرح DNA آنے والی نسلوں میں معمولی سی تبدیلی کے ساتھ منتقل ہوتا ہے اسی طرح شعریات بھی ذرا سی تبدیلی کے ساتھ عہد بہ عہد اپنے بنیادی جوہر کو قائم رکھتی ہے۔اس لحاظ سے یہ کہنا بجا ہے کہ جدید غزل کی شعریات بھی کلاسیکی شعریات کے بطن سے برآمد ہوتی ہے۔اس تناظر میں کلام جگر کا مطالعہ کرنے سے کئی انکشافات ہوتے ہیں۔ذیل میں اسی تعلق سے مکالمہ قائم کیا گیا ہے۔

عمومی طور پر غزل کی شعریات کو دو حصوں (کلاسیکی اور جدید) میں منقسم کیا جاتا ہے۔پہلا حصہ امیر خسرو سے ہوتے ہوئے غالب تک پہنچتا ہے اور کمال کی بات ہے کہ اس کے دوسرے حصہ کا آغاز بھی غالب سے ہی ہوتا ہے جو ان سے ہوتے ہوئے اقبال، میراجی اور راشد تک پہنچتا ہے اور ان کے یہاں سے یہ سلسلہ مزید صیقل ہو کر ہنوز قائم ہے۔ظاہر ہے کلام جگر کے شعری محاسن پر مکالمہ اسی وقت قائم ہوسکتا ہے جب ہم غزل کی کلاسیکی شعریات سے روشناس ہوں۔

غزل کی کلاسیکی شعریات کا اہم متن امیر خسرو کے تیسرے دیوان 'غرۃ الکمال' کا دیباچہ ہے۔اس دیباچے میں خسرو نے شاعری کی دو امتیازی شرطیں بتائی ہیں ان میں سے ایک روانی اور دوسرا ایہام ہے۔روانی کو انھوں نے Water Cycle کے مشابہ قرار دیا ہے۔یعنی ''سب سے عمدہ روانی وہ ہے جو اس پانی میں ہوتی ہے جو مبدل بہ حرارت ہو کر پھر مبدل بہ آب ہو کر، پھر مبدل بہ ہوا ہو کر بالآخر مبدل بہ آب ہو گیا ہو۔''[1] اسی طرح ''ان کی نظر میں ایک سے زیادہ معنی رکھنے والے کلام کی خاص اہمیت ہے۔''[2] جسے انھوں نے ایہام کہا ہے۔ یوں خسرو کی نظر میں ایک اچھا شعر ایہام اور روانی سے متصف ہوتا ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق یہ تصور سنسکرت شعریات (سلیش النکار جس کا نیچر ایہام سے مماثل ہے) سے مستعار ہے جو ہماری کلاسیکی شعریات کا اہم حصہ رہا ہے۔اٹھارہویں صدی تک پہنچتے پہنچتے روانی اور ایہام کا تصور مستحکم ہو چکا تھا۔اس دور کی غزلیہ شاعری میں روانی اور ایہام کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی، رعایت لفظی اور مناسبت کا بھی استعمال عام تھا۔معنی آفرینی دراصل ایک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں کے مصداق ہے یعنی ''کلام میں معنی پیدا کرنے کا عمل، کلام میں مضمون باندھنے کے عمل سے الگ ہے۔کلام میں ایک سے زیادہ معنی پیدا ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ سامع/قاری تمام معنی کو قبول کرنے پر مجبور ہو یا مختلف معنی میں درجہ بندی کرے اور کہے کہ

جگر کی غزلوں کی روانی، اس کا آہنگ، اس کی موزونیت، اس کا لحن اسے موسیقی سے بلند کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جگر مشاعروں میں اپنا کلام سناتے تو سامعین اپنا سر دھنتے تھے۔ مشاعروں میں ان کی آمد اور روانگی کی جو کہانیاں ہیں اسے اسی سیاق میں دیکھا جانا چاہیے۔

فلاں معنی بھی ممکن ہے۔''[3] اس کے علاوہ ''کسی متن میں اگر معنی ہیں تو وہ سراسر مضمون کے پابند ہو سکتے ہیں، اور نہیں بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ متن کا مضمون صرف چند اشاروں یا مبہم کنایوں تک محدود ہو، لیکن اس کے معنی ان اشاروں اور کنایوں کی مدد سے بکثرت بن سکتے ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ متن مختصر ہو لیکن اس میں بہت سے معنی یا بڑے معنی سما جائیں۔ یہ ممکن ہے کہ متن کی سطح پر مضمون کچھ کہتا ہو لیکن اندر اندر کچھ کہتا ہو۔''[4] اسی طرح رعایت لفظی کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ اس میں ''ایسے الفاظ کا استعمال [ہوتا ہے] جن کے درمیان بظاہر معنی کا علاقہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں، الفاظ کا استعمال ایک دوسرے کی رعایت کے ساتھ ہو۔ اور یہ رعایت ہر ایک طرح کی ہو سکتی ہے۔''[5] یہ وہ اصطلاحات ہیں جو کلاسیکی غزل کی اساس تھیں اور شاعر و ناقد دونوں کے یہاں اس کا تصور کافی مستحکم تھا۔

اس سیاق میں دیکھنے سے کلام جگر کی معنویت کئی لحاظ سے دوبالہ ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے تو ان کے اشعار میں ایک خاص قسم کی روانی موجود ہے۔ جیسا کہ روانی کو امیر خسرو نے شعر کی سب سے اہم خوبی قرار دیا ہے۔ جگر کی غزلوں کا مطالعہ کریں تو روانی کا یہ اہتمام پوری شد و مد کے ساتھ کام کرتا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اشعار میں ایک مخصوص قسم کی موزونیت ہوتی ہے جو اسے موسیقی سے قریب تر کرتی ہے۔ خسرو نے شعر کو موسیقی سے افضل قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ موسیقی کی ارفعیت شعر کے تابع ہوتی ہے۔ جگر کی غزلوں کی روانی، اس کا آہنگ، اس کی موزونیت، اس کا لحن اسے موسیقی سے بلند کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جگر مشاعروں میں اپنا کلام سناتے تو سامعین اپنا سر دھنتے تھے۔ مشاعروں میں ان کی آمد اور روانگی کی جو کہانیاں ہیں اسے اسی سیاق میں دیکھا جانا چاہیے۔ اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں

آنکھوں کے سامنے اب منزل رہی نہ راہیں
جلووں نے ترے مل کر سب لُوٹ لی نگاہیں

اک بزمِ ناز میں چل زاہد تجھے دکھا دوں
مینا بدوش آنکھیں ساغر بکف نگاہیں

محبت کیا ہے تاثیر محبت کس کو کہتے ہیں؟
ترا مجبور کر دینا میرا مجبور ہو جانا

یکایک دل کی حالت دیکھ کر میرا تڑپ اٹھنا
اسی عالم میں پھر کچھ سوچ کر مسرور ہو جانا

محبت عین مجبوری سہی لیکن یہ کیا باعث؟
مجھے باور نہیں آتا میرا مجبور ہو جانا

جب سے معلوم کیا دل کے نہاں خانے کو
آنکھ اٹھانے کو بھی فرصت نہیں دیوانے کو

عشق معصوم صفت حسن ثقاہت دشمن
مختصر کون کرے شوق کے افسانے کو

پی کے اک جام وہ جلوے نظر آئے مجھ کو
دیکھتا ہوں کبھی مے کو کبھی مے خانے کو

محولہ بالا اشعار بنا کسی تردد کے کلیات جگر مرتبہ نواز چودھری سے منقول ہیں۔ اس نوع کے اشعار سے یعنی جس میں روانیت کا غلبہ ہے کلیات جگر بھرا پڑا ہے۔

روانی کے علاوہ کلام جگر میں ایہام کی وافر مثالیں موجود ہیں۔ ان کے یہاں ایہام بھرتی کا معلوم نہیں ہوتا ہے بلکہ لفظی ترتیب میں اس طرح پیوست ہوتا ہے

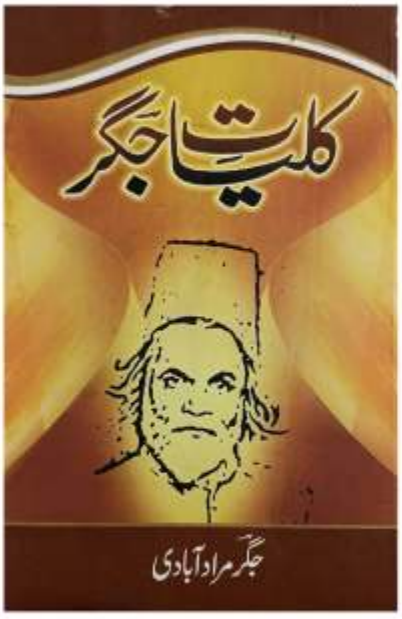

کہ قرأت کے دورانیہ میں قاری اس پر غور کیے بنا ہی گذر جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کے کلام کی روانی سے قاری دھوکا کھا جاتا ہے لیکن Close Reading سے ایہام گرفت میں آجاتا ہے۔ مثلاً:

یوں بسر کی زندگی میں نے اسیری میں جگر
ہر طریقہ داخلِ آدابِ زنداں ہو گیا

اس شعر میں لفظ 'اسیری' کے دو معنی ہیں۔ پہلا قید اور دوسرا مبتلا۔ چونکہ قید کی مناسبت سے زنداں آیا ہے اس لیے قاری اسیری بمعنی قید کو مقدم مان کر شعر کی تفہیم کر لیتا ہے۔ لیکن اسیری بمعنی مبتلا یعنی عشق میں مبتلا پڑھنے پر شعر مزید گہرا اور بڑا بن جاتا ہے۔ یوں عشق میں مبتلا ہونا زنداں میں مقید ہونے کے مترادف ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس نوع کے ایہام کو خالص ایہام کہا ہے۔ انھوں نے ایک دوسرے قسم کے ایہام یعنی 'مساوات معنی' کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ ''جہاں ایک لفظ کے دو معنی ہوں، ایک دور کے اور ایک قریب کے، لیکن دونوں معنی برابر کے قوی ہوں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو کہ شاعر نے کون سے معنی مراد لیے تھے۔''[6] اسے مساوات معنی کہتے ہیں۔ مندرجہ بالا شعر کو ایہام خالص کے ضمن میں بریکٹ کرنے کے ساتھ ساتھ مساوات معنی کے سیاق میں بھی انگیز کیا جا سکتا ہے۔ اسی حوالے سے جگر کا ایک شعر ہے کہ

لاکھوں میں جگر اس نے پہچان لیا تم کو
چھپتی ہے چھپانے سے کب آنکھ محبت کی

محولہ بالا شعر میں آنکھ کو بطور ایہام برتا گیا ہے۔ آنکھ کا ایک معنی جو سامنے کا ہے وہ آلۂ بصارت ہے، اس کے علاوہ اس کے کئی معنی اور بھی ہیں۔ جس میں دیکھنا، نظر، مشاہدہ، تیور (دیکھنے کا انداز)، پاس، مروت، اشارہ، امید وغیرہ شامل ہیں۔ اس شعر کی قرأت سے صاف ظاہر ہے کہ آنکھ آلۂ بصارت کی بجائے نظر یا دیکھنے کے انداز سے منسلک ہے۔ یہ شعر ایہام خالص کی عمدہ مثال ہے۔ اسی طرح جگر کا ایک اور شعر ہے

طنز و تعریض کی آخر کوئی حد ہوتی ہے!
آدمی ہوں میرے منھ میں بھی زباں ہے ساقی

محولہ بالا شعر میں زبان کے دو معنی ہیں۔ قریب کا معنی آلۂ نطق سے عبارت ہے اور معنی بعید بولنے یا اپنی

بات رکھنے سے متعلق ہے۔شعر کا بغور مطالعہ واضح کرتا ہے کہ جگر معنی بعید کو اہمیت دیتے ہیں۔اسی طرح ان کا ایک اور شعر ہے کہ:

قفس کے سامنے بجلی کچھ اس طرح چمکی
نظر میں پھر گئی تصویر آشیانے کی

مندرجہ بالا شعر میں 'قفس' سے دو معنی مراد لیے گئے ہیں۔قریب کا معنی پنجرے یا قید خانے کے ہیں جبکہ دور کا معنی جسم کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ قفس یعنی متکلم کے جسم یا وجود یا اس کی نظروں کے سامنے جب بجلی چمکی تو اس کے ذہن میں اپنی بے چارگی اور مہاجرت کا احساس قوی ہو گیا اور اسے اپنا آشیانہ یعنی گھر یاد آنے لگا۔یہاں یہ نفسیاتی نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ مہاجرت یا جلاوطنی میں گھر کی شدید آرزو ہوتی ہے اور اس بات کو جگر سے زیادہ اچھی طرح سے کون سمجھ سکتا تھا۔اسی مضمون کو ناصر کاظمی نے یوں بیان کیا ہے

گھر ایسا کہاں کا تھا ناصر
در بدر ہیں تو یاد آتا ہے

جگر کے کلام میں رعایت لفظی اور مناسبت کی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔انھیں شعر کی دروبست کا خاص التزام معلوم تھا۔ان کے یہاں لفظوں کی ترتیب کا خاص ہنر موجود ہے۔وہ لفظوں کی ترتیب میں معنوی اعتبار سے رعایت کا خاص التزام کرتے ہیں ساتھ ہی ساتھ مناسبت سے بھی ان کو گہرا شغف ہے۔ان کی مناسبتیں اور رعایتیں اچھوتی اور نادر ہونے کے ساتھ ساتھ شعر کے آہنگ اور اس کی معنوی جہت سے کلی طور پر منسلک ہوتی ہیں۔کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں

صحرا ہے نہ بستی ہے دریا ہے نہ ساحل ہے
جو کچھ نظر آتا ہے ایک شعبدۂ دل ہے

موت پر حیرانی و حیرت ہی کیا
زندگی خود اک طلسم راز ہے

جب ہمیں مٹ گئے ارمان میں پابوسی کے
خاک پہنچی بھی تو کیا گوشۂ داماں کے قریب

حسن کی سحرکاریاں عشق کے دل سے پوچھیے
وصل کبھی ہے ہجر سا ہجر کبھی وصال سا

یہ ہوائیں، یہ گھٹائیں، یہ فضائیں، یہ بہار
محتسب آج تو شغلِ مے و پیمانہ سہی

مندرجہ بالا مثالیں رعایت لفظی اور مناسبت کو روشن کرتی ہیں۔پہلے شعر میں صحرا بستی، دریا اور ساحل

جگر کے کلام میں رعایت لفظی اور مناسبت کی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔انھیں شعر کی دروبست کا خاص التزام معلوم تھا۔ان کے یہاں لفظوں کی ترتیب کا خاص ہنر موجود ہے۔وہ لفظوں کی ترتیب میں معنوی اعتبار سے رعایت کا خاص التزام کرتے ہیں ساتھ ہی ساتھ مناسبت سے بھی ان کو گہرا شغف ہے۔ان کی مناسبتیں اور رعایتیں اچھوتی اور نادر ہونے کے ساتھ ساتھ شعر کے آہنگ اور اس کی معنوی جہت سے کلی طور پر منسلک ہوتی ہیں۔

کی مناسبت آشکار ہے۔اسی طرح دوسرے شعر میں موت اور حیرت کے ساتھ زندگی اور طلسم کی رعایت شعر کی معنویت میں اضافہ کرتی ہے۔تیسرا شعر پابوسی اور گوشۂ داماں کی مناسبت کو روشن کرتا ہے۔چوتھے شعر میں حسن، عشق، وصل اور ہجر کی رعایت و مناسبت قابل دید ہے۔آخری شعر میں ہوا، گھٹا، فضا اور بہار کی مناسبت اور رعایت واضح ہے۔

کلام جگر میں معنی آفرینی یعنی 'ایک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں' کی بھی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ایک شعر ملاحظہ ہو

عشق کی بدحواسیاں توبہ
بارہا خود مجھے ہنسی آئی

غزل، واردات عشق کا بیانیہ ہے یعنی مضامین عشق کو واقعاتی سطح پر بیان کیے بنا غزل کہنا محال ہے۔'کلیات جگر' سے آشکارا ہے کہ جگر احوال عشق کی تجدید کرتے ہیں اور اسے ماقبل کے شعرا کے واردات سے ممتاز کرنے کی سعی میں مشغول نظر آتے ہیں۔ان کا محولہ بالا شعر اس کی عمدہ مثال ہے کہ عشق کی بدحواسیاں عاشق کو رونے پر مجبور کرتی ہیں لیکن یہاں شاعر ان پر ہنسنے کی بات کرتا ہے۔اس نوع کا تجربہ غالب کے یہاں بھی ملتا ہے لیکن جگر کی تخلیقیت جدید ذہن سے قریب ہے۔مضامین عشق سے متعلق چند اشعار جو معنی آفرینی پر دال ہیں ملاحظہ ہوں:

مجھے تھا شکوۂ ہجراں کہ یہ ہوا محسوس
مرے قریب سے ہوکر وہ ناگہاں گذرے

کہاں کا حسن، کہ خود عشق کو خبر نہ ہوئی
رہ طلب میں کچھ ایسے بھی امتحاں گذرے

جہاں وہ ہیں وہیں میرا تصور
جہاں میں ہوں خیال یار بھی ہے

نہیں معلوم کس عالم میں حسن یار دیکھا تھا
کوئی عالم ہو لیکن دل کی حیرانی نہیں جاتی

کلام جگر کو محض جدید غزل سے مختص کرنا اور مکمل طور پر کلاسیکی شعریات سے علاحدہ کرنا ان کے تخلیقی تجربہ سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ہم جگر کے فن پر مکالمہ اسی وقت قائم کر سکتے ہیں جب ہمیں کلاسیکی شعریات کے بنیادی تصورات کا علم ہو۔ظاہر ہے غزل کو غزل کی شعریات سے برطرف نہیں کیا جا سکتا اور جب غزل کی شعریات کے تناظر میں کلام جگر کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو جگر کی تخلیقیت کے کئی گوشے ہم پر وا ہوتے ہیں جن کا اندازہ محولہ بالا مثالوں سے بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ جگر کا فن انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی ہے اور ہماری کلاسیکی شعریات سے منسلک ہے۔یہ کلیہ ان کے فن کو یا ان کے مرتبے کو کم نہیں کرتا بلکہ ان کے صحیح مرتبہ و مقام کو متعین کرنے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔مندرجہ بالا مثالیں اس کا بین ثبوت ہیں۔

حواشی

1 شمس الرحمٰن فاروقی:تنقیدی معاملات، دہلی:ایم۔آر۔پبلی کیشنز، 2018، ص:136

2 ایضاً، ص:142

3 شمس الرحمٰن فاروقی:اردو غزل کے اہم موڑ، نئی دہلی:غالب اکیڈمی، 1997، ص ص:9,8

4 ایضاً، ص:11

5 ایضاً، ص:44

6 ایضاً، ص:37

Dr. Akram Parvez
Assistant Professor & Head Department of Urdu
Hindu College, Moradabad, U.P.-244001
Mob. 7060934642
Email: yasir2050@gmail.com

ظفراللہ انصاری

سلطان اختر

کلاسیکی روایت کا جدت پسند شاعر

مجھے جن بزرگ شعرا کو قریب سے دیکھنے اور ان کی شاعری سے مستفیض ہونے کا موقع ملا ان میں ایک معتبر نام سلطان اختر کا بھی ہے۔ ان کا اصل نام سلطان اشرف تھا لیکن اردو ادب میں سلطان اختر کے قلمی نام سے مشہور ہوئے۔ پروفیسر وہاب اشرفی اپنی تاریخ ادب اردو جلد سوم میں ان کا تعارف حسبِ ذیل انداز میں پیش کرتے ہیں:

''ان کا اصل نام سلطان اشرف ہے لیکن اپنے قلمی نام سلطان اختر سے معروف ہوئے۔ ان کے والد محمد شرف الدین تھے اور والدہ رابعہ خاتون۔ سلطان اختر 16 دسمبر 1940 میں سہسرام میں پیدا ہوئے۔ یہی ان کا آبائی وطن ہے۔ انھوں نے مدرسہ خیریہ نظامیہ سے مولوی تک کی تعلیم حاصل کی، پھر انگریزی تعلیم کی طرف راجع ہوئے۔ سہسرام ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا اور یہیں کے ایس پی جین کالج سے بی اے کر رہے تھے کہ لیبر ڈپارٹمنٹ جمشید پور میں ملازمت مل گئی اور تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی۔ ستمبر 1968 سے ہوم (جیل) ڈپارٹمنٹ سے وابستہ ہوئے اور پٹنہ میں قیام پذیر ہو گئے۔ اسی عہدے سے 30 ستمبر 2000 میں سبکدوش ہوئے۔''1

ڈاکٹر اے۔ کے۔ علوی نے اپنے مضمون ''شہنشاہِ غزل- سلطان اختر'' میں جہاں سہسرام کی ادبی تاریخ پر ایک اجمالی روشنی ڈالتے ہوئے اس شہر کی عظمت رفتہ کا ذکر کیا ہے وہیں اس بات کی بھی صراحت کی ہے کہ سلطان اختر ایک تعلیم یافتہ خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ انہی کے لفظوں میں: ''سلطان اختر نے اسی شہر (سہسرام) کے محلّہ خان بھائی کے باغ کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے کے الحاج شرف الدین و رابعہ خاتون کے یہاں 16 ستمبر 1940 کو آنکھیں کھولیں''۔2

اپنے شہر کی ادبی فضا اور گھر کے ماحول نے ان کے اندر شاعری کا ذوق و شوق پیدا کیا۔ 1957 سے باضابطہ شاعری کرنے لگے۔ انھوں نے ابتدا میں محمد الطاف حسین مانوس سہسرامی سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ وہی مانوس سہسرامی جن کے تعلق سے اردو کے مایۂ ناز نقاد پروفیسر عبدالمغنی کا خیال ہے کہ: ''عصر حاضر میں اگر کسی شاعر کو میر کا جانشین، نمائندہ یا ترجمان کہا جا سکتا ہے تو وہ فانی بدایونی کے بعد مانوس سہسرامی ہیں، جن کے تغزل میں وہی نشتر ہیں جو میر سے منسوب کیے جاتے ہیں''۔3 اور جنھوں نے عشرت لکھنوی، شفق عماد پوری، وحشت کلکتوی، سیماب اکبر آبادی اور دل شاہ جہاں آبادی جیسے اساتذۂ فن سے کسب فیض کر کے اپنی شاعری کو معتبر بنایا تھا۔

سلطان اختر ایک غیر معمولی صلاحیت کے حامل شاعر تھے اور ان کا یہ وصف ان کے ابتدائی زمانے ہی میں ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ سردار جعفری نے ان کی ایک غزل کو 1967 کے رسالے سہ ماہی گفتگو، جلد 2 صفحہ 304 پر ان شعرا کے ساتھ شائع کیا جن کے تعلق سے ان کا خیال تھا کہ: ''اس میں لکھنے والے وہ جدید تر ادیب ہیں، جو تذبذب، تشکیک اور بے دلی کی نیم تاریک، نیم روشن فضاؤں سے گزر رہے ہیں، اگر وہ پرانی اقدار سے مایوس ہیں تو یقیناً ان کے دل میں نئی اقدار کی روشنی موجود ہے اور ایک نہ ایک دن وہ اس روشنی کو تلاش کر لیں گے۔ اردو ادب کا مستقبل ان کے وجود سے تابناک ہے۔'' (سرورق کے پیچھے کے صفحہ سے) واضح ہو کہ مذکورہ غزل کا مطلع: شب انتظار ہے دوستو غم دوستاں کو طلب کرو- کوئی شرح گیسوئے خم بہ خم، کوئی مدح عارض و لب کرو۔ بطور خاص توجہ کا مرکز بنا اس غزل کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

شب انتظار ہے دوستو غم دوستاں کو طلب کرو
کوئی شرح گیسوئے خم بہ خم کوئی مدح عارض و لب کرو
تمھیں شوق ہے تو بہ شوق مجھ پہ نگاہ غیظ و غضب کرو
اگر اور بھی ہے کوئی ستم جو نہ کر سکے ہو تو اب کرو
کوئی امتحان وفا تو لو کسی قتل گہہ کا پیام دو
صف سرفروشاں ہے منتظر سر دار ان کو طلب کرو
نہ کروں گا شکوۂ بے رخی نہ شکایت غمِ عاشقی
مرے حال پر نگہ کرم تمھیں اختیار ہے جب کرو

اس غزل سے متاثر ہو کر کیفی اعظمی نے بھی اسے اپنے ہفتہ وار بلٹز (BLITZ) میں اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔4 علاوہ ازیں 1967 میں شمس الرحمٰن فاروقی اور حامد حسین حامد نے ''نئے نام'' کے عنوان سے، شب خون کتاب گھر الہ آباد سے، جدید شاعروں کا جو انتخاب شائع کیا اس میں بھی صفحہ 79 پر سلطان اختر کی غزل شامل ہے:

سلطان اختر کی غزلیں ان رجحانات و میلانات کی نمائندگی کرتی ہیں جو آزادی کے بعد ابھرنے والے نئے ادبی و شعری مزاج و منہاج سے عبارت ہیں۔ خود 'نئے نام' کے مرتبین میں سے ایک یعنی حامد حسین حامد نے اپنے انتخاب کے تعلق سے اس امر کی وضاحت کی تھی کہ ''نئے نام'' میں ہندوستان کے ہر اس اردو شاعر کا منتخب کلام شامل ہے جس کو 1960 کے بعد جانا پہچانا گیا ہے یا جاننے پہچاننے کی کوشش کی گئی ہے اور جس کا لب و لہجہ اور سوچنے سمجھنے کا انداز نیا ہے۔ ''نئے نام'' کی رعایت سے نو واردان بساط شاعری کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔''5

یہ بات درست ہے کہ سلطان اختر کی وقت شناس نظر نے اس بات کا احساس وادراک کرلیا تھا کہ اردو شاعری بالخصوص اردو غزل کے جدید تقاضے کیا ہیں؟ اگرچہ ان کی تربیت غزل کے کلاسیکی اور روایتی ماحول میں ہوئی تھی لیکن انھیں اس امر کا سراغ مل گیا تھا کہ وہ اپنے فکری وفنی رویّے میں کون سی تبدیلی لائیں کہ وہ زمانے کی رفتار کے ساتھ قدم ملا کر چل سکیں۔ لہٰذا انھوں نے کلاسیکی بنیاد پر ہی اپنے جدید رنگ وآہنگ کی داغ بیل ڈالی۔ کلاسیکی شاعری کے عرفان نے انھیں نئے راستے پر چلنے میں معاونت بھی کی اور بے راہ روی کا شکار ہونے سے بھی بچایا۔

سلطان اختر کے تینوں مجموعہ کلام یعنی انتساب (1994)، غزلستان (2014) اور برگ خوش رنگ (2016) کے مطالعے سے اس بات کا ثبوت بہم پہنچ جاتا ہے کہ سلطان اختر ابتدا سے لے کر اخیر زمانے تک سنجیدگی، شائستگی اور متانت کا دامن تھامے رہے اور انھوں نے سطحی، مبتذل اور سوقیانہ خیالات سے اپنے کشکول سخن کو پر نہیں کیا۔ جدیدیت سے متاثر شعرا جب فکری وفنی دیوالیہ پن میں مبتلا ہوکر تجربے کے نام پر الم غلم بک رہے تھے۔ بلکہ غالب کے لفظوں میں یہ کہہ رہے تھے کہ:

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

اس زمانے میں بھی سلطان اختر نے قلم کا تقدس اور اس کی عظمت کو قائم رکھا اور اس طرح کی شاعری سے اغماض کا رویہ اپنایا۔

چوں کہ سلطان اختر غزل کے رمز شناس تھے، اس لیے انھوں نے وہ اسلوب اور وہ لہجہ اپنایا جو غزل کے مزاج سے مطابقت رکھتا ہو۔ وہ جدیدیت یا جدت پسندی کی دھن میں بہہ کر غزل کو اس کے اصل محاسن سے مبرّا کرنے کے قائل کبھی نہیں رہے بلکہ اس رنگ سخن کو بروے کار لانے کے خواست گار رہے جس میں روایت کے مستحسن نقوش بھی ہوں اور طرز جدید کی نیرنگی بھی۔ یعنی وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ:

''جلتا رہا چراغ ہمیشہ چراغ سے''

سلطان اختر مشرقی بلکہ ہندوستانی تہذیب کے پروردہ ہیں اور انھیں اپنی تہذیب کا تقدس ہمیشہ دامن گیر رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ عموماً ان جذبات وخیالات کو شعری جامہ پہنانے سے گریز کرتے ہیں جو ہندوستانی تہذیب وروایت کی رو سے مستحسن نہیں۔ یا اگر ایسے خیالات وجذبات کو شعری قالب میں ڈھالتے بھی ہیں تو فنّی چابکدستی کے ساتھ کہ اُن کے اظہار وبیان میں عریانیت وبرہنگی کا عنصر نہ در آئے۔

نئی غزل میں جنسی معاملات ومسائل کی بھی عکاسی ہوتی رہی ہے۔ اس میں روح کے ساتھ ساتھ جسم کے تقاضوں کو بھی مدنظر رکھے جانے کی مثالیں ملتی ہیں، اور اس کا سبب یہ ہے کہ زندگی کی بنیاد روح اور جسم دونوں کے اشتراک پر ٹکی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احمد مشتاق کہتے ہیں:

زندگی معرکہ روح و بدن ہے مشتاق
عشق کے ساتھ ضروری ہے ہوس کا ہونا

سلطان اختر نے جنسی معاملات سے متعلق مضامین بڑی فنکاری کے ساتھ اپنی غزلوں میں باندھے ہیں جس سے ان کی فنی مہارت آشکار ہوتی ہے۔

سلطان اختر کی غزلوں کا مطالعہ کرنے سے یہ شق بھی ابھرتی ہے کہ ان کے یہاں اپنے کسی محبوب کے کھو جانے کا درد بھی ہے جو انھیں ہمہ وقت پریشان کیے رکھتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ بچھڑنے والا شخص غزل کا روایتی معشوق ہو، وہ ان کے گھر کا کوئی فرد بھی ہوسکتا ہے جس کی جدائی میں ان کا حساس دل سیماب کے مانند تڑپتا رہتا ہے اور وہ سوز وگداز میں ڈوبے ہوئے پُر اثر اشعار کہتے ہیں:

عمر بھر بیٹھ کے رونا کوئی آسان نہیں
اپنی یادیں بھی لیے جا او بچھڑنے والو
جن کی یادوں سے ہیں شاداب لہو کی شاخیں
لوٹ کر پھر نہ وہ خوش رنگ زمانے آئے
گزر سکا نہ ترے انتظار کا موسم
کہ طاق دل پہ ابھی تک چراغ جلتا ہے
میں بجھ چکا ہوں سر شام انتظار مگر
مری نگاہ میں اب تک چراغ جل رہے ہیں

سلطان اختر کی شاعری عصری حسّیت کی شاعری ہے، اور انھوں نے اپنے نگار خانۂ فن میں حسن وعشق کی روایتی تصویریں نہ کے برابر سجائی ہیں، لیکن ان کی غزلوں میں چند اشعار ایسے بھی مل جاتے ہیں جو حدیث دل بیان کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، سلطان اختر ایک ماہر فن شاعر ہیں اور انھیں ہر طرح کے مضامین میں امتیازی واختصاصی پہلو نکالنے کا ہنر آتا ہے۔ اس لیے وہ حسن وعشق پر مبنی مضامین شعر میں بھی ایک خاص رنگ پیدا کر لیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بہت دنوں پہ اسے آج غور سے دیکھا
پتا چلا کہ نہیں وہ بھی اپنے جیسا اب
بے تعلق رہے برسوں تو کوئی بات بھی تھی
ان دنوں تم سے نہ ملنے کا سبب کچھ بھی نہیں
آنکھوں کے آئینے میں نیا خواب آئے گا
جب روبرو وہ پیکر شب تاب آئے گا

محولہ اشعار اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ سلطان اختر نے تفکر وتفلسف کے دام فریب میں آکر عشق کی لطیف سرمستی سے اپنے آپ کو محروم نہیں رکھا ہے بلکہ اپنے نگار خانہ غزل میں انسان کی جبلّی صفت عشق کی نقش گری کا اہتمام کیا ہے۔ یعنی وہ اپنی شاعری میں عشقیہ مضامین کی پیش کش کو شجر ممنوعہ تصور نہیں کرتے، لیکن وہ عشق کے مختلف پہلوؤں کے بیان میں انفرادی طریق کار استعمال میں لاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے عشقیہ اشعار بھی اپنی مثال آپ ہوجاتے ہیں۔

سلطان اختر نے اپنی غزلوں میں ذات سے لے کر کائنات تک کے معاملات ومسائل کی ترجمانی کی ہے۔ جہاں ان کی غزلوں میں ان کے ذاتی درد وغم کا اظہار ملتا ہے وہیں ان کے عہد کے سماجی، تہذیبی اور ثقافتی آثار وکوائف بھی جلوہ ریز دکھائی دیتے ہیں۔ سلطان اختر نے خواہ ذاتی درد وغم ہوں یا معاشرے کے مسائل ان کو اس طرح اپنی غزلوں کا حصّہ بنایا ہے کہ وہ شعری محاسن سے مملو ہوگئے ہیں۔ انھوں نے بعض ترقی پسند شاعروں کی طرح نہ تو شاعری کو اپنے مخصوص نظریے کے پروپیگنڈے کے ذریعے بنایا اور نہ ہی نام نہاد جدیدیوں کی طرح انفرادیت کے نام پر اس میں ایسی رمزیت واشاریت کو داخل کیا کہ شاعری پر مہمل ہونے کا گمان گزرنے لگے۔ سلطان اختر نے اس مقام پر شاعری کو برہنہ گفتاری سے بھی بچایا اور اس میں مہملیت بھی پیدا ہونے نہیں دی۔ داخلیت غزل کی روح ہوا کرتی ہے اور سلطان اختر کے یہاں یہ بدرجہ اتم پائی جاتی ہے جس کا اندازہ ان کی غزلوں کے مطالعے سے بہ خوبی ہوجاتا ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں معاشرتی سطح پر جو شکست وریخت اور تغیر وتبدل کا عمل شروع ہوا اور اسی کے ساتھ شہر کاری (Urbanization) کی وبا آئی جس نے انسان کے اندر سے معصومیت، سادگی اور بھولے پن کو

دھیرے دھیرے معدوم کر کے اس کی جگہ عیاری، مکاری اور دغا بازی بھر دی۔ اس کی وجہ سے معاشرے کے مزاج میں بھی تبدیلی آئی اور انسان کو ایسی زندگی جینے پر مجبور ہونا پڑا جس میں حقیقت کم اور تصنع زیادہ تھا۔ اس مصنوعی ثقافت کے اثرات نے انسانی تعلقات کو کاروباری بنا دیا اور انسان کے اندر سے ہمدردی و مروت دھیرے دھیرے جاتی رہی اور ہر رشتے کو سود و زیاں کے پیمانے سے ناپا جانے لگا۔ اس صورت حال کی عکاسی سلطان اختر نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کی ہے:

سب کچھ بدل گیا ہے زمانے کے ساتھ ساتھ
اب میں بھی خاک سود و زیاں چھاننے لگا
چراغ قرب روشن ہے، نہ فرقت کی سحر قائم
تعلق اس سے پھر بھی ہے بہ انداز دگر قائم
کوئی بھی شہر میں کھل کر نہ بغل گیر ہوا
میں بھی اکتائے ہوئے لوگوں سے اکتا کے ملا

شہر کاری کی وجہ سے بکھری ہوئی آبادی ایک جگہ سمٹنے لگی اور اس کی خانگی و عائلی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے اپنائے گئے۔ اسی کے ساتھ روز افزوں بڑھتی ہوئی انسانوں کی تعداد نے یہ ستم ڈھایا کہ پیڑ پودے تیزی سے کاٹے جانے لگے جس کے اثرات اس ارض گیتی پر منفی انداز میں مرتب ہوئے۔ سلطان اختر نے اپنے اشعار کے ذریعے اس صورت حال کی بھی عکاسی کی ہے:

درختوں کا لہو شامل ہے شاید
ہوا کا ذائقہ بدلا ہوا ہے
ہرا شجر نہ سہی خشک گھاس رہنے دے
زمین کے جسم پہ کوئی لباس رہنے دے
خوشنما آبی پرندے ہیں نہ کھلتے ہیں کنول
کائی جم کر رہ گئی ہے گاؤں کے تالاب میں
سورج میں دھوپ پیر میں سایہ نہیں رہا
اب موسموں کا ذائقہ اپنا نہیں رہا

بہر حال شہر کاری نے جہاں ہمارے داخلی معاملات کو متاثر کیا وہیں خارجی مظاہر کو بھی۔ اشعار بالا میں جس تہذیبی زوال کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے شاعر روز نبرد آزما ہوتا ہے اور اس کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ تہذیب کی عظمت رفتہ کو از سر نو بحال کیا جائے۔ لیکن اس کی شاخ تمنا برگ و بار نہیں لاتی، کیوں کہ زمانے کی رفتار کو روکا نہیں جا سکتا ہے، لہٰذا وہ کہہ اٹھتا ہے:

لاکھ تہذیب کے غاروں میں چھپے ہم اختر
پھر بھی عریانیت وقت سے دامن نہ بچا

سلطان اختر کے یہاں ہر بڑے فنکار کی طرح خود داری اور انانیت بھی ملتی ہے۔ اس خودداری اور انانیت کو تکبر اور خود پسندی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خودداری اور انانیت کا جذبہ انھیں معیار انسانیت و میزان شرافت سے گرنے نہیں دیتا اور وہ ہر حال میں کردار کی رفعت کو بحال رکھتے ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس انانیت و خودداری کا تعلق صرف شاعرانہ اظہار سے نہیں ہے، بلکہ ان کی اپنی زندگی سے بھی ہے۔

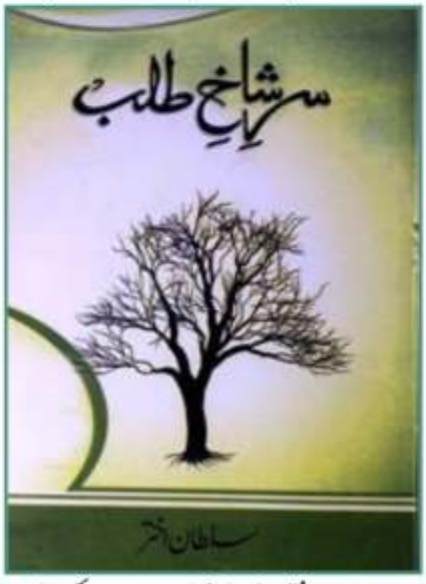

سلطان اختر نے اپنی غزلوں میں ایسے بھی اشعار کہے ہیں جن کا تعلق اخلاقیات سے ہے۔ اخلاقیات کا موضوع ہماری کلاسیکی غزل کا جزو لاینفک رہا ہے اور اس کے آثار و علامات ہماری شعری روایات میں عموماً مل جاتے ہیں۔ اخلاقیات پر مبنی سلطان اختر کے اشعار ملاحظہ ہوں:

محنت بہت ضروری ہے محنت کیا کرو
چھونا ہے آسماں تو ریاضت کیا کرو
کب تک بسر کرو گے مصاحب کی زندگی
حق گوئی کی بھی تھوڑی جسارت کیا کرو
دن بھر کی بھاگ دوڑ سے فرصت نکال کر
دل کو سکوں ملے گا ، عبادت کیا کرو
رزق حلال نعمت عظمیٰ سے کم نہیں
نان جویں ملے تو قناعت کیا کرو

سلطان اختر کی غزل گوئی پر شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک مضمون ''سلطان اختر کی غزل'' (1987) میں یہ اعتراف کیا تھا کہ ''سلطان اختر کی آواز جدید اردو غزل کی سب سے توانا اور نمایاں آواز ہے''6

جب 1914 میں ان کا دوسرا مجموعہ کلام زیور طبع سے آراستہ ہوا تو فاروقی صاحب مرحوم اپنی رائے کا اعادہ کرتے ہوئے اپنے موقف پر قائم رہے، اسی کے ساتھ انھوں نے یہ رائے بھی دی کہ اب جب فنی اعتبار سے قحط الرجال کا زمانہ ہے اور اکثر لوگ شاعری کی فنی باریکیوں سے نابلد ہیں تو ایسے وقت میں سلطان اختر معیاری شاعری کر رہے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے انہی کی زبان میں ملاحظہ فرمائیں:

''بیس برس سے کچھ اوپر ہوتے ہیں، میں نے سلطان اختر کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ غزل کی دنیا میں ان کی آواز آج کی سب سے زیادہ توانا آوازوں میں شمار ہوتی ہے۔ آج جب ان کا نیا مجموعہ سامنے ہے، مجھے اپنی پرانی رائے پر نظر ثانی کرنے یا اسے بدلنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ گذشتہ دو دہائیوں میں ہمارا ادب کئی طرح کی افراتفری کا شکار رہا ہے۔ جگہ جگہ اچھی شاعری کا بازار اونچا ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ مایوسی ہی نہیں، بعض اوقات تو ڈر لگتا ہے کہ ہم پر کیا برا وقت آ پڑا ہے۔ روز مرہ کی معمولی باتوں، اخباری مشاہدوں، ٹی۔وی کی خبروں اور بازار کی گپ شپ کو کمزور الفاظ میں منظوم کر دینے کا نام شاعری قرار پایا ہے..... کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگوں نے شعرا اور غیر شعرا اور اخباری بیان، شعر اور منظوم خبر نامہ کے درمیان فرق کرنا چھوڑ دیا ہے..... سلطان اختر کا دم غنیمت ہے کہ فن کی ناقدری کے اس دور میں بھی انھوں نے اپنی آواز کی قدر و قیمت برقرار رکھی ہے۔''7

یہ سچ ہے کہ سلطان اختر نے اپنی غزل گوئی میں جدت پسندی کو روا رکھا لیکن انھوں نے روایت سے کبھی غفلت نہیں برتی جس کی وجہ سے ان کے یہاں ایک قسم کا اعتدال و توازن پایا جاتا ہے جس کا مشاہدہ ان کی ترکیب سازی کے عمل میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ غزل گوئی کے مرحلے میں لفظوں کو اس طرح ترکیبی پیرہن عطا کرتے ہیں کہ ان میں حرکی توانائی پیدا ہو جاتی ہے اور جس سے ان کی غزلوں میں معنوی سطح پر وسعت اور صوتی اعتبار سے خوش آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی غزلیں جہاں دعوتِ فکر دیتی ہیں وہیں سماعت کو بھی بھلی لگتی ہیں۔ ان کی شاعری میں مستعمل تراکیب لفظی کے چند نمونے مشتے از خروارے کے طور پر ملاحظہ ہوں:

کاسۂ دل، عکس ہوس، سیل تشنگی، زخم اذیت، شہر گریاں، ابر گریزاں، روزن امکان، پیراہن غبار، لذت آزار، پیراہن جاں، گل مدعا، صحن احساس، کسب تمازت، شاخ طلب، شاخ تمنا، کشت تمنا، حصار تمنا، شور سگان، حصار جاں، عکس شناسائی، عکس معتبر وغیرہم۔

یہ فارسی تراکیب ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے جابجا ہندی تراکیب کا بھی استعمال کیا ہے جس سے ان کی تخلیقی قوت اور زبان پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے، ساتھ ہی اس امر کی بھی وضاحت ہوجاتی ہے کہ انھوں نے اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کلاسیکی اصول فن کو بجا طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدیدیت کے رجحان سے وابستہ شدت پسند شاعروں کی طرح اُن کے یہاں لسانی اعتبار سے شکست وریخت کا رویہ نہیں پایا جاتا ہے۔

سلطان اختر ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے چھوٹی بڑی اور متوسط ہر طرح کی بحروں میں کامیاب غزلیں کہی ہیں۔ ان کی غزلوں کے مطبوعہ کلیات ''سرشاخ طلب'' میں ایسی غزلیں مل جاتی ہیں جو میرے دعوے کی تصدیق کرتی ہیں۔ بڑی بحر میں ان کی ایک غزل کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

ڈوبتی ساعتوں کی طرح ایک دن سب کی آنکھوں سے روپوش ہوجائے گی/ بے بسی کی کڑی دھوپ ڈھلنے تلک زندگی گرم پتھر پہ سوجائے گی/ کچھ دنوں تشنگی کی سزا کاٹیے ، یوں ہی چاروں دشاؤں کے لب چاٹیے/ پانچویں سمت سے آنے والی گھٹا ، ریب کی خشک چادر بھگو جائے گی

متوسط بحروں کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

دیواریں عکس ریز ہیں ، در آئینے کا ہے
پتھر کے شہر میں مرا گھر آئینے کا ہے
خالی ہے طلب گاروں سے بازارِ تمنا
آتا ہی نہیں کوئی خریدارِ تمنا
فرصت میں رہا کرتے ہیں فرصت سے زیادہ
مصروف ہیں ہم لوگ ضرورت سے زیادہ

اسی طرح چھوٹی بحروں میں کہے گئے یہ اشعار بھی دیکھیے:

پچھلا موسم جب یاد آئے
سب کو سب کا سب یاد آئے
بوڑھوں کو چوپال کی رونق
بچوں کو مکتب یاد آئے
تمام دن رات پر شکستہ
سبھی کے حالات پر شکستہ
یقین چاروں طرف منور
سیاہ شبہات پر شکستہ

سلطان اختر کی اکثر غزلوں میں از اول تا آخر احساسات وکیفیات کی وحدت وہم رنگی پائی جاتی ہے۔ غزل اگرچہ ریزہ خیالی کا فن ہے اور اسی وجہ سے یہ معتوب ومغضوب بھی رہی، لیکن بعد کے زمانے کے شعرا نے اس طرف خاص طور سے توجہ دی جس کے باعث غزل کے اشعار میں احساسات وخیالات کی وحدت ہونے کے امکانات روشن ہوئے اور ایسی غزلیں کہنے کا رواج ہوا جن میں فکری نہیں تو حسی وکیفیاتی وحدت ضرور پیدا ہوگئی۔ سلطان اختر کے یہاں بھی یہ وصف پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے ایسی غزلیں بھی کہیں ہیں جن کو غزل مسلسل کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً ایک غزل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ان کا وعدہ یاد آیا تو اپنا وعدہ بھول گیا
وقت سے پہلے دل کی باتیں دل دیوانہ بھول گیا
شب بیداری، بزم کی رونق، شعر وسخن کی یاد نہیں
دنیاداری میں پھنس کر میں اپنی دنیا بھول گیا
شہر تمنا کے دامن میں دشت بلا آباد ہوا
روتی آنکھیں یاد ہیں اب میں ہنستا چہرہ بھول گیا
کھیت، کنواں، شہتوت کی ڈالیں، پگڈنڈی، برگد کی چھاؤں
کچھ بھی مجھ کو یاد نہیں، میں سب کچھ اپنا بھول گیا

سلطان اختر کی غزل کی گوئی کے اس اجمالی جائزے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں بے پناہ تخلیقی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام پڑھ کر ایسا نہیں لگتا کہ انھوں نے شعر نہیں کہے ہیں بلکہ شعر گڑھے ہیں۔ یعنی شعر گوئی اور شعر سازی میں فرق ہوتا ہے جس کو سلطان اختر کی غزلوں کے مطالعہ سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔

المختصر یہ کہ سلطان اختر کی شاعری کلاسیکی روایت کی مستحکم بنیادوں پر کھڑی ہے۔ اس میں اصول شعر وسخن کی بجا طور پر پابندی کی گئی ہے۔ انھوں نے شعری اصول کو حتی الوسع برتتے ہوئے نئے رنگ وآہنگ اور جدید طرز واسلوب کی شاعری کی ہے۔ ان کی غزلوں میں روانی ہے۔ الفاظ کے دروبست اور ترکیب سازی کے عمل میں وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ غزل کے نازک آبگینے کو ٹھیس لگنے نہ پائے۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی موسیقیت وغنائیت ہے۔ اُن کی شاعری کسی مخصوص ادبی وسیاسی نظریے کی تابع نہیں۔ ان کی شاعری میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کی اعلیٰ قدریں سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان کے یہاں معنوی وسعت اور فکری تنوع پایا جاتا ہے۔ ان کی جمالیاتی حس بیدار ہے جس کے باعث ان کی غزلوں میں جمالیاتی کیفیت کا وفور ہے جو دل ودماغ کو راحت بخش فضا سے ہمکنار کرتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سلطان اختر کی شاعری میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جن کے باعث وہ صدیوں تک اپنی اہمیت ومعنویت قائم رکھے گی۔

20 اپریل 2021 کو پھلواری شریف پٹنہ، بہار میں اردو کے اس مایہ ناز غزل گو کی وفات ہوگئی اور وہیں کے حاجی حرمین قبرستان میں ان کے جسد خاکی کو سپرد خاک کیا گیا۔ غزل کے علاوہ انھوں نے دیگر اصناف شاعری میں بھی طبع آزمائی کی لیکن ان اصناف پر مبنی ان کا سرمایہ سخن منظر عام پر نہیں آپایا ہے۔ ان کے تمام سرمایہ سخن کو مدون کرکے منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے تاکہ ان کے شاعرانہ عظمت میں مزید اضافہ ہو۔

حوالہ جات

1 تاریخ ادب اردو (جلد سوم) وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2007 ص 57-1758
2 سہ ماہی بھاشا سنگم جنوری تا جون 2023 گوشہ سلطان اختر، اردو ڈائرکٹوریٹ، بہار پٹنہ، ص 29
3 مانوس کی شاعری، مشمولہ کلیات مانوس، مرتبہ افضل حسین مانوسی، دی آرٹ پریس، سلطان گنج پٹنہ 1985 ص 13
4 شاعری کا گوہر نایاب، (مضمون) مصنفہ ارمان نجمی، مشمولہ سلطان اختر: جدید اردو غزل کی معتبر آواز، مرتبہ: ڈاکٹر یاسمین بانو، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی 2016 ص 59
5 نئے نام، مرتبین: حامد حسین حامد، شمس الرحمٰن فاروقی، شب خون کتاب گھر، الہ آباد، 1967، ص 30
6 معرفت شعر نو: شمس الرحمٰن فاروقی، الانصار پبلیکیشنز، حیدرآباد، 2010، ص 299
7 غزلستان، سلطان اختر، ارم پبلیکیشنز، پٹنہ 2014 ص 13، 14

Dr. Zafrullah Ansari
Assistant Professor, Department of Urdu,
Allahabad University,
Prayagraj, (U.P)
Pin-211002
Mob.: 8853579247

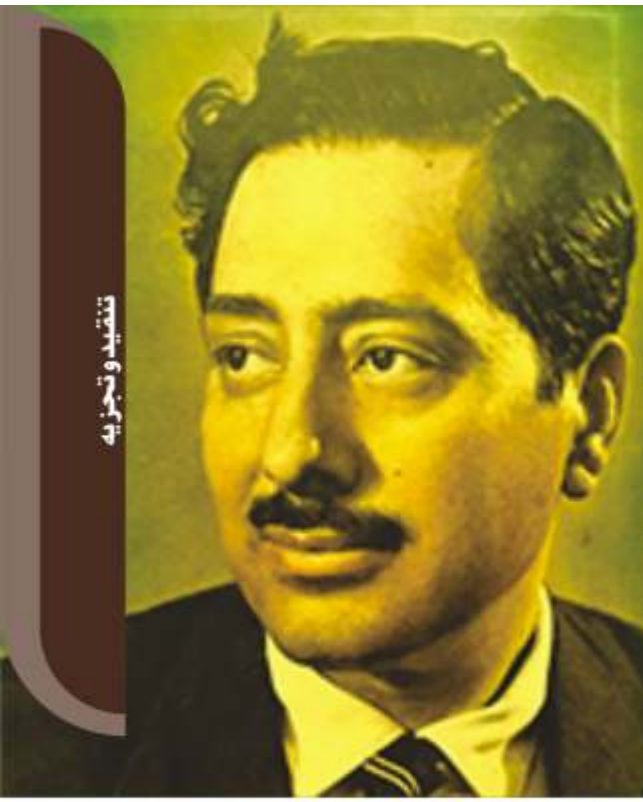

سریش کمار

پریم ناتھ در کے افسانوں کا علامتی و سماجی مطالعہ

کشمیر وہ سرزمین ہے جہاں پہاڑ خاموشی سے آنسو بہاتے ہیں، اور جھیلوں کی لہریں صدیوں پرانے دکھ درد کی کہانیاں سناتی ہیں۔ یہ صرف خوبصورت نظاروں کا نام نہیں، بلکہ علم و ادب کا وہ سمندر ہے جس کی لہریں ہمارے دلوں کو ہمیشہ سے لرزاتی رہی ہیں۔ اس سمندر کا ایک انمول موتی ہیں پریم ناتھ در۔ پریم ناتھ در 25 جولائی 1914 کو سری نگر کے تاریخی علاقے حبہ کدل میں پیدا ہوئے۔ سری نگر کی مٹی سے نکلے، جیسے کوئی ستارہ آسمان پر چمکا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے ادب کی روح کو جاگزیں کر دیا۔ خیالی قصوں کی بجائے انھوں نے اپنے لوگوں کے زخموں کو کاغذ پر اتارا۔ پریم ناتھ در وہ درد بھرے آئینہ تھے جنھوں نے ہمیں خود کو دکھایا۔ ان کے بغیر کشمیر کی ادبی کہانی ایک ادھوری سی آرزو کی طرح، ہمیشہ تکلیف دیتی رہے گی۔ ان کی تحریریں آج بھی ہمارے دلوں میں بسے دکھ کو چھو لیتی ہیں، اور یاد دلاتی ہیں کہ سچا ادب وہی ہے جو روح کو جھنجھوڑ دے۔

پریم ناتھ در سری نگر کی تنگ گلیوں میں پلتا ہوا، ان لمحوں کو دیکھتا رہا جہاں غریبوں کی آہیں آسمان کو چھوتی تھیں اور امیروں کی ہنسی پہاڑوں سے ٹکرا جاتی تھی۔ بچپن کی وہ سانسیں جو برفیلی ہواؤں میں لپٹی ہوئی تھیں، اس کے دل میں ایک آگ جلانے والی تھیں غریبوں کی آواز بننے کی۔ کم عمری میں ہی والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، تو چچا شوجی در نے انھیں اپنے پاس پناہ دی اور پھر دیگر سرپرستوں نے ان کی پرورش کی۔ بچپن کے یہ تلخ صدمے ان کی روح پر گہرے زخم چھوڑ گئے، مگر یہی درد ان کے فکری جہاز کو نئی بلندیوں پر لے گیا اور تخلیقی شعلے کو سمو دیا۔ پریم ناتھ در صاحب نے ایس۔ پی مڈل اسکول فتح کدل سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر سری پرتاپ ہائی اسکول سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کر کے خوابوں کی طرف قدم بڑھایا۔ ایس پی کالج سری نگر میں بیچلر آف آرٹس کی ڈگری لیتے ہوئے، پریم ناتھ در نے فلسفہ، انگریزی، تاریخ اور اردو کو اپنا شعبہ بنایا۔ یہ مضامین اس کی روح میں گھل مل گئے، جیسے کشمیر کی مٹی میں پھلنے والے چنار کی جڑ۔ لیکن دل کی پکار اور تھی۔ ان کا دل کہتا تھا کہ سماجی انقلاب کی لہر میں بھی روایات کی مہک برقرار رہنی چاہیے۔ ترقی پسند تحریک کے پرجوش حامی تو تھے، لیکن خالی نعروں اور جھوٹی جذباتیت سے دور۔ ان کے نزدیک ادب کا اصل رنگ عام آدمی کی جدوجہد، اس کے دل کی کشمکش اور زندگی کی کچی حقیقتوں میں چھپا ہے ایک ایسی کہانی جو روح کو جھنجھوڑ دے۔

روزگار کی بھاگ دوڑ میں لاہور کے دروازے پر دستک دی جہاں تحریکِ آزادی کی آگ میں شامل ہو گئے۔ پیسے کی تنگی نے انھیں توڑنے کی کوشش کی، مگر وہ اخبارات کے لیے کشمیر کی سیاسی بہار و خزاں پر دل ہلا دینے والے مضامین لکھتے رہے، لاہور میں اردو کے بڑے ادیبوں اور صحافیوں سے ملاقاتیں ہوئیں، جو ان کی روح میں اردو ادب کی محبت کو مزید گہرا کر گئیں۔ یہی لمحات بعد میں ان کے افسانوں میں فکری گہرائی اور وسعت کی صورت میں جھلکے۔ 1940 میں دہلی کے رام لیلا میدان میں ان کی ایک تقریر نے کشمیری پنڈتوں کے دلوں میں طوفان برپا کر دیا۔ اسی جادو سے تدریسی ذمہ داریاں ملیں اور پھر زندگی کا سب سے خوبصورت موڑ آیا للتا دیوی بھٹ سے شادی کا۔ سرکاری نوکری کی بجائے انھوں نے صحافت اور ادب کو اپنا جنون بنا لیا۔ ہندوستان ٹائمز اور اسٹیٹسمین (Statesman) جیسے بڑے اخبارات نے ان کی پہچان کو چار چاند لگا دیے۔

اردو افسانے کی تاریخ میں پریم ناتھ در وہ ستارہ ہیں جس نے اسے نئی جہتیں دیں، فکری اور فنی دولت سے نوازا۔ وہ ایک ایسی میراث ہے جو آج بھی دلوں کو چھوتی ہے۔ اگرچہ پریم ناتھ در کی زندگی کا بڑا حصہ کشمیر سے دور گزرا، مگر انھوں نے کبھی اپنے وطن کو دل سے نہ نکالا۔ افسانے لکھنے کا آغاز انھوں نے دیر سے کیا، لیکن جب قلم اٹھایا تو ایسی کہانیاں تخلیق کیں کہ نامور افسانہ نگار بھی دنگ رہ گئے۔

پریم ناتھ در کے افسانے دل کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں، جہاں کشمیر کی مٹی کی سانس اور یہاں کے غریب عوام کی آنسو بھری کہانیاں گونجتی ہیں۔ انھوں نے کشمیر کی پھولوں بھری وادیوں کی چمک دمک سے زیادہ ان تلخ سچائیوں کو اجاگر کیا ہے، جہاں معصوم لوگ ظلم کی زنجیروں میں جکڑے کراہ رہے تھے۔ کسانوں کی خستہ حالی کی چیخیں، بے بس کشمیریوں کی بے چینی،

اور سیاسی، سماجی، تہذیبی زندگی کی تیز دھڑکنیں یہ سب ان کہانیوں کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں، جیسے کوئی درد بھرا گیت گا رہا ہو۔ ان کے کردار تو ہمارے ہی پڑوسی کسان ہیں، جن کی آنکھوں میں خواب ٹوٹنے کی کہانی چھپی ہے۔ افسانے پڑھو تو لگتا ہے زندگی ہمارے سامنے سانس لے رہی ہے، ہنستی، روتی، جدوجہد کرتی ہوئی، پریم ناتھ در کا پہلا افسانوی مجموعہ 'کاغذ کا واسدیو' 1947 میں دنیا کے سامنے آیا، دل کو ہلا دینے والے افسانوں کا خزانہ! اسے پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ در نے کشمیر کی سماجی زندگی کو نہ صرف دیکھا، بلکہ اس کے دکھ درد کو اپنے خون میں اتار لیا تھا۔ دوسرا مجموعہ 'نیلی آنکھیں' 1960 میں شائع ہوا۔ ان مجموعوں کے علاوہ اور بھی ان کے بہت سے افسانے رسالوں کے صفحات میں زندہ ہیں، جو آج بھی دل کے زخموں کو چھوتے ہیں۔ ہر افسانہ بیسویں صدی کی ترقی پسند تحریک کا آئینہ تھا غریبوں کی درد بھری کہانیاں، جو پڑھنے والے کے دل کو ہلا دیتی تھیں۔ پریم ناتھ در لکھتا تھا اور اس کی تحریریں کشمیری مٹی کی خوشبو اور جدوجہد کی گرمی لیے ہوئے لوگوں تک پہنچتی تھیں۔ اس لیے جگن ناتھ آزاد نے یہ بات بڑے ادب کے ساتھ بیان کی ہے:

''پریم ناتھ در کا دل سرزمین کشمیر کی محبت سے لبریز تھا اور یہی محبت ان کے افسانوں میں رچی ہوئی نظر آتی ہے۔ انھوں نے کشمیر کے اس حسن کو بھی اپنے افسانوی ادب کے تانے بانے میں سمویا ہے جو قدرت نے فیاضانہ طور پر کشمیر کے لیے وقف کر دیا ہے اور اس افلاس، غریبی، بیکاری اور بے روزگاری کو بھی جس کا مدارا آج تک نہ حکومت ہند کر سکتی ہے اور نہ حکومت جموں و کشمیر۔''

(چناروں کے سائے میں، پریم ناتھ در، ناشر: فنکار کلچرل آرگنائزیشن، سری نگر، 1991، ص 22)

پریم ناتھ در کہتا تھا کہ میری کہانیاں زندہ لوگوں کی ہیں، جو زنجیروں میں جکڑے ہیں۔ مگر قسمت نے آخری موڑ لے لیا 6 ستمبر 1976 کو دہلی میں، وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بیٹوں نے اپنے باپ کی آخری آرزو پوری کی۔ ان کا آخری افسانوی مجموعہ 'چناروں کے سائے میں' شائع کیا۔ آج بھی جب سری نگر کی گلیوں میں کوئی کتاب کھولتا ہے تو پریم ناتھ در کی آواز گونجتی ہے۔ وہ محض ایک افسانہ نگار نہ تھے، بلکہ ایک خواب تھے جو کشمیر کی مٹی سے اگا اور دلوں میں ہمیشہ کے لیے سمایا۔

پریم ناتھ در کے افسانوں کا علامتی و سماجی مطالعہ

اردو افسانوی ادب کی کہکشاں میں پریم ناتھ در ایک ایسا روشن ستارہ ہیں جن کی چمک نے بالخصوص جموں و کشمیر کی ادبی تاریخ کو منور کیا۔ پریم ناتھ پردیسی جیسی قد آور شخصیت کے بعد اگر کسی نام نے عقیدت اور احترام کے جذبوں کے ساتھ دلوں میں دستک دی تو وہ بلاشبہ پریم ناتھ در ہی ہیں۔ اردو افسانہ بیسویں صدی میں جن تخلیقی و فکری تجربات سے گزرا، ان میں علامت، استعارہ اور سماجی شعور کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ خصوصاً تقسیمِ ہند کے بعد اردو افسانہ محض کہانی پن سے نکل کر اجتماعی کرب، تاریخی سانحات، انسانی بے معنویت

اور سماجی جبر کے اظہار کا طاقتور وسیلہ بن گیا۔ اس تناظر میں پریم ناتھ در کا نام ایک ایسے افسانہ نگار کے طور پر سامنے آتا ہے جس نے نہ صرف علامتی اسلوب کو فکری گہرائی عطا کی بلکہ سماج کے ان گوشوں کو بھی آواز دی جو عموماً خاموش اور غیر نمائندہ سمجھے جاتے تھے۔

پریم ناتھ در کا تعلق کشمیر جیسے حساس، تہذیبی اور تاریخی خطے سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں کشمیری معاشرہ، اس کی نفسیات، خوف، خاموشی، انتظار اور شکستہ خواب علامتی سطح پر بار بار ابھرتے ہیں۔ ان کے افسانے بظاہر سادہ نظر آتے ہیں، مگر ان کی تہہ میں علامتی معنویت اور سماجی کرب کی ایک پیچیدہ دنیا آباد ہے۔ ان کے افسانوں میں خوف، خاموشی، خواب، اندھیرا، انتظار اور اجنبیت جیسی علامتیں دراصل ایک اجتماعی نفسیات کی نمائندہ ہیں۔ ان کی تحریروں نے اردو ادب کے دامن کو نہ صرف نئے موضوعات سے بھرا بلکہ افسانے کے فن کو وہ شاہانہ وقار اور جذباتی گہرائی عطا کی کہ پڑھنے والا خود کو ان کی تخلیق کردہ دنیا کا ایک جیتا جاگتا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ ان کے افسانوں میں 'چناروں کے سائے میں' چنار سماجی تسلسل کا خاموش استعارہ بن کر ابھرتا ہے، 'نیلی آنکھیں' امید کے اس خواب کی نمائندگی کرتی ہیں جو حقیقت کی دہلیز پر آ کر بکھر جاتا ہے، اور کاغذ انسانی وجود کی اس نزاکت کو ظاہر کرتا ہے جو ذرا سی ضرب سے ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ یہ سب علامتیں محض فنی ہتھکنڈے نہیں بلکہ قاری کے دل میں اترنے والی ایسی صدائیں ہیں جو اندر تک لرزا دیتی ہیں۔

'کاغذ کا واسدیو' میں ہیرو کی موت ایک فرد کا انجام نہیں، بلکہ پوری کشمیری جدوجہد کا المیہ بن جاتی ہے۔ ایسا المیہ جہاں ہر لفظ سسکی بن کر بہتا ہے۔ یہ علامتی فضا معنویت کے زوال اور انسانی اقدار کی شکست کو چھوتی ہے، اور قاری کو خاموشی کے ساتھ گہرے سوالات میں ڈبو دیتی ہے، جہاں سوچ بھی آنسوؤں میں ڈھل جاتی ہے۔ 'کاغذ کا واسدیو' میں کاغذ کوئی سادہ شے نہیں، بلکہ انسانی وجود کی کربناک ناپائیداری کا دل دہلا دینے والا استعارہ ہے۔ ایک نازک سانس، جو ہر پل ٹوٹنے کو ترس رہی ہے۔ واسدیو وہ بے بس انسان ہے، جس کی شناخت تاریخ کی بے رحم آندھیوں، سیاست کے جبر اور سماج کی سنگین زنجیروں میں چپک چپک کر مٹتی چلی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی نازک کاغذ پانی کی لہروں میں ڈوب جائے، آگ کی لپٹوں میں جل کر راکھ بن جائے، یا وقت کی بے رحم انگلیوں سے چھن چھن کر بکھر جائے۔ ہر سانس میں اس کا درد، ہر نظر میں اس کی بے چینی، ہر لمحہ اس کی خاموش چیخ دل کو چیرتی ہوئی گزرتی ہے۔ ''واسدیو کی موت... ارے! یہ فرد کی موت نہیں، بلکہ انسانی وقار کی اجتماعی لہو بہا موت ہے، اقدار کی پامال شدہ لاش ہے، امیدوں کی سلگتی ہوئی راکھ ہے، اس کی اندرونی جدوجہد وہ خاموش اذیت جو روح کو کاٹتی ہے، وہ اندر کا ٹوٹا پھوٹا دل جو چیختا ہے مگر آواز نہیں بن پاتا۔''

''جب بچے برف پر چڑھنے، اترنے باہر باہر سے دوسری منزل کی کھڑکی میں کودنے، اچھلنے پھسلنے میں مصروف ہو گئے، واسدیو موقع پا کر گرم زندگی کی جستجو میں چولھے کی طرف دوڑا۔ اس نے دو کانگڑیاں بھر دیں۔ جسم کی رہی سہی گرمی کو ایک موٹی لوئی سے باندھ دیا۔ اس کی بتیسی بھی بجنے لگی اور اس کی ہڈی ہڈی کا درد بولنے لگا۔ لیکن اس نے چیخوں کو ایک بھنبھناہٹ میں دبایا جس کو سن کر تلسی اور موہن اندر دوڑے آئے اور کالی لوئی میں موٹے بھورے کو دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ تلسی اور موہن کو ہنستے دیکھ کر واسدیو کی سانس ایک لمحے کے لیے رک گئی۔ پھر اس نے بھنبھناہٹ کو اور تیز کیا۔ اپنے دانتوں کو رگڑ کر خوب بھایا اور تلسی، موہن کو اور ہنسایا لیکن کئی آہنی ہاتھ اس کی ہڈیوں کو ڈھوڑ رہے تھے، اس کی رگ رگ میں چیخ پکار تھی، اپنے بچوں کی ہنسیوں اور اپنی بھنچی ہوئی چیخوں کے درمیان اس نے پہلی بار ایک خلیج دیکھی۔ دور کمان کو کاغذ بغیر لہراتے دیکھا۔ پہلی بار اس نے چاہا کہ وہ اکیلا رہے۔ چیخے، روئے اور وہ ہنستے ہوئے دونوں آنگن میں چلے جائیں جہاں پڑوس کے اور بچے جمع ہو گئے تھے تلسی اور موہن کو للکار رہے تھے۔ برف کی جنگ کھیلنے آئے تھے۔ لیکن تلسی کو برف کے گولے کون بنا کے دیتا۔ دوسرے بچے اس سے بڑے تھے۔ وہ خود برف تیز تیز اٹھا سکتے تھے اور گولے بنا سکتے تھے۔ واسدیو نے دیکھا کہ دردوں کے پیچھے واسدیو ابھی جی رہا ہے اور کسی کو اس کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے تہ خانوں سے ایک ابال اٹھا جس نے اس کی ہڈی ہڈی کو لپیٹا اور وہ اٹھا۔ اس نے ایک جھٹکے میں آپ کو کانگڑیوں سے الگ کیا۔ لوئی اتار دی اور آنگن میں تلسی کا مورچہ لگا دیا۔ تلسی دھڑا دھڑ گولے برسانے لگی۔ واسدیو کی ایک ایک ہڈی ٹوٹنے لگی۔ گولہ اور ہڈی، ہڈی اور گولہ، واسدیو اپنے گولے بناتا گیا اور چلاتا گیا۔''

(کاغذ کا واسدیو اور دیگر افسانے، پریم ناتھ در، ص116)

واسدیو کے لیے 'برف' اب صرف ٹھنڈک نہیں بلکہ اس کی زندگی میں جمی ہوئی بے بسی اور خاموشی کی علامت بن چکی تھی، جسے اسے اپنے جذبوں کی تپش سے پگھلانا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دکھ اور بچوں کی خوشی کے درمیان حائل 'خلیج' دراصل اس کی اپنی انا اور بیماری کا خوف ہے۔ جیسے ہی اس نے جھک

افسانہ 'نیلی آنکھیں' میں پریم ناتھ در نے کشتی کو ایک گہری علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ کشتی زندگی، سفر اور غیر یقینی حالات میں انسان کی جدوجہد کی نمائندہ بن کر سامنے آتی ہے۔ اسی طرح پریم ناتھ در کے افسانوں میں برف، ڈل جھیل اور کشتی بار بار علامتی حیثیت اختیار کرتے ہیں۔

کر برف سے گولے بنائے، اس نے علامتی طور پر اپنی موت کے جمود کو توڑ کر زندگی کی حرارت کو چن لیا۔ یہ عمل ظاہر کرتا ہے کہ انسان کا حوصلہ اپنی تقدیر کے منجمد فیصلوں کو بھی پگھلا سکتا ہے۔ یوں، اس نے برف کی صورت میں موجود تلخی کو بچوں کے لیے مسکراہٹ کے کھیل میں بدل دیا۔ پریم ناتھ در نے سماجی دکھ کو اس طرح محسوس کیا:

''اچانک مجھے ایسا لگا کہ میری سانس رک گئی۔ ہاں۔ میں مر گیا ہوں شک کی کوئی وجہ نہیں تھی کیونکہ میرے کان رونے کی آوازیں صاف سن رہے تھے۔ یہ خیال کہ موت اٹل ہے دماغ سے اٹھ کر جیسے دل میں آ کر رک گیا۔ دل بھر گیا اور میں بھی رونے لگا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ میرا رونا کوئی بھی نہیں سن سکتا تھا۔ اس لیے میں نے رونے کو بے فائدہ سمجھا اور یہ جو سننے سمجھنے کی قوت باقی تھی اسی کا فائدہ اٹھانا چاہا سوچا کہ دیکھوں کہ میرے مرنے پر کون کون رو رہا ہے۔ زیادہ دکھ کسے ہوا ہے اور دیکھوں تو کس کس کو میں پیارا تھا۔

بچوں کا رونا کبھی اونچا ہو جاتا، کبھی بالکل مدہم ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے بات کو پوری طرح نہیں سمجھا تھا۔ وہ بڑوں ہی کے پیچھے ایسے چلتے تھے جیسے استاد کے پیچھے۔ مجھے ان پر رحم آیا کہ بے چارے پوری طرح نہیں جانتے کہ ان کو میرے کتنے فائدے ہیں۔ ایک اور آدمی منھ پھٹے ڈھول کی رو رہا تھا اور زیادہ تر آدمی بچوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ یہ کون تھا، میں سمجھ نہ سکا۔ وہاں میری بیوی بھی رو رہی تھی۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ اسے سننے والوں کا ڈر ہے کہ کہیں اس کی آواز عجیب سروں میں نہ نکلے کہ اسے سماج میں جینا ہے کہ اوروں کے لیے کہیں وہ ناٹک کا سین نہ بن جائے، لیکن بڑھیا ماں کا رونا ایسا تھا جیسے اسی کا سب کچھ کھو گیا ہو اور اس نے اس قسم کا شور مچا رکھا تھا کہ بہنیے کی ذرا سی بھی امید ہوتی مجھے بھی شرم آتی۔ وہ ڈاکٹروں، نرسوں اور بھگوان کو بری طرح جھنجھوڑ رہی تھی اور پھر کچھ ایسی کی آواز آنے لگی کہ لوگ بڑھیا کو گھسیٹے لیے جاتے ہیں...

ماں نے دیواروں کو پھاڑ کر مجھے پکارا اور میں ایک جھٹکے میں اٹھ بیٹھا بیٹھتے ہی میں نے دل کے آس پاس ایک شدید درد محسوس کیا۔''

(فائدہ بے قاعدہ، پریم ناتھ در، ص48,49)

پریم ناتھ در کا یہ اقتباس سماجی رویوں کی ایک انتہائی گہری اور تلخ تصویر کشی کرتا ہے۔ موت کے بعد یا موت کے تصور کے دوران کے اس مشاہدے میں مادی حقیقتوں سے زیادہ جذباتی سچائیاں نمایاں ہیں۔ پریم ناتھ در نے اس مختصر ٹکڑے سے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان جیتے جی جن رشتوں پر ناز کرتا ہے، موت کے آئینے میں ان کی حقیقت مختلف نظر آتی ہے۔ صرف ماں کا رشتہ ہی ایسا ہے جو سماجی دکھاوے اور مادی مفاد سے پاک دکھایا گیا ہے۔

افسانہ 'نیلی آنکھیں' میں پریم ناتھ در نے کشتی کو ایک گہری علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ کشتی زندگی، سفر اور غیر یقینی حالات میں انسان کی جدوجہد کی نمائندہ بن کر سامنے آتی ہے۔ اسی طرح پریم ناتھ در کے افسانوں میں برف، ڈل جھیل اور کشتی بار بار علامتی حیثیت اختیار کرتے ہیں۔ یہ علامتیں کشمیر کے فطری منظرنامے کے ساتھ انسانی کرب اور سماجی حقیقت کو جوڑ دیتی ہیں:

''کشمیری فرکارے کے سامنے ایسی کو کشتی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ شکارے کے ساتھ اس کا کیا مقابلہ؟ شکارے ایک کشش کو لے کے چلتے ہیں۔ پردوں، گدوں، اسپرنگوں کی لوریاں لے کر شائستہ سیاحوں کے لیے پر ذوق شیدائیوں کے لیے، تھکے ہوئے انسانوں کے لیے

اور یہ چیز تو ڈل کی محض سبزیاں اٹھانے کو مچھلیاں لے جانے کو پانی کا پڑوسی جھل کا جفاکش کسان گھر درے تختوں سے بنالیتا ہے اور کم بخت اس کے مہروں پر لوک تک نہیں رکھتا۔ اسی لیے ایسا لگتا ہے کہ اس پر دونوں سروں سے نہ جانے کس کی مار پڑی ہے۔ اور اس لیے یہ دور سے ایک کشتی نہیں ایک دھبہ دکھائی دیتی ہے۔

طوفان کا ایک واضح اعلان تو ہو چکا تھا لیکن طوفان اپنے پہلے قدموں پر ہی جما رہا۔ یوں تو اپنے ایک اشارے سے ہی ڈل نے اپنا میدان خالی کروا دیا تھا'' (نیلی آنکھیں، پریم ناتھ در، ص12,13)

پریم ناتھ در نے محض کہانی نہیں بلکہ تقسیم، غربت، جنس، اور طاقت کے باہمی رشتوں کا گہرا سماجی متن پیش کیا ہے:

''اسے پگڑی کے طرے کو پیچھے کی طرف پھینکنا یاد نہ رہا۔ کیونکہ دوا خانے میں آج ایک نئی بات ہوئی تھی۔ یوں تو بات معمولی تھی۔ لیکن تھی نئی۔ دھنی رام کے ڈاکٹر نے بل میں سے آٹھ آنے کم کر دیے تھے۔ مریضہ نے دردسر کی شکایت کی تھی۔ جوڑوں کے دکھنے کی قے آنے کی، دستوں کی، بخار کی اور اس بات کی کہ وہ 'رُھپو جن' ہے اور ڈاکٹر خود ایک پرکار ریفیوجی ہوتے ہوئے بھی ایک آن میں موم ہو گیا تھا اور وہ یہ دیکھ بے چین ہوا جا رہا تھا کہ لفظ 'رفیوجی' یا 'رُھپو جن' میں کوئی جادو ضرور ہے۔ جو اس کے ڈاکٹر پر بھی کارگر ہو گیا:

''رُھپو جن۔؟ ہے ذرا دیکھو تو سہی وہ ان بوتلوں سے ہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پوچھنے لگا۔ نک لیں، کڑے، ٹاپس، سونے کی چوڑیاں 'رُھپو جن' اور آٹھ آنے۔ لیکن بوتلیں جیسے بولنے لگیں کیا ہے۔ یہ تھوڑا سا سونا؟ لے کے کب تک اسے چاہیں گے اور پھر عورت یہ چیزیں اسے جان سے بھی پیاری ہوتی ہیں۔ کھانے کو طے نہ ملے۔ یہ تو سہاگ ہوا سہاگ .... سہاگ ایک بوتل میں سے جیسے تیزاب اُچھلا اور دھنی رام کے اندر اترنے لگا۔ اترتا گیا اور کھودتا گیا۔ وہ بھی! خود وہ بھی تو کسی کا سہاگ تھا!!!'' (نیلی بوتل، پریم ناتھ در، ص351)

پریم ناتھ در بتاتا ہے کہ تقسیمِ ہند کے بعد کا سماج اندر سے کتنا ٹوٹا ہوا ہے۔ مہاجر ہونا انسان کی عزتِ نفس کو زخمی کر دیتا ہے، وہاں انصاف کی جگہ صرف ترس رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر اور طبی نظام بھی سماج کے دباؤ میں آ کر انصاف نہیں کر پاتے اور ان کی اخلاقی کمزوری سامنے آجاتی ہے۔ عورت کے زیورات یہاں صرف سینگار نہیں بلکہ اس کی عزت، تحفظ اور بیوی ہونے کی پہچان کی علامت بن جاتے ہیں۔ دھنی رام کے دل کی گھبراہٹ سے مرد کی خود پسندی، اس کا خوف اور اس کے ضمیر کی لڑائی صاف نظر آتی ہے۔ اس سارے متن میں اصل بیماری جسم کی نہیں بلکہ سماج کے اندر کی اخلاقی اور طبقاتی سڑن ہے، جو تقسیم کے بعد کے عہد کا سب سے بڑا دکھ ہے۔

پریم ناتھ در کے افسانوں کو غور سے پڑھیں تو احساس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں ٹوٹے ہوئے رشتے صرف چند افراد کے ذاتی دکھ نہیں ہیں، بلکہ پورے سماج کی ٹوٹ پھوٹ کا نشان بن جاتے ہیں۔ ان کہانیوں میں بکھرتے ہوئے تعلق ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ ہمارا سماجی نظام اخلاقی طور پر کمزور ہو چکا ہے، انسان کی قدر گھٹ گئی ہے اور لوگ اندر سے ہار مان چکے ہیں۔ پریم ناتھ در کے افسانوں میں رشتہ صرف خون، خاندان یا معاشرے کا نام نہیں بلکہ انسان کی پہچان، اس کے تحفظ اور اس کی اندرونی زندگی کا سہارا بن کر سامنے آتا ہے۔ جب یہی رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو انسان باہر سے جیتا ہوا نظر آتا ہے، مگر اندر سے بالکل خالی اور اجڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ پریم ناتھ در علامت کو کسی فنی کرتب کی طرح استعمال نہیں کرتے، بلکہ اسے زندگی کی اصل سچائی دکھانے کے لیے برتتے ہیں۔ 'کاغذ'، 'برف'، 'نیلی آنکھیں'، 'خاموشی'، 'موت' اور 'انتظار' جیسی علامتیں صاف بتاتی ہیں کہ کشمیری سماج میں انسان کی زندگی کتنی نازک، غیر محفوظ اور ڈر سے بھری ہوئی ہے۔ افسانہ 'کاغذ کا واسدیو' میں مرکزی کردار کی موت صرف ایک شخص کا انجام نہیں رہتی، بلکہ پوری انسانیت کے احترام کے مرنے کا نشان بن جاتی ہے۔ اسی طرح 'فائدہ بے قاعدہ' اور 'نیلی بوتل' میں رشتوں کا ٹوٹ جانا یہ کھول کر رکھ دیتا ہے کہ سماج میں دکھاوا، خودغرضی اور طبقاتی ظلم کس طرح آہستہ آہستہ انسانیت کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ ان کہانیوں میں ماں کا رشتہ واحد تعلق ہے جو ہر دباؤ، ہر ڈر، ہر رسم اور ہر خود غرضی سے اوپر اٹھا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ پریم ناتھ در کے یہاں ماں انسان کی سچائی اور محبت کی آخری پناہ گاہ بن کر سامنے آتی ہے، جب کہ باقی رشتے وقت، حالات اور مفاد کی مار کھا کر کمزور پڑ جاتے ہیں۔ یوں ان کے افسانے ہمیں اس کڑوی سچائی سے آشنا کرتے ہیں کہ جدید دور میں انسان کی سب سے بڑی محرومی تنہائی ہے وہ تنہائی جو بھیڑ میں گھرا ہونے کے باوجود دل کے اندر بسی رہتی ہے۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پریم ناتھ در کے افسانے صرف ترقی پسند سوچ کی نمائندگی نہیں کرتے، بلکہ وہ انسان کے دکھ، اس کے ٹوٹے ہوئے رشتوں اور اس کے خاموش احتجاج کی ایک علامتی تاریخ ہیں۔ ان کی تحریریں آج بھی قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ کہیں ہم نے سماج بنانے کی دوڑ میں خود انسان کو ہی پیچھے تو نہیں چھوڑ دیا؟ یہی کربناک سوال ان کہانیوں کو زندہ رکھتا ہے، اور یہی سوال پریم ناتھ در کی اصل ادبی عظمت کا ثبوت بن جاتا ہے۔

پریم ناتھ در کے افسانے صرف ترقی پسند سوچ کی نمائندگی نہیں کرتے، بلکہ وہ انسان کے دکھ، اس کے ٹوٹے ہوئے رشتوں اور اس کے خاموش احتجاج کی ایک علامتی تاریخ ہیں۔ ان کی تحریریں آج بھی قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ کہیں ہم نے سماج بنانے کی دوڑ میں خود انسان کو ہی پیچھے تو نہیں چھوڑ دیا؟ یہی کربناک سوال ان کہانیوں کو زندہ رکھتا ہے، اور یہی سوال پریم ناتھ در کی اصل ادبی عظمت کا ثبوت بن جاتا ہے۔

Suresh Kumar
Research Scholar, Central University of Kahsmir
Ganderbal- 191201 (J&K)
Mob.: 8492939325
suresh939325@gmail.com

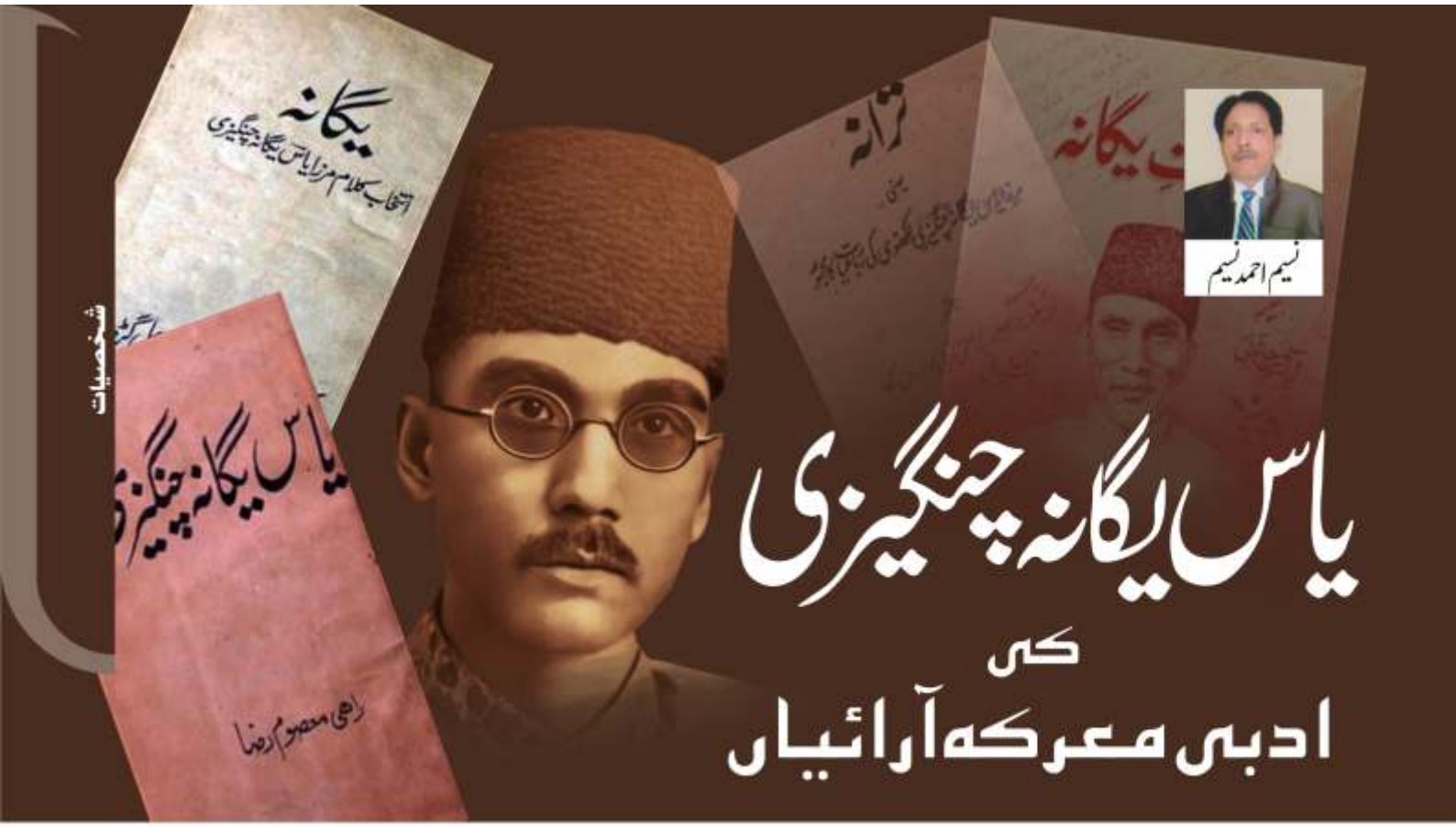

یاس یگانہ چنگیزی کی ادبی معرکہ آرائیاں

نسیم احمد نسیم

اردو ادب میں ادبی معرکوں اور تنازعات کی ایک طویل روایت رہی ہے۔ یہ ادبی تنازعات تقریباً ہر عہد میں چشمکوں، مناظروں، رقابتوں، مناقشوں، مجادلوں، اور معاصرانہ چھیڑ چھاڑ کی شکل میں برپا ہوتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے ان کے ذریعے شعرا ادبا اپنے مقابل پر اپنی علمی اور ادبی صلاحیت کا دبدبہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان میں اکثر اپنے علمی دلائل اور فنی مہارتوں کے ذریعے اپنے مقابل کے دعوں کو رد کرتے تھے۔ جب کہ کچھ شعرا ایسے بھی ہوتے تھے جو محض اپنی حاضر جوابی یا دریدہ دہنی کے ذریعے اپنے حریف کو زیر یا ذلیل کرنے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔ معرکوں اور تنازعات کی نفسیات پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خواہ فنی ہوں یا تحقیقی وتنقیدی ہوں یا فن شاعری سے متعلق ہوں، وہ ہر مقام پر خودستائی اور خودنمائی کا مظہر تھے اور ان کے ذریعے شعرا ادبا اپنے معاصرین پر اپنی برتری اور تفوق جتانے کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کرتے تھے اور کبھی کبھی تو ایسی صورت حال پیدا ہوجاتی تھی کہ معاملہ ادب سے نکل کر ذاتیات اور پھر مغلظات تک بھی پہنچ جاتا تھا۔ مگر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض معرکے اور تنازعات خالص علمی، تحقیقی اور فنی نوعیت کے بھی ہوتے تھے۔ اس ضمن میں دونوں طرح کے معرکوں کی مثالیں ہمیں میر وسودا، آتش و ناسخ، انیس و دبیر، انشا و مصحفی وغیرہ کے یہاں بہ آسانی مل جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ بعد کے زمانے میں دیکھیں تو چکبست وشرر، فراق واثر، عبدالماجد دریا آبادی و نیاز فتح پوری، کلیم الدین احمد و آلِ احمد سرور، عبادت بریلوی و احتشام حسین، رشید حسن خاں و وحید اختر، وہاب اشرفی و محمود ہاشمی وغیرہ کے معرکے بھی کم معروف نہیں رہے ہیں۔

'اردو کے ادبی معرکے' کے مصنف عابد پیشاوری نے صاحبانِ معرکہ و مجادلہ کی نفسیات کا مطالعہ کرتے ہوئے اسے صرف تین جملوں میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کے مطابق:

''معرکوں اور مناقشوں میں عموماً دو طرح کے ادیب ملوث ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو خود دوسروں پر انگلی اٹھاتے ہیں اور جو اباً ہدفِ تعریض بنتے ہیں اور دوسرے وہ جو چھیڑے جاتے ہیں تو جواباً چھیڑنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ پہلا گروہ غالباً احساسِ برتری کا شکار ہوتا ہے اور دوسرا گروہ پاسِ خودی سے مجبور!''

(اردو کے ادبی معرکے: عابد پیشاوری 1979، ص 15)

میری دانست میں یاس یگانہ چنگیزی اسی دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو 'پاسِ خودی' سے مجبور تھا۔ یگانہ کی پوری حیات تحفظِ ذات اور احساسِ خودی میں گزری۔ بالخصوص لکھنؤ میں سکونت کے دوران انھوں نے تحفظِ ذات کی خاطر معرکوں کو قصداً اپنا شیوہ بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لکھنؤ کے اپنے معاصر شعرا سے لڑتے لڑتے اس قدر سخت اور خود پسند ہوگئے کہ مقامی تنازعات میں خواہ مخواہ مرزا غالب کو بھی گھسیٹ لائے اور وہ بھی اس لیے کہ غالب ان کے مخالفین کے آئیڈیل تھے۔ حالانکہ ادب میں کسی فنکار کے ارتداد کے بل بوتے پر بڑا مقام حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ معرکے، تنازعات یا مناقشے ایک عہد کے ادبی ماحول کی تاریخ ہوتے ہیں۔ کچھ یہی یگانہ کے ساتھ بھی ہوا۔ وہ بھی ادبی معرکوں اور تنازعات کا تاریخی حوالہ بن کر رہ گئے، اور ان کی عمدہ شاعری کے نقش رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہوتے چلے گئے۔ حالانکہ آگے چل کر مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری جیسے کچھ اہم ادیبوں اور نقادوں نے ان کی شاعری کو بطور خاص اپنا موضوع بنایا۔ مثال کے طور پر مجنوں گورکھپوری کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''یگانہ پہلے شاعر ہیں جو ہم کو زندگی کا جبروتی رخ دکھاتے ہیں اور ہمارے اندر سعی و پیکار کا ولولہ پیدا کرتے ہیں۔ غزل جو اب تک صرف حسن وعشق کی شاعری سمجھی جاتی رہی ہے، یگانہ نے اسے زندگی کی شاعری بنادیا۔ ان کی سب سے نمایاں خصوصیت مردانہ عزم و اعتماد ہے۔ انھوں نے غزل میں واقعی بت شکنی کی ہے..... یگانہ کی شاعری ایک جدلیاتی حقیقت ہے اور تصادم و پیکار اس کی نمو اور بالیدگی کے لیے ضروری ہے''۔

(رسالہ نگار، معاصر غزل گویوں پر تنقید نمبر، مدیر نیاز فتح پوری، 1942)

یگانہ کو 'غالب شکن' اور 'شہرتِ کاذبہ' کی وجہ سے بہت شہرت یا بدنامی ملی۔ مگر ان تصانیف نے ان کو معاصرین کی اکثریت کی نظروں سے گرادیا۔ انھیں مغرور، خودسر، سرکش اور بدمزاج وغیرہ سمجھا جانے لگا۔ غالب کے پرستاروں نے ان کے خلاف ایک گروہ بنالیا اور دیکھتے دیکھتے ان پر حملے ہونا شروع ہوگئے۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ جب میکش اکبرآبادی کو یگانہ کی غالب شکنی کے متعلق معلوم ہوا تو انھوں نے لکھا کہ:

''جب مجھے معلوم ہوا کہ یگانہ نے مرزا غالب پر بھی اعتراض کیے ہیں تو مجھے ان کے نام سے نفرت ہوگئی اور میں نے انھیں بھول جانے کی کوشش کی، اور بھول گیا۔''

یگانہ نے گرچہ مختلف مقامات پر غالب کے اشعار کے عیوب اجاگر کیے، ان کی فکر اور خیال کو ہدف بنایا مگر وہ غالب کے کلیتاً منکر نہیں تھے۔ وہ غالب کی عظمت کے معترف تھے مگر ان کی کورانہ تقلید کے خلاف تھے۔ ان کے مطابق اگر غالب کے ان اشعار، جن میں منطق کی شوخیاں، پسندیدہ نزاکتیں اور قریب الفہم اشارے کنایے پائے جاتے ہیں، ان کی تقلید کی جاتی تو بے شک بہت اچھی بات ہوتی..... ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ تقلید ہنر کی ہونی چاہیے نہ کہ عیب کی! وہ غالب کی اندھی تقلید پر اس طرح نشانہ سادھتے ہیں۔

تقلید کے پھندے ہیں گلے میں جن کے
واللہ قدم رکھتے ہیں کیا گِن گِن کے
رفتار میں تیزی ہے نہ پرواز بلند
شاعر تو نہیں، تو تے ہیں ادوائن کے

مگر اس اعتراف کے باوجود وہ غالب کے معاملے میں اکثر تضادات کا شکار رہے مثلاً یہ رباعی دیکھیں۔

ہاں میر سے اعجاز بیانی سیکھی
گویا تلوار کی روانی سیکھی
اور قاطعِ برہان سے کیا فیض ملا
غالب کی طرح بد زبانی سیکھی

یگانہ اصل میں پسِ پردہ اپنے مخالفین سے برسرِ پیکار تھے۔ وہ انھیں ٹھیٹھ بولی میں 'تھلیلیچی' کہا کرتے تھے اور انھیں نیچا دکھانے کے لیے غالب کے رتبے کو گراتے رہتے تھے۔ حالانکہ حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ انھوں نے ایک مضمون 'میرزا غالب اور میں' رسالہ 'مخزن' 1918

> **میری دانست میں یاس یگانہ چنگیزی اسی دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو 'پاسِ خودی' سے مجبور تھا۔ یگانہ کی پوری حیات تحفظِ ذات اور احساسِ خودی میں گزری۔ بالخصوص لکھنؤ میں سکونت کے دوران انھوں نے تحفظِ ذات کی خاطر معرکوں کو قصداً اپنا شیوہ بنایا۔**

میں غالب کے تعلق سے اپنی توضیح پیش کی ہے اور اسے ڈاکٹر نجیب جمال نے نقل کیا ہے۔ ملاحظہ کریں:

''میں نے غالب مغفور پر جو کچھ لکھا، وہ بعض مقامی ضرورتوں سے مجبور ہوکر لکھا۔ جس سے محض لکھنؤ کے چند نافہموں کی چشم کشائی مقصود تھی۔ یہ بحث صفی و عزیز و ثاقب کی چشم کشائی کے لیے چھیڑی گئی تھی اور آج ختم ہوگئی۔'' (رسالہ مخزن، جون 1918، ص:52)

یگانہ کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے دور میں بالکل علاحدہ مزاج اور سوچ رکھتے تھے۔ زبان دانی اور عروض دانی کے معاملے میں وہ لکھنؤ والوں کو کورا گردانتے تھے۔ ان کی نرگسیت کا یہ حال تھا کہ وہ فرماتے تھے کہ ''اس صدی میں یگانہ کے بجائے اور کسی کو شاعر سمجھنا محض خود فریبی ہے''۔ یا ان کا یہ کہنا کہ ''اس دور نے میرا کوئی حریف پیدا نہیں کیا۔ موجودہ دور کی لاشوں (یعنی معاصرین) سے ٹکرانا مجھے پسند نہیں۔ یا 'نشترِ یاس' کی اشاعت پر یہ لکھنا کہ لکھنؤ کے معاصرینِ حال اور آئندہ نسلوں پر فرض ہے کہ یگانہ چنگیزی کی زبان اور اجتہادی تصرفات سے سند لیں نیز یہ کہ انھیں استاد تسلیم کرکے ان کی پیروی کریں وغیرہ وغیرہ۔ پھر بھی، بات اگر یہیں تک رہتی تو کسی طرح برداشت کرلی جاتی۔ مگر انھوں نے اس سے آگے بڑھ کر مذہبی معاملات میں بھی دخل اندازی کی اور حد سے تجاوز بھی کیا۔ یہ وہ عوامل تھے جنھوں نے لوگوں کی نظر میں ان کو کانٹا بنادیا۔ دراصل یگانہ کے مخالفین نے انھیں قصداً ایسی ڈگر پر ڈال دیا تھا کہ وہ پوری طرح باؤلا ہوجائیں۔ اس بابت ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے بھی لکھا ہے کہ ''یگانہ کے پرستاروں نے انھیں دھکا دے کر غالب شکنی کے کگار تک پہنچادیا۔ وہ یگانہ کی رگِ چنگیزی کو بھڑکاتے رہے، انھیں مسلسل اکساتے رہے تاکہ وہ اپنا آپا کھودیں اور ہذیان بکنے لگیں اور ہوا بھی یہی۔!

یاس یگانہ چنگیزی نے کلکتہ، لکھنؤ، لاہور، علی گڑھ اور حیدرآباد میں سکونت اختیار کی۔ مگر ''جس شہر میں رہنا اکتائے ہوئے رہنا'' کے مصداق انھیں کہیں قرار نہیں آیا۔ وہ پوری زندگی بیگانگی میں گزارتے رہے۔ چونکہ طبیعت میں کجی تھی اور احساسِ تفاخر عروج پر تھا اس لیے ان کی نظر میں نہ کوئی جگہ جچی اور نہ کوئی فنکار! وہ میر و غالب اور اقبال جیسے شعرا کے مقابلے میں خود کو کھڑا کرتے رہے اور اپنی اَنا کے لیے تسکین کا سامان فراہم کرتے رہے۔ کبھی خود کو لسان العصر، کبھی ابوالمعانی اور کبھی امام الغزل قرار دیتے رہے اور بہ بانگِ دہل کہتے رہے کہ۔

کون ہوں، کیا ہوں، دیکھ لیں اہلِ نظر
آبروئے لکھنؤ، خاکِ عظیم آباد ہوں

اتنی تعلی تو خیر گوارا تھی۔ مگر ان کی خود پرستی اپنے معاصرین تک ہی محدود نہ رہی بلکہ بعد کے شعرا تک بھی جا پہنچی۔ انھوں نے اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، حسرت موہانی، جگر مراد آبادی اور جوش ملیح آبادی وغیرہ کو بھی اپنی خشونت کا شکار بنایا۔ نیز یہ کہ انھوں نے مختلف ادبی رجحانات و تحریکات کو بھی مسمار کرنے سے گریز نہیں کیا۔ وہ ترقی پسند ادیبوں کو 'ادبی غدار' اور ادبِ لطیف کو 'ادبِ خبیث' کہا کرتے تھے اور نثری شاعری کو تو وہ بکواس سے زیادہ اہمیت ہی نہیں دیتے تھے۔ اس کی تفصیل ان کے ایک مضمون میں ملتی ہے جو ماہنامہ آج کل جنوری 1945 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

یگانہ چنگیزی نے 1903 میں کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اس کے دو سال بعد 1905 میں لکھنؤ کا رخ کیا۔ اس وقت لکھنؤ میں صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی اور ثاقب لکھنوی جیسے شعرا کا شہرہ تھا۔ ساتھ ہی نیاز فتح پوری، شاہد دہلوی، ماہر القادری اور عبدالماجد دریابادی جیسی موقر شخصیات بھی وہاں موجود

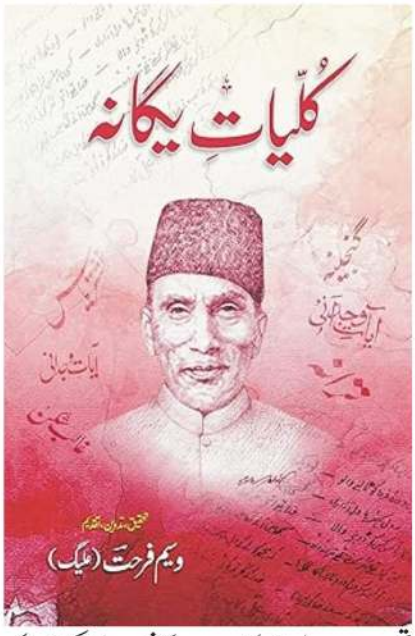

تھیں۔ اس لیے یگانہ کو وہاں وہ جگہ نہیں مل سکی جس کی وہ توقع رکھتے تھے۔ انھوں نے 1914 میں 'نشترِ یاس' شائع کیا۔ اس کتاب میں لکھنؤ کے اساتذہ شعرا جو کہ معتدل مزاج رکھتے تھے، انھوں نے مذکورہ کتاب میں اپنے تاثرات شامل کیے اور ان تاثرات کو بنیاد بنا کر یگانہ نے جو کچھ لکھا وہ کسی شعلے کی لپک سے کم نہ تھا۔ اس امر کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر نجیب جمال نے تحریر کیا کہ:

''..... یگانہ نے 'ماہیئت شاعری' کے عنوان سے دیوان کا پیش لفظ لکھا..... لکھتے ہیں کہ انھیں لکھنؤ کے اہل زبان نے، خاندانی شعرا نے اہل زبان مان لیا تو معاصرینِ حال اور آئندہ نسلوں پر فرض ہے کہ یاس کی زبان اور اجتہادی تصرفات سے سند لیں..... مگر لکھنؤ کے اکثر نافہم دوسروں کے حقوق کو نہایت بے دردی سے پامال کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اہل انصاف کی نگاہوں میں خود ذلیل ہوتے ہیں''۔

(یگانہ، نجیب جمال، بحوالہ 'نشترِ یاس' عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 2014، ص128)

ظاہر ہے یگانہ کے اس فرمان نے آگ میں گھی کا کام کیا اور پھر سلسلہ شروع ہوا لسانی کشیدگی کا، متنازعہ بیانات کا اور مناقشانہ سرگرمیوں کا۔ جب معرکہ آرائی کا بازار اور گرم ہوا تو متعدد رسائل بھی اس میدان میں کود پڑے۔ مشاعروں اور شعری نشستوں میں ہجویہ اشعار کھل کر سامنے آنے لگے۔ ایک مشاعرے میں ظریف لکھنوی نے یگانہ کے دیوان کی قیمت کا مذاق اڑایا اور ان پر ذاتی نوعیت کے مذموم حملے کیے۔ یہی نہیں، ان کے اشعار پر فحش مصرعے بھی چسپاں کیے۔ یہ دیکھ کر یگانہ چراغ پا ہوگئے اور انھوں نے بھی جواباً ان اساتذہ شعرا کو نشانہ بنایا۔ یگانہ کو فنِ عروض ہی نہیں بلکہ زحافات پر بھی عبور حاصل تھا۔ وہ اکثر اپنے مخالفین کو اسی ہنر سے مات دیتے تھے اس کی ایک بہترین مثال یہاں دیکھ لیں۔

آج وہ کیوں زیرِ خاک سوتے ہیں آرام سے
کانوں پہ رکھتے تھے ہاتھ جو موت کے نام سے
دنیا کی آرزو، نہ دیں کی آرزو
اڑتے ہیں ہوش ایسے اب گردشِ ایام سے
جلوۂ معنی کجا، دیدۂ حیراں کجا
باز آؤ یاس اس آرزوئے خام سے

اور اس پر مستزاد یہ کہ ان اشعار کو انھوں نے بطور چیلنج اپنے مخالفین کو بھجوا دیے کہ وہ ان کی تقطیع کر کے دکھائیں۔

یگانہ کلاسکی شعری روایت اور عصری آگہی دونوں پر مساوی درک رکھتے تھے۔ وہ ایک باخبر حساس اور زمانہ شناس فنکار تھے۔ انھوں نے ادب کے تبدیل ہوتے منظر نامے کو سمجھا اور انھیں اپنے مخصوص انداز

> یگانہ اصل میں پسِ پردہ اپنے مخالفین سے برسرِ پیکار تھے۔ وہ انھیں ٹھیٹھ بولی میں 'غلیچی' کہا کرتے تھے اور انھیں نیچا دکھانے کے لیے غالب کے رتبے کو گراتے رہتے تھے۔

اسلوب میں پیش کیا۔ ان کی خود اعتمادی غضب کی تھی اور اسی خود اعتمادی نے انھیں حد درجہ خود پرست اور کج رو بھی بنا دیا تھا اور ان کی اسی ادا پر فریفتہ ہوتے ہوئے ان کے حامی ناقدین نے اسے یگانہ آرٹ کے نام سے موسوم کر دیا۔

یگانہ کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ایک انحرافی مزاج لے کر دنیا میں آئے تھے۔ وہ کسی کے آگے سپر ڈالنا اپنی شان اور خودداری کے منافی تصور کرتے تھے۔ ان کے مزاج کی ترشی، کرختگی اور حد سے بڑھی ہوئی انانیت نے انھیں ضدی بنا دیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف مخالفین کی بڑی جماعت تھی تو دوسری طرف وہ تنِ تنہا 'ون مین آرمی' کی طرح مورچے پر ڈٹے ہوئے تھے۔ وہ اپنے مخالفین کی دکھتی رگ کو پہچان گئے تھے، اس لیے اکثر و بیشتر ان کی زبان دانی اور عروض دانی کی گرفت کے بہانے ان کی دکھتی رگیں دباتے رہتے تھے۔ حالات دن بہ دن سنگین صورت حال اختیار کرنے لگے تھے۔ ان کی اس روش کے ردعمل کے طور پر مخالفین کے ترجمان رسالہ 'معیار' نے انھیں دھمکی دی کہ یا تو ہمارا مسلک یعنی غالب پرستی اختیار کرو یا شاعری چھوڑ دو۔ لیکن یگانہ تو یگانہ تھے۔ انھوں نے نہ صرف اس دھمکی کو خارج کیا بلکہ دھمکی دینے والوں کو مزید دہلانے اور جلانے کے لیے ایک رسالہ جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے 'غالب شکن' لکھ ڈالا۔ پھر کیا تھا چاروں طرف کہرام مچ گیا۔ اس وقت کے معروف رسائل معیار، سیارہ (لکھنؤ) نظارہ (کانپور) اور خیال (میرٹھ) کے صفحات ایک طرح سے جنگ کا میدان بن گئے۔

یہاں ایک بات غور کرنے والی ہے کہ یگانہ نے ہجویہ اشعار کے ردعمل میں خود بھی اشعار نہیں کہے بلکہ زیادہ تر اپنی دھار دار نثر کا سہارا لیا۔ غالباً وہ اپنی شاعری کو اس قضیے میں آلودہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

مختصر یہ کہ یاس یگانہ چنگیزی لکھنؤ کے اپنے مخالفین کے ساتھ دو دہائیوں کی جنگ میں کسی محاذ پر پست نہیں پڑے اور بالآخر ان کی موت بھی ایک طرح سے حالتِ جنگ میں ہی ہوئی۔

اب اخیر میں پروفیسر ممتاز حسین کے اس مختصر اقتباس پر اپنی باتیں سمیٹتا ہوں، جسے تمثیل احمد نے یہاں نقل کیا ہے:

''یگانہ کی جنگ اس ماحول کے خلاف تھی جس میں ہنر، فن، شعر و ادب کی کوئی قدر نہ تھی۔ وہ اپنے مشن میں اتنے کامیاب رہے کہ آج میدان انہی کے ہاتھ ہے۔''

(مرزا یاس یگانہ چنگیزی: حیات اور شاعری، تمثیل احمد، 2006، پٹنہ، ص:59)

Naseem Ahmad Naseem
Kali Bagh, Ward No: 10
Bettiah- 845438 (Bihar)
Mob.: 7011548240
ahmad.naseem7011@gmail.com

عبدالودود قاسمی

مولانا خیر رحمانی کی علمی و ادبی نقوش

دربھنگہ کی سرزمین زمانۂ قدیم سے علم وادب کا گہوارہ رہی ہے،اس کی خاک سے بڑے بڑے جید علما، صوفیا، اطبا، شعرا وادبا پیدا ہوئے، انھیں میں سے ایک عبقری شخصیت مولانا ابوالخیر رحمانی کی بھی تھی جو دنیائے ادب میں خیر بہیروی کے نام سے جانے جاتے تھے، موصوف انیسویں صدی کے صاحب دیوان شاعر، بلند پایہ ادیب اور صحافی بھی تھے، تاحیات علمی وادبی کاموں میں کافی سرگرم اور فعال رہنے کے باوجود آپ کی زندگی میں کوئی دیوان شائع نہیں ہوسکا، جب کہ آپ نے اپنے شاگرد نواب سعادت علی خاں پیغمبر پوری کے 'دیوان سعادت' کو اپنی نگرانی میں بڑے تزک واحتشام کے ساتھ 1907 میں کلرفل 'منشی نول کشور پریس'، لکھنؤ سے شائع کرایا جس میں 'حالات مصنف' کے تحت آپ کی تحریر نواب صاحب کی شخصیت اور شاعری پر مشتمل دیوان میں شامل ہے۔ اسی طرح مولوی سید عبدالودود بسمل کے دیوان کو بھی بڑی محبت ومحنت سے ترتیب دے کر شائع کیا۔ اس دیوان میں بھی قطعۂ تاریخ کے ساتھ آپ کی جامع تحریر شامل ہے۔ 'دیوان بسمل' 1905 میں مطبع اخبار بانکی پور، پٹنہ سے شائع ہوا۔

خیر رحمانی کے تمام منظوم ومنثور علمی وادبی اثاثے کو ڈاکٹر افتخار احمد (شعبۂ فارسی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد) نے کئی سال کی جدوجہد اور ان تھک کوششوں کے بعد تخلیقات وتبرکات خیر کو 'کلیات خیر' کی شکل میں شائع کرکے ایک عظیم ادبی ورثے کو محفوظ کردینے میں کامیابی حاصل کی، ڈاکٹر افتخار احمد کا یہ تاریخ ساز کارنامہ دربھنگہ اور مدھوبنی کے تمام شعرا وادبا کی جانب سے فرض کفایہ سے کم نہیں۔ یہ کام بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا جو سو سال بعد ہوا، خیر! دیر آید درست آید۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ خیر رحمانی بہیروی انیسویں صدی کے کہنہ مشق اور صاحب دیوان شاعر تھے تذکرہ کی مشہور کتاب 'تذکرہ ہزار داستان' کے مصنف لالہ سری رام نے 'خمخانۂ جاوید' (جلد سوم) کے صفحہ 100 پر موصوف کی شخصیت اور شعری نمونے بھی تحریر کیے ہیں۔

مولانا خیر رحمانی دربھنگہ سے چند کیلومیٹر فاصلے پر واقع قاضی بہاری (موسوم بہ قاضی بہیرہ) کے رہنے والے تھے۔ ڈاکٹر افتخار احمد لکھتے ہیں:

''ابوالخیر وجیہ الاسلام محمد صفی الدین، تاریخی نام مظہر عالم (1286ھ) اور خیر تخلص تھا۔ چوں کہ مولانا خیر، حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کے دامنِ عاطفت وسلسلۂ ارادت میں تھے لہٰذا خانقاہ رحمانیہ مونگیر کی مناسبت سے لفظ 'رحمانی' کو اپنے نام میں برکت کے طور پر استعمال کیے اور دنیائے شعروادب میں خیر رحمانی کے نام سے متعارف ہوئے۔ ان کی ولادت موجودہ ضلع دربھنگہ کے مذکورہ قاضی بہیرہ نامی قصبہ میں 21 اکتوبر 1869 بمطابق 5/ رجب المرجب 1286ھ کو ہوئی۔ ان کے والد ماجد کا نام محمد شفیع الدین اور جد امجد کا نام ولایت حسین تھا۔''

(کلیات خیر: مرتب ڈاکٹر افتخار احمد، ص50)

مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی، بعدہٗ ایشیا کی عظیم درسگاہ دارالعلوم دیوبند سے 1886 میں مولانا کی فراغت ہوئی، دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ جیسے اکابر اساتذہ سے مستفید ہونے کا موقع میسر ہوا۔ مولانا زمانۂ طالب علمی ہی سے کافی ذہین وفطین تھے، عربی، فارسی اور اردو زبان میں آپ کو یدِ طولیٰ حاصل تھا، عالم باعمل ہونے کے ساتھ شعروادب کا ذوق اور ملکہ فطری طور پر آپ کو حاصل تھا، ڈاکٹر افتخار احمد کے مطابق شعروادب کی اصلاح کے لیے حضرت داغ دہلوی سے آپ نے مراسلت کی اسی طرح امیر مینائی اور علامہ ظہیر احسن شوق نیموی سے بھی آپ کو شرف تلمذ حاصل تھا، مولانا مشاق شاعر کے ساتھ ایک بہترین ادیب، بالغ النظر صحافی، محقق، ناقد اور فکاہیہ نگار بھی تھے، متعدد رسائل کی ادارت بھی آپ نے بحسن وخوبی نبھائی، حکیم سید احمد اللہ ندوی 'تذکرہ مسلم شعرائے بہار' میں مولانا ابوالخیر رحمانی سے متعلق لکھتے ہیں، اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اکثر نامی اخباروں کے نامہ نگار اور اخبار 'الپنچ' بانکی پور، پٹنہ کے عرصہ تک ایڈیٹر بھی رہے۔ آپ کی ادارتی تحریر سے 'الپنچ' کی مقبولیت میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ اردو نثر نویسی میں یدِ طولیٰ حاصل تھا، آپ کے دلکش اور دلربا مضامین سے نظم کا لطف آتا تھا، شعروسخن کا بھی کمال شوق تھا۔ مولانا شوق نیموی کے شاگرد تھے۔ آپ کی تالیفات سے 'رجم الشہاب' نام کا ایک رسالہ چھپ چکا ہے، نمونہ کلام یہ ہے۔''

ستم بیجا کیے ہم پر، رقیبوں سے وہ درگزرے
ہمارے دل دکھانے میں جو کرنا تھا وہ کر گزرے
ہاتھ میں کیوں لیے ہو تم خنجر
لاؤ اس کو گلے لگائیں ہم

(تذکرہ مسلم شعرائے بہار: (حصہ دوم) مؤلف حکیم سید احمد اللہ ندوی، سال اشاعت: 1966، ص23)

خیر رحمانی اردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی اعلیٰ شاعری کے نمونے چھوڑے موصوف کا فارسی زبان میں ایک دیوان بھی موجود ہے۔

موصوف تادم حیات معلم واتالیق کی حیثیت سے درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، آپ کے لائق و فائق شاگردوں کی ایک لمبی فہرست ہے، ان شاگردوں میں نواب سعادت علی خان پیغمبر پوری، سید شاہ محمد حسن بسمل عظیم آبادی، سید شاہ جعفر حسین صادق، سید مظہر امام (گیا) کے نام اہم ہیں۔

مولانا کسب معاش کے لیے مختلف مقامات میں قیام پذیر رہے، مگر افسوس کہ علم وادب کے اس انمول رتن کی جیسی پذیرائی اور قدر ومنزلت ملنی تھی نہیں مل سکی۔ پروفیسر محمد کاظم مولانا سے متعلق بڑی اہم بات 'کلیات خیر' کے پیش لفظ میں تحریر کی ہے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''مرزا اسد اللہ خاں غالب کے انتقال کے ٹھیک آٹھ مہینے بعد اردو کے نام نہاد دبستانوں سے دور لیکن ایک مردم خیز علاقے دربھنگہ میں ایک ایسی شخصیت نے 12 اکتوبر 1869 کو اس دنیا میں قدم رکھا جس کی شاعری کئی اصناف پر مشتمل ہے۔ جو غالب کی ہی مانند اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا رہا ہے۔ ہاں جنھیں غالب کی مانندان کی زندگی میں شہرت تو کیا پہچان بھی نہ ملی کیونکہ انھیں حالی جیسا شاگرد جو نہ ملا۔ ہاں انھیں حالی وشبلی جیسا معاصر عالم وادیب ضرور ملا۔ ان کے جونیئر معاصر جید عالم دین اور آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد ان کے شائقین میں شامل رہے ہیں۔ وہ شخصیت فارسی اور اردو دونوں میں عمدہ کلام کہنے پر قادر تھی۔''

(کلیاتِ خیر، مرتب: ڈاکٹر افتخار احمد، 2024، ص39)

مولانا کے بزرگ معاصرین میں علامہ اقبال، داغ، امیر مینائی، اور شاد عظیم آبادی کے نام درج ہیں۔ معاصرین میں عبد الحمید پریشاں، سید امداد امام اثر، نصیر حسین خیال، فضل حق آزاد، مبارک حسین مبارک عظیم آبادی، شوق نیموی، عنایت حسین امداد، محمد باقر، شیخ علی باقر، عبد الغفور شہباز، مولانا نذر الرحمٰن حفیظ، سید رحیم الدین، بیتاب اور موج وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

مذکورہ معاصرین سے مولانا کی علمی وادبی آفاقیت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ ماقبل ذکر کیا گیا کہ مولانا متعدد رسائل وجرائد

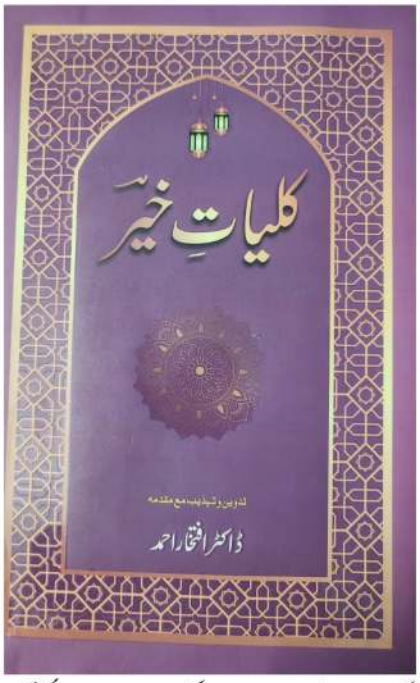

کی ادارت فرماتے رہے اور کئی رسالے خود شائع بھی کیے طوالت کی وجہ سے سبھوں کا ذکر اس مختصر مضمون میں مشکل ہے، ہاں البتہ 'الپنچ' کے حوالے سے آپ کی ادارت اور صحافت کا ذکر ضروری ہے موصوف 'الپنچ' کی وابستگی سے قبل منشی پریم چند کی طرح مختلف قلمی نام سے لکھتے رہے، آپ نے کبھی ابوظرفا، قہر نگار، اور ہنٹر پھٹکارنا موں سے سنجیدہ اور فکاہیہ مضامین تحریر کرتے رہے۔

خیر رحمانی کی درجن بھر سے زائد کتابیں، مجموعے اور دواوین کے قلمی نسخے ان کی زندگی ہی میں مرتب تھے، جو شائع نہیں ہوسکے، بس ایک دو کتابیں ہی شائع ہوسکیں، ڈاکٹر افتخار احمد نے 'کلیات خیر' میں 'تصنیفات خیر' کے تحت مولانا کی چودہ کتابوں کا تعارف پیش کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

(1) حسنات خیر (نسخۂ خطی): یہ خیر رحمانی کا پہلا دیوان ہے اس میں تقریباً دوسو چالیس غزلیں ہیں۔ غزل مسلسل اور اشعار کی تعداد کی وجہ سے یہ کافی ضخیم ہے۔ فن خطاطی کا عمدہ نمونہ پایا جاتا ہے۔ دیوان کے آغاز میں پہلے ورق کی پیشانی پر ایک قلمی تاج بنایا گیا ہے جو پہلی غزل کے مصرع ثانی میں لفظ تاج لاکر بسم اللہ سے منسوب کیا گیا ہے۔

(2) لمعات خیر (نسخۂ خطی): یہ خیر رحمانی کا دوسرا دیوان ہے۔ اس دیوان میں غزل کے علاوہ نظم بھی شامل ہے۔ غزلوں میں نعتیہ غزلیں بھی ملتی ہیں اور مفردات میں بہت سے اشعار شامل ہیں۔ 'لمعات خیر' کے مادۂ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان 1351ھ میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔

(3) سخن تازہ اخباری (نسخۂ خطی): اس مجموعے میں 'کیا نام کہ' کے عنوان کے تحت تکیہ کلام پر مبنی اشعار ملتے ہیں۔ کہہ مکرنیاں نظمیں، مسلک حاضرہ اور فکاہیات وغیرہ پر مبنی کلام ملتے ہیں۔ تازی سخن اخباری کے مادۂ تاریخ سے یہ واشگاف ہوتا ہے کہ 1937 میں مولانا خیر نے اسے ترتیب دے کر کامل کیا تھا۔

(4) ملہم غیب خیر (نسخۂ خطی): یہ قطعات تاریخ کا مجموعہ ہے۔ جو 1341ھ سے 1357ھ تک کے واقعات، وفیات تولدات شادیات، مژدات، سیاسیات، تصنیفات، کتابیات، اخبارات، رسالہ جات اور مطبوعات پر مبنی ہیں۔

(5) سپاس نامۂ ارمان خیر (نسخۂ خطی): جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ یہ سپاس ناموں پر مبنی نظموں کا مجموعہ ہے۔ 'سپاس نامۂ ارمان خیر' سے مادۂ تاریخ نکالنے پر واضح ہوتا ہے کہ اس مجموعے کی تاریخ تکمیل 1321ھ ہے۔ اس میں تقریباً 52 نظمیں شامل ہیں۔

(6) جوش آزادی (مطبوعہ): یہ قومی نظموں کا مختصر سا مجموعہ ہے، جسے خیر رحمانی نے اپنے شاگرد عزیز سید شاہ محمد جعفر حسین صادق کی فرمائش پر قلم بند کیا تھا۔ اس کتابچے کو جناب مولوی سید شاہ جعفر حسین صادق خلف اکبر جناب خان بہادر سید واجد حسین صاحب، رئیس اعظم، پٹنہ کے اہتمام وسعی سے منیجر اسلامی جنتری، موچی گیٹ، لاہور نے مرتب وشائع کیا تھا۔

(7) چٹکیاں (مطبوعہ): یہ نظم 1341ھ میں شیخ عنایت محمد آرٹسٹ و منیجر اسلامی خلافت جنتری نے لکھنؤ سے شائع کیا تھا۔ اس کی پشت پر بہت سی کتابوں کے ملنے کی اطلاع دی گئی ہے جن میں خیر رحمانی کی مختصر نظموں کے مجموعہ 'جوشِ آزادی' کا بھی ذکر ہے۔ 156 اشعار پر مشتمل یہ طویل نظم پند وموعظت کے ساتھ تلخ وشیریں کلام پر مبنی ہے۔

(8) سہانی رات (مطبوعہ): یہ کتاب نثر میں ہے۔ سر ورق پر 'یا معین' لکھا ہے۔ اس کے بعد ایک شعر یوں درج ہے کہ ؎

سنانے کو سنا تو دے گا قاصد داستاں میری
کہاں سے لائے گا یہ جوشِ دل پھر یہ زباں میری

یہ کتاب خادم الفقر منشی نور احمد مالک محبوب ایجنسی، امین آباد، پنجاب، لاہور پرنٹنگ پریس سے رحیم بخش کے

زیر اہتمام شائع ہوئی۔

(9) نسب نامہ (نسخۂ خطی): یہ کتاب سادات خاندان کا شجرہ ہے۔ اس میں اس چیز کا بیان ہے کہ حضور اکرمؐ کے اہل خاندان کا سلسلہ ہندوستان میں کیسے قائم ہوا۔ چوں کہ خیر رحمانی کا تعلق حضرت امام تاج فقیہ سے تھا۔ انھوں نے مختلف لکیریں کھینچ کر تاج فقیہ کا رشتہ حضور اکرمؐ کے عم محترم حضرت زبیر سے ثابت کیا ہے۔

(10) رجم الشہاب: بیشتر تذکروں میں اس رسالے کا ذکر موجود ہے لیکن بعد کے کسی اہل قلم نے مذکورہ رسالے پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔ تذکرہ مسلم شعرائے بہار کے مصنف سید احمد اللہ شاہ ندوی کے مطابق یہ رسالہ مطبوعہ ہے۔

(11) پارسی نو (مطبوعہ): یہ کتاب بہار کے اسکولی نصاب میں شامل تھی جو بچوں کو فارسی زبان سکھانے کے لیے لکھی گئی تھی۔ سرکار نے باقاعدہ اسے منظور کیا تھا جس کی وجہ سے اس کے متعدد اڈیشن شائع ہوئے۔

(12) رشحات خیر ونفحات خیر، (نسخۂ خطی): یہ فارسی دیوان ہے، جس میں حروف تہجی کے اعتبار سے غزلیات موجود ہیں۔ ایک قطعہ ایک ساقی نامہ اور بیس رباعیوں کے علاوہ مفردات میں خاصے اشعار ملتے ہیں۔ خیر نے اردو زبان میں کوئی رباعی نہیں کہی ہے بلکہ جو کچھ رباعیاں پائی گئی ہیں وہ سب کی سب فارسی زبان میں ہیں۔

(13) انشائے فصیح خیر (نسخۂ خطی): یہ فارسی میں لکھے گئے مراسلات کا مجموعہ تھا۔ اس میں بیشتر وہ خطوط شامل تھے جو استاد محمد علی ایرانی اور خیر کے درمیان علمی مباحث واشکال کی بنیاد پر لکھے یا جواباً موصول کیے گئے تھے۔

(14) خیر رحمانی کے خطوط (نسخۂ خطی): خیر رحمانی کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اس عہد کے بیشتر شعرا وادبا سے ان کے تعلقات تھے۔ چونکہ وہ 'الپنچ' رسالہ بہار کے اڈیٹر تھے لہٰذا خطوط کا آنا اور جواب دینا ان کے فریضے میں شامل تھا۔ اس کے علاوہ خیر رحمانی کے کئی خطوط استاد داغ دہلوی، امیر مینائی، شوق نیموی، اور استاد محمد علی ایرانی کے نام علمی مباحث پر مشتمل ہیں۔

مذکورہ بالا مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابیں خیر رحمانی کی ہیں، جسے پڑھ کر ان کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے، خیر رحمانی نے جس قدر علم وادب کی خدمت کی اسی قدر گمنام بھی رہے، موصوف کی جس قدر پذیرائی اور ان کے علم وفن کا برملا اعتراف ہونا چاہیے تھا نہیں ہوسکا۔ چند

خیر بہیروی مختلف الجہات شخصیت کے حامل انسان تھے، موصوف بیک وقت ایک کہنہ مشق شاعر ہونے کے ساتھ ایک بلند پایہ ادیب، محقق، ناقد اور صحافی بھی تھے۔ تقریباً تمام اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی حمد، نعت، نظم، غزل، رباعی، مسدس، قطعہ، قطعات تاریخ، تہنیتی نظمیں، گیت، کہہ مکرنیاں، سہرے، اور بے شمار منظوم سپاس نامے بھی آپ کے دیوان میں شامل ہیں۔

قدیم تذکرہ نگاروں نے اپنی کتابوں میں خیر رحمانی اور ان کی علمی بصیرت وآگہی کا تذکرہ ضرور کیا ہے جو تشنہ ہے۔

ادھر سال 2001 میں پروفیسر ناز قادری، بہار یونیورسٹی مظفر پور کی نگرانی میں اشرف مختار نے 'خیر رحمانی حیات وخدمات' پر تحقیقی مقالہ برائے پی، ایچ، ڈی لکھا تھا، جو کہ قابل ستائش اور مولانا موصوف کے لیے بہترین خراج تحسین ہے۔

'کلیات خیر' میں ڈاکٹر افتخار احمد نے کافی محنت و جانفشانی سے خیر رحمانی کی منظوم تخلیقات کے ساتھ چند نثری تحاریری کو بھی مجتمع کر دیا ہے، یقیناً یہ ایک بڑا کام ہے، جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے خیر رحمانی ایک مایہ ناز ادیب اور بالغ النظر صحافی بھی تھے متعدد رسائل وجرائد میں بحیثیت مدیر آپ کی ادارتی تحاریر شائع ہو چکی ہیں، کاش موصوف کی نثری نگارشات کو بھی ایک جگہ جمع کر دیا جاتا تو یہ بھی ایک بڑا اہم کام ہوتا سو سال قبل شائع ان نگارشات کو اخبار ورسائل سے حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا، اس کے لیے ڈاکٹر افتخار احمد جیسی دیوانگی وفرزانگی مطلوب ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ خیر بہیروی مختلف الجہات شخصیت کے حامل انسان تھے، موصوف بیک وقت ایک کہنہ مشق شاعر ہونے کے ساتھ ایک بلند پایہ ادیب، محقق، ناقد اور صحافی بھی تھے۔ تقریباً تمام اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی حمد، نعت، نظم، غزل، رباعی، مسدس، قطعہ، قطعات تاریخ، تہنیتی نظمیں، گیت، کہہ مکر نیاں، سہرے، اور بے شمار منظوم سپاس نامے بھی آپ کے دیوان میں شامل ہیں۔ اردو شاعری کے ساتھ آپ کی فارسی شاعری بھی بے مثل ہے۔ مولانا خیر بہیروی کی شاعری سے متعلق پروفیسر محمد کاظم نے لکھا ہے:

''مولانا ابوالخیر رحمانی کا کلام ملی اور قومی عناصر سے مزین ہے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملک کو انگریزوں کی حکمرانی سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے تو ہندو مسلم اتحاد کے لیے داعی ودعا گو رہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ قوم کے بچے ایک اور نیک ہوں اور اس کے لیے وہ علمی اور عملی کوشش بھی کیا کرتے تھے۔ مولانا رحمانی کا ایک نمایاں وصف ان کی متصوفانہ اور نعتیہ شاعری ہے۔

خیر رحمانی نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ ان کی فارسی اور اردو شاعری کے نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

آنکھ والا ہو تو دیکھے، جسے دل ہو سمجھے
ذرہ ذرہ ہے اس عالم کا بیان فطرت
درھرگل این بستان آن حسن نمایان است
آئینہ صد حیرت این صحن گلستان است
سر، سرنگوں ہے اپنا ہر دم مراقبے میں
جب سے یہ سن لیا ہے دل ہے مقام تیرا
دل نیست کاندر روشن کس جلوہ گر نباشد
آں چشم نیست ہرگز گو حق نگر نباشد

مولانا خیر نے رسول اکرم کی عقیدت ومحبت میں بڑی تعداد میں نعتیں بھی کہی ہیں نعت کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

تری صورت تو وہ صورت ہے کہ حق شیدا ہے
تیری ہی ذات سے یہ کون و مکاں پیدا ہے
دونوں ابروؤں کو دو مصرعۂ موزوں سمجھوں
بیت نبوی کے یہ محراب ہیں، کیا زیبا ہے
حوض کوثر کی صُراحی ہے بیاض گردن
یا کوئی کوثر و تسنیم پر پُل باندھا ہے

مولانا خیر وطن پرست ہندوستانی مسلمان تھے ہندوستان میں اتفاق واتحاد قائم کرنے کے لیے آپ نے بہت ساری قومی یکجہتی پر مشتمل نظمیں تحریر کی ہیں۔

اردو وفارسی کے مایہ ناز ادیب اور کہنہ مشق شاعر مولانا خیر رحمانی عرصۂ دراز تک علم وادب کی خدمت کرتے ہوئے 15 نومبر 1948 کو تقریباً 80 سال کی عمر میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اللہ پاک انھیں غریق رحمت کرے، آمین۔

■

Dr. Abdul Wadood Qasmi
H.O.D, K.S.College, L Sarai
Darbhanga - 846001 (Bihar)
Mob: 7979936725
Email:wadoodqasmi999@gmail.com

شفیع الدین نیّر اور بچوں کے غالب

اردو شعروادب کا دامن سدا سے حسین غنچہ وگل سے آراستہ رہا ہے۔جس کا دنیا نے بھی اعتراف کیا ہے۔ان میں شاعروادیب دونوں شامل ہیں۔ بچوں سے کس کومحبت اور ہمدردی نہیں ہوتی ہے۔اس لیے کچھ شعرا و ادبا نے ادب اطفال کا دامن نہایت کامیابی سے تھام لیا اور پوری زندگی نظم ونثر میں بچوں کے لیے برابر لکھتے رہے۔انھی میں سے ایک شخصیت کا نام شفیع الدین نیر ہے۔

نیر صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں برسوں تک درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے اور برابر لکھتے رہے۔ ان کی لکھی ہوئی نظمیں اور کہانیاں بچوں کے ماہنامہ کھلونا نئی دہلی سے برابر شائع ہوتی رہیں۔اس کے علاوہ دیگر ماہنامے بھی ان کی نظمیں اور کہانیاں شائع کرتے رہے۔

بچوں کا ادب لکھنا بظاہر جتنا آسان معلوم ہوتا ہے حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی دیگر اصناف ادب کی مانند ایک اہم صنف ہے۔ بچوں کا ادیب یا شاعر بننے کے لیے بچوں کی عمر،نفسیات اور علمی صلاحیت کا خیال ہر لمحے رکھنا لازمی ہوتا ہے۔تبھی ایک فنکار اپنے ہنر کا کامیاب مظاہرہ کر پاتا ہے۔خدا نے یہ تمام خوبیاں نیر صاحب کی ذات میں شامل کر دی تھیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اس میدان میں ہمیشہ کامیاب رہے۔

شفیع الدین نیر نے سات آٹھ برس کے بچوں کے لیے بھی لکھا،آٹھ سے گیارہ برس کے بچّوں کے لیے بھی لکھا اور گیارہ سے چودہ برس کے بچوں کے لیے بھی بہت کچھ لکھا۔اس کے علاوہ انھوں نے اردو کے ایک بڑے شاعر مرزا غالب کی زندگی اور فن کے حوالے سے بھی ایک چھوٹی سی کتاب غالب کی کہانی کے عنوان سے بھی لکھ ڈالی۔

مرزا غالب کا اصل وطن تو آگرہ تھا لیکن جب وہ شادی کے بعد دارالخلافہ دہلی میں مقیم ہوئے تو اسی شہر کی ایک معروف شخصیت بن گئے۔ یہاں تک کہ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا استاد بننے کا شرف بھی انھیں حاصل ہوا۔مرزا غالب بلا کے ذہین تھے۔فارسی زبان پر انھیں دسترس حاصل تھی اور انھوں نے اپنا ایک دیوان فارسی میں بھی ترتیب دیا تھا۔ بعد میں وہ اردو کی جانب راغب ہوئے اور دیوان غالب اردو میں بھی ترتیب دیا۔ ان پر مشکل پسندی کا الزام بھی لگا جس کی انھوں نے وقت رہتے اصلاح بھی کر لی اور سہل الفاظ کا دامن تھام لیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انیسویں صدی عیسوی میں تمام شعرا پر غالب آگئے۔

مرزا غالب (1797-1869) کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کو اس وقت چار چاند لگا جب ان کی وفات کے سو سال گزرنے پر ان کی صد سالہ جوبلی تقریب منانے کا خیال اردو ادب کے بہی خواہوں کے دل میں آیا۔ اس وقت اس ملک کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین تھے۔انھوں نے مرزا غالب کی حیات وشاعری سے بچوں کو آگاہ کرنے کے لیے ایک کتابچہ لکھنے کا حکم شفیع الدین نیّر صاحب کو دیا جسے انھوں نے بحسن وخوبی انجام دیا۔اس کتابچے کا نام ''غالب کی کہانی'' رکھا گیا۔ آج میں اسی کتابچے کے حوالے سے آنے والی نسلوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کتابچہ نہایت سلیس و سادہ زبان میں لکھا گیا ہے اور آج بھی اپنی مقبولیت اور اثر آفرینی کے ساتھ زندہ و باقی ہے۔اس کتابچے کی زبان وبیان کا لطف لیجیے:

''اردو میں ہزاروں شاعر اور ادیب ہوئے ہیں اور ہزاروں آج بھی موجود ہیں مگر اس زبان کی نظم ونثر میں جو مرتبہ مرزا غالب کا ہے وہ کسی اور شاعر یا ادیب کا نہیں''۔

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

''اب تو حال یہ ہے کہ جہاں بھی شعروشاعری کا چرچا ہوتا ہے غالب ہی غالب نظر آتے ہیں''۔

اب ذرا انصاف کی نظر سے دیکھیے تو نیّر صاحب نے کتنے سادہ وسہل انداز میں مرزا غالب کی حیات و شاعری کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے جو کم سے کم الفاظ میں دوسروں سے ممکن نہیں۔اب ذرا آگے چلیے تو پائیں گے کہ دہلی میں ان کے قیام کی اصل وجہ کیا تھی؟

''شادی کے وقت ان کی عمر تیرہ سال تھی اور ان کی بیوی کی عمر گیارہ سال۔۔۔ کچھ اس رشتے کی وجہ سے،اور کچھ دلّی کی دل لینے والی ادا کے سبب انھوں نے اس شہر میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔''

شروع میں مرزا غالب کی شاعری مشکل پسند تھی اور عوام کے لیے اس کا سمجھنا کافی دشوار تھا چنانچہ محمد حسین آزاد (آب حیات) کے مطابق مرزا آغا جان عیش نے ایک ادبی محفل میں یہ قطعہ کہہ کر ان کا مذاق اڑایا کہ

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے، اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلامِ میر سمجھے اور بیانِ میرزا سمجھے
مگر اپنا کہا تم آپ سمجھو یا خدا سمجھے

پھر تو ان کا کلام ایسا ہوگیا کہ بہت سے شعرا اپنی سادگی کی بنا پر سہل ممتنع میں شمار ہوتے ہیں یعنی ایسے کہ ان سے زیادہ سہل ممکن نہیں۔

مرزا غالب کی زندگی میں کافی نشیب و فراز بھی آئے۔ مغلیہ حکومت کے خاتمے پر گویا ان پر پریشانیوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ نیّر صاحب اس کا ذکر کس قدر سادہ و سہل الفاظ میں کرتے ہیں، ملاحظہ ہو۔

''قلعہ معلّٰی سے طویل تعلق، سات سال تک تاریخ نویسی کی خدمت، تین چار برس بادشاہ کی استادی کا شرف آزادی کی پہلی جنگ کی ناکامی کے بعد ختم ہوا۔ مغلیہ حکومت کی بساط الٹ گئی۔ نہ قلعہ کی ملازمت رہی نہ مشاعرے، نہ قلعہ کی رنگا رنگ زندگی۔۔۔ آں قدح بہ شکست وآں ساقی نماند۔''

یوں تو دہلی کے گردونواح میں غالب کے سینکڑوں شاگرد اور مدّاح موجود تھے جن سے ان کا تعلق برابر قائم تھا لیکن

''دہلی کی تباہی کے بعد نواب رامپور یوسف علی خاں ناظم، شعر و شاعری میں مرزا کے شاگرد بنے تو انھوں نے سو روپیہ ماہوار ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ وظیفہ نواب صاحب کی وفات کے بعد ان کے جانشین نواب کلب علی خان کی سرکار سے بھی مرزا کو تا دمِ حیات ملتا رہا۔ تین برس بعد پنشن بھی جاری ہوگئی۔ کچھ آمدنی ادھر ادھر سے ہوتی رہی۔ غرض کہ ان کی گزر بسر کا سامان ہوگیا۔''

یوں تو مرزا غالب نے ساری عمر کرائے کے مکان میں بسر کی اور آخری مکان گلی قاسم جان کا مکان تھا جہاں انھوں نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں لیں۔ اسے موجودہ وقت میں حکومت دہلی نے ''مکانِ غالب'' کے نام سے موسوم کر کے ایک بورڈ آویزاں کر دیا ہے اور اسے آثار قدیمہ کے سپرد کر دیا ہے۔

نیر صاحب نے کم سے کم الفاظ اور سہل انداز میں مرزا کی وفات اور جائے مدفن کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

''15 فروری 1869 عیسوی کو تہتر برس چار مہینے کی عمر میں مرزا صاحب نے اس دنیا سے کوچ فرمایا۔ حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ کے باہر جنوب مشرق کی طرف اپنے خسر جناب نواب الٰہی بخش کے قریب دفن کیے گئے۔''

سچ تو یہ ہے کہ ایک حقیقی شاعر یا ادیب کا احساس اور تخیل عام لوگوں کے مقابلے میں کافی مضبوط اور جاندار ہوتا ہے۔ اس کے سینے میں ایک ایسا دل ہوتا ہے جو موم کی طرح پگھلنے کی خاصیت بھی رکھتا ہے اور پتّھر کی طرح سخت بھی ہوتا ہے۔ اس میں روانی کے علاوہ گہرائی اور گیرائی بھی ہوتی ہے۔مرزا غالب کی ذات میں یہ خوبی رب کائنات نے بدرجہ اتم ودیعت کر رکھی تھی جس کا اظہار وہ اپنی شاعری اور نثر نگاری میں برابر کرتے رہے اور میر تقی میر کے بعد اردو کے سب سے بڑے غزل گو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

اب ان کی شاعری کی جانب ایک نظر ڈالتے چلیں۔ مرزا غالب ایک عظیم شاعر ہونے کے کے ساتھ ایک شگفتہ بیان شخصیت بھی تھے۔ ان کی اس خوبی کی وجہ سے مولانا حالی نے انھیں ''حیوانِ ظریف'' کا لقب دیا تھا اور ان کی حیات و کارنامے پر سب سے پہلی سوانح ''یادگار غالب'' لکھی تھی۔

دراصل شاعری ایک فطری اور خدا داد ملکہ ہے اور اس میں مطالعہ فطرت کی رہنمائی میں روز افزوں ترقی ہوتی رہتی ہے۔ مرزا غالب بھی اس بات سے آگاہ تھے۔ چنانچہ وہ اپنے خیالات میں جدت و رنگا رنگی پیدا کرنے کو مناسب خیال کرتے تھے۔ وہ خود ہی لکھتے ہیں

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

واقعی یہ شعر مرزا غالب کی پوری علمی و ادبی زندگی کا ایک روشن آئینہ ہے جس کا سبھی نے اقرار کیا ہے۔ یہ بات ہم سبھی جانتے ہیں کہ تخیل و جذبات ہر انسان کے دل میں برابر اٹھتے ہیں اور کچھ دیر بعد غائب بھی ہوجاتے ہیں۔ مرزا غالب اس کا اقرار یوں کرتے ہیں

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ایک شاعر یا ادیب اس کی بدولت ہی اپنی شناخت پیدا کرتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم ہر شخص کو شاعر یا ادیب نہیں مانتے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک حقیقی شاعر یا ادیب کا احساس اور تخیل عام لوگوں کے مقابلے میں کافی مضبوط اور جاندار ہوتا ہے۔ اس کے سینے میں ایک ایسا دل ہوتا ہے جو موم کی طرح پگھلنے کی خاصیت بھی رکھتا ہے اور پتّھر کی طرح سخت بھی ہوتا ہے۔ اس میں روانی کے علاوہ گہرائی اور گیرائی بھی ہوتی ہے۔ مرزا غالب کی ذات میں یہ خوبی رب کائنات نے بدرجہ اتم ودیعت کر رکھی تھی جس کا اظہار وہ اپنی شاعری اور نثر نگاری میں برابر کرتے رہے اور میر تقی میر کے بعد اردو کے سب سے بڑے غزل گو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میر کو عزت و شہرت ان کی زندگی میں پوری طرح نصیب ہو چکی تھی اور غالب کو ان کی وفات کے سو سال بعد قدر دان ملے۔ میر کا اسلوب آج بھی قابلِ ستائش ہے اور بیسویں صدی میں بھی اس اسلوب کی پیروی کرنا ہمارے شاعر پسند کرتے ہیں۔ میر نے خود لکھا ہے اور بالکل درست لکھا ہے کہ

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

آج جب کہ ہم اکیسویں صدی کی ربع صدی پار کر چکے ہیں میر ہمیں آج بھی پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت آج بھی باقی ہے۔ دوسری جانب غالب بھی غالب ہیں۔ آج بے شمار ماہر غالبیات پیدا ہو چکے ہیں جو غالب کے فکر و فن کے اہم نکتے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح غالب کی عظمت کا سکّہ آج بھی رائج ہے۔

مرزا غالب نے اپنے دلی جذبات کا اظہار نظم و نثر دونوں میں کیا ہے۔ ساتھ ہی ادب کے قارئین کو یہ بھی درس دیا ہے کہ

''شاعری ایک فطری ملکہ ہے، یہ ملکہ پیدائشی ہوتا ہے۔ فطرت ہی کی رہنمائی میں اس کی جلا ہوتی ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

ایک بڑا شاعر اپنی فطری صلاحیت کی بنیاد پر نئے

نئے خیالات و مضامین اس جدت کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ اس میں ایک خاص جاذبیت اور جان پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر کوئی اس کی شاعری پر دیوانہ اور فریفتہ ہوتا ہے۔ مرزا غالب نے غزلیں، قصائد، مثنوی اور مرثیہ سب کچھ لکھا جو اپنی جگہ سب سے منفرد اور جدا ہیں اور جس کا اقرار ادب کے تمام قارئین آج بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ خواجہ الطاف حسین حالی جو ان کے شاگرد بھی رہ چکے ہیں وہ ''مرثیۂ غالب'' میں اس خوبی کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹھول
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

بیسویں صدی میں علامہ اقبال نے بھی غالب کی شاعرانہ عظمت کا اقرار اس طرح کیا ہے:

لطف گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

مرزا غالب کے متعلق ایک عام خیال ہے کہ انھوں نے صرف بڑے لوگوں کے لیے لکھا اور بچوں کے لیے کچھ نہیں لکھا۔ ان کے کلام میں اخلاقی تعلیم بھی موجود ہے جو بڑے اور چھوٹے سب کے لیے یکساں ہے۔ بچوں کے لیے بھی ان کا مطالعہ ضروری ہے۔ مثلاً یہاں دو مثالیں دیکھیے

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

ایک شعر اور دیکھیے

جو مدعی بنے دیکھیے نہ مدّعی بنیے
جو نا سزا کہے اس کو نہ نا سزا کہیے

غالب نے تقریباً دو صدی قبل کہا تھا گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

مرزا غالب کے کلام میں حق گوئی و بے باکی بھی موجود ہے جس کے متعلق نیر صاحب اس طرح لکھتے ہیں۔

نرمی کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی اپنے دل کی سچی بات کہنے سے گریز کرے۔ پھر تو کسی کو حق بات کہنے کا موقع ہی نہ رہے گا۔ خدا کے بندے تو ایسے بھی ہوئے ہیں کہ جنھوں نے پھانسی کے پھندے پر حق بات کہی ہے۔ وقت کی مصلحت یا کسی بھی نوع کے خوف نے

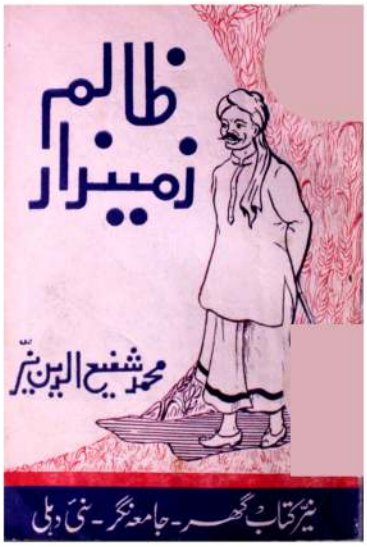

مرزا صاحب کے ان خطوں کی وجہ سے اردو کی نثریں سادہ لکھی جانے لگیں۔ ان خطوں کی اشاعت نے اردو میں سلاست و سادگی اور لطافت و ظرافت کی ایک نئی راہ دکھائی۔ ایسی راہ جس پر چل کر اردو نثر کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

انھیں اپنے دل کی بات کہنے سے باز نہیں رکھا۔ مرزا غالب اسی حق گوئی اور آزاد خیالی کی تعلیم دیتے ہیں۔

جی ہی میں کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے، نہ رہیں پر کہے بغیر

شاعری کے ذکر کے بعد نیر صاحب نے مرزا غالب کی نثر نگاری کا ذکر کرتے ہوئے ان کی دو کتابوں کا نام لیا ہے۔ ایک کا نام ''عودِ ہندی'' اور دوسرے کا ''اردوئے معلّٰی'' ہے۔ ان دونوں کتابوں کے متعلق وہ یوں لکھتے ہیں:

''ان کا کلام عام اردو شاعروں سے الگ اور ممتاز نظر آتا ہے۔ یہی حال ان کی نثر کا ہے۔ ان کی نثر سیدھی سادی ہے۔ آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے مگر ایسی دل کو لبھانے والی کہ کسی مزیدار کہانی کی طرح اسے بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ یہ وصف ان کے نجی خطوں میں خاص طور پر نظر آتا ہے۔''

خود مرزا غالب کا بھی اپنی خطوط نگاری کے متعلق بیان بھی ملاحظہ ہو۔ وہ اپنی تصنیف ''پنج آہنگ'' میں اس طرح لکھتے ہیں:

''لکھنے کا میرا طریقہ یہ ہے کہ خط کا کاغذ اور قلم ہاتھ میں لے کر، اور جس کو خط لکھ رہا ہوں اس کے مرتبے کا لحاظ رکھ کر مناسب لفظ سے اسے خطاب کرتا ہوں اور اپنا مدعا لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ وہ جو القاب و آداب اور خیریت و خیر و عافیت کا دستور ہے اور جس سے خط خواہ مخواہ طویل ہو جاتا ہے، نظر انداز کرتا ہوں۔ خط و کتابت میں جو لوگ پختہ ہوتے ہیں وہ ان فضول باتوں سے پرہیز کرتے ہیں۔''

اس کے علاوہ مرزا غالب کا ایک بیان اور بھی ملاحظہ ہو۔ وہ حاتم علی مہر کے نام لکھے گئے ایک خط میں یوں لکھتے ہیں:

''مرزا صاحب، میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو اور ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔''

درج بالا بیانات کا بہ غور مطالعہ کرنے کے بعد نیر صاحب غالب کی اردو نثر کے متعلق اپنی رائے کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

''مرزا صاحب کے ان خطوں کی وجہ سے اردو کی نثریں سادہ لکھی جانے لگیں۔ ان خطوں کی اشاعت نے اردو میں سلاست و سادگی اور لطافت و ظرافت کی ایک نئی راہ دکھائی۔ ایسی راہ جس پر چل کر اردو نثر کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔''

نیر صاحب کا یہ تجزیہ حرف بہ حرف درست ہے۔ ان کی وفات کے بعد بھی جب غالب کے خطوط کو لوگوں نے تلاش کیا تو وہ بھی دستیاب ہو گئے جن کو مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے ''مکاتیبِ غالب'' کے نام سے، مولانا غلام رسول مہر نے ''خطوطِ غالب'' کے نام سے، آفاق دہلوی نے ''نادراتِ غالب'' کے نام سے، اور ڈاکٹر خلیق انجم نے ''خطوطِ غالب'' کے نام سے یکجا کر دیا ہے۔

اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو نیر صاحب نے بچوں کے لیے غالب شناسی کی ایک ایسی راہ ہموار کر دی ہے جو ان سے پہلے کسی شاعر یا ادیب کے حصے میں نہیں آئی تھی۔ اس لحاظ سے اگر غالب جیسے عظیم شاعر کی شاعری اور شخصیت پر کوئی پر اثر کتاب لکھی گئی ہے تو اس فہرست میں ''غالب کی کہانی'' کا نام بھی شامل رہے گا۔

■

Abdul Naseer
At: Pakthoul, P.O: Khizer Chak
Distt: Begusarai 851112 (Bihar)
Mob: 9718941763
Email: abdulnaseer.jnu@gmail.com

اسد رضا کی ادبی و فکری شخصیت

محمد نوشاد عالم ندوی

اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت ہمیشہ سے فکری گہرائی اور سماجی شعور کی حامل رہی ہے۔ مرحوم اسد رضا اسی روایت کے ایک اہم اور نمایاں نام تھے جنھوں نے اپنے منفرد اسلوب، شگفتہ بیانی اور باریک سماجی مشاہدے کے ذریعے طنز و مزاح کو محض تفریح نہیں بلکہ فکر و اصلاح کا ذریعہ بنا دیا۔ زیر نظر مضمون میں ان کی ادبی خدمات، صحافتی کردار اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

مراد آباد کے محلّہ لاکڑی والان میں 2 جنوری 1952 کو پیدا ہونے والے اسد رضا اردو ادب کی ان نابغۂ روزگار شخصیات میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقی بصیرت، شگفتہ بیانی اور فکری گہرائی سے ادب کو وقار اور معاشرے کو شعور عطا کیا۔ وہ اردو ادب کی ہمہ گیر شخصیت تھے جنھوں نے شعر و نثر، سنجیدگی و شگفتگی، فکر و تفریح اور اصلاح و تنقید کو ایک خوبصورت توازن کے ساتھ یکجا کیا۔ وہ محض ایک شاعر یا مزاح نگار نہیں بلکہ ایک باخبر سماج شناس، باریک بیں نقاد اور حساس انسان تھے جن کی تحریر قاری کو ہنساتے ہنساتے سوچنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ وہ بیک وقت شاعر بھی تھے، نثر نگار بھی اور ایسے مزاح نگار جن کا طنز قہقہوں کے پردے میں اصلاح کا پیغام لیے ہوتا تھا۔ ان کی وفات اردو ادب کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے، مگر ان کا ادبی سرمایہ آج بھی زندہ اور مؤثر ہے۔ وہ ایک باشعور اور دردمند دل رکھنے والے انسان تھے۔ وہ اپنے عہد کے سماجی، اخلاقی اور فکری مسائل سے گہری آگاہی رکھتے تھے اور اپنی تحریروں کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کی کوشش کرتے رہے۔ ان کا قلم نرم لہجے میں بھی سچ کہنے کی جرأت رکھتا تھا۔

دیکھ کر یہ نمائش کی دنیا اسد
ہم نے محسوس کی سادگی کی طلب

مرحوم اسد رضا نے نمائش، دکھاوے اور بناوٹ سے بھری ہوئی دنیا کو غور سے دیکھا تو ان کے دل میں اس کے برعکس ایک احساس جاگا، یعنی سادگی کی طلب۔ یہ شعر دراصل مادی اور مصنوعی زندگی پر ایک خاموش تنقید ہے اور ساتھ ہی ایک اندرونی خواہش کا اظہار ہے کہ انسان بناوٹ چھوڑ کر سچائی اور سادگی کی طرف لوٹے۔

انھوں نے صحافت کے میدان میں کئی دہائیوں پر محیط خدمات انجام دیں۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے اور ان کا شمار ان صحافیوں میں ہوتا تھا جنھوں نے خبر، ادب اور طنز و مزاح کو وقار کے ساتھ برتا۔ خاص طور پر ان کا مقبول کالم 'تلخیاں' اردو صحافت میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے، جو مسکراہٹ کے ساتھ قاری کو فکر کی گہرائی میں لے جاتا تھا۔

نثر میں مرحوم اسد رضا کا اسلوب بے ساختہ، رواں اور دل نشیں تھا۔ ان کے مضامین اور تحریریں روز مرہ زندگی کے عام مشاہدات سے جنم لیتی ہیں، مگر معنوی سطح پر گہرے سماجی شعور کی عکاس ہوتی ہیں۔ وہ چھوٹے واقعات کے ذریعے بڑے مسائل کو اجاگر کرنے کا غیر معمولی ہنر رکھتے تھے۔ ان کی نثر میں سچائی، شائستگی اور ذہانت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔

مرحوم اسد رضا کی شاعری احساس و ادراک کی آئینہ دار ہے۔ ان کے اشعار میں زندگی کے نشیب و فراز، انسانی کمزوریاں، سماجی تضادات اور داخلی کرب نہایت سلیقے اور سادگی کے ساتھ نمایاں ہوتے ہیں۔ وہ روایت اور جدت کے حسین امتزاج سے ایسی شاعری تخلیق کرتے ہیں جو بیک وقت دل کو چھوتی اور ذہن کو جھنجھوڑتی ہے۔

ملتی ہے خموشی سے ظالم کو سزا یارو
اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی

انھوں نے اپنی تحریر سے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ خاموش معاشرہ مردہ نہیں ہوتا، وہ فیصلہ کر رہا ہوتا ہے۔ ان کا یہ شعر صبر، یقین اور عدلِ الٰہی پر اعتماد کا پیغام دیتا ہے۔

اپنے پڑوسیوں کو بھی پہچانتا نہیں
محصور اپنے خول میں اب فرد فرد ہے

یہ شعر سماجی تنہائی کی بڑی گہری تصویر پیش کرتا ہے۔ یعنی ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں، مگر ایک دوسرے کے ساتھ نہیں جیتے۔ یعنی معاشرہ بظاہر لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ مگر حقیقت میں ہر شخص تنہا ہے۔

انھوں نے اپنے اس شعر میں پڑوسیوں کے حقوق کی طرف اشارہ کیا ہے جو آج کے دور میں تقریباً معدوم ہو چکے ہیں۔ یعنی انھوں نے اپنی شاعری سے سماج کی ہر ممکن اصلاح کی کوشش کی ہے۔

دین انسانیت کے جوہر سے
اے خدا ہم کو بھی مشرف کر

یہ شعر دعا، شکوہ اور تمنا تینوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ دین کی اصل روح انسانیت کا جوہر ہے۔ رحم، عدل، محبت، برداشت اور احترام۔ اے خدا، ہمیں بھی ایسا بنا دے کہ ہم دین کو انسانیت کے ذریعے جئیں۔ اے خدا! ہمیں مذہبی نہیں، انسان بننے کی توفیق دے اور وہی اصل دینداری ہے۔ یعنی انسانیت کے بغیر دینداری محض خول رہ جاتی ہے۔

مرحوم اسد رضا کو طنز و مزاح کا بے تاج بادشاہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کا مزاح نہ سطحی تھا اور نہ بے مقصد۔ وہ ہنساتے بھی تھے اور سوچنے پر مجبور بھی کرتے تھے۔ ان کا طنز مہذب، شائستہ اور کاری ضرب رکھنے والا تھا۔ وہ سماجی منافقت، فرسودہ روایات، ناانصافی

اور انسانی خودفریبی کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے، مگر کبھی اخلاقی حدود سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔ بلاشبہ طنز و مزاح میں ہنسنے ہنسانے اور زندگی کی تلخیوں کو قہقہے میں اڑانے کی سکت بھی ہوتی ہے اور مزاح کے پہلو میں زندگی کی ناہمواریوں اور انسانوں کے غلط رویوں پر طنز کرنے کا موقع بھی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ طنز اور مزاح کے پیرائے میں ایک تخلیق کار وہ سب کہہ جاتا ہے جس کے اظہار کی عام زندگی میں توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔ طنز و مزاح نگاری زندگی کی ناہمواریوں اور مضحکہ خیز صورت حال کو دلچسپ انداز میں پیش کرنے کا اسلوب ہے۔ طنز اور مزاح میں گہرا تعلق ہے۔ اردو ادب میں طنز و مزاح کی کئی شکلیں پائی جاتی ہیں، جیسے نثر میں طنزیہ مزاحیہ افسانے، ناول، خاکے، سفرنامے، خطوط اور انشائیے وغیرہ۔ شعری طنز و مزاح میں ہزل، تمسخر، استہزا، پیروڈی، تضمین، اور قطعات وغیرہ طنز و مزاح کے میدان میں کئی شعرا اور ادیبوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے، جن میں اکبرالہ آبادی، علامہ اقبال، منشی سجاد حسین، رضا واہی نقوی، عادل لکھنوی اور ساغر خیامی وغیرہ نے طنز و مزاح کو شاعری کے ذریعہ ایک نئی بلندی تک پہنچایا۔ طنز و مزاح ان کی شاعری میں محض دل لگی نہیں بلکہ ایک سنجیدہ فکری جہت رکھتا ہے۔

اسد رضا نے قومی اور بین الاقوامی سیاست اور حالات پر بہ کثرت مضامین تحریر کیے لیکن ان کے اندر مزاح اور طنز کی ایک زبردست حس موجود تھی جس نے ان سے مزاحیہ ادب تخلیق کرایا۔ یہ بھی کم ہی دیکھا گیا ہے کہ کوئی طنز و مزاح نگار بچوں کا ادب بھی تحریر کرے۔ اسد رضا کے اندر یہ دونوں خوبیاں موجود تھیں۔ ان کے قلم نے بچوں کے لیے مزاحیہ مضامین بھی لکھے، نظمیں بھی لکھیں اور کہانیاں بھی تحریر کیں۔ ان کا تخلیق کردہ بچوں کا ادب اتنا معیاری ہے کہ ساہتیہ اکادمی نے انھیں اس کے لیے انعام سے نوازا اور بچوں کے لیے تحریر کہانی 'چاند نگر کی سیر' کو مغربی بنگال حکومت نے چھٹی کلاس کے نصاب میں شامل کیا ہے۔ ان کے طنز کی خاص بات یہ ہے کہ وہ چیختے نہیں، الزام نہیں لگاتے، بلکہ سادہ اور نرم جملوں میں گہری بات کہہ جاتے تھے۔ وہ سماجی منافقت، فرد کی تنہائی اور خودغرضی وغیرہ پر طنز کرتے تھے۔ گویا ان کا طنزیہ کلام معاشرے پر ہنسی نہیں، معاشرے کے رویوں پر خاموش آنسو ہے۔

مرحوم اسد رضا طنز و مزاح میں نئے نئے تجربے کرتے رہتے تھے۔ وہ آئینہ خاموشی سے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ ان کا طنز قہقہہ نہیں، ایک خاموش سوال ہے۔ یہ طنز انچے کے موجد بھی رہے۔ 'طنز انچے' کے نام سے ان کی ایک کتاب بھی شائع ہوچکی ہے۔ 'تلخیاں' کے عنوان سے ان کا کالم کافی مشہور و مقبول ہوا۔ طنز و مزاح سے خاص دلچسپی کی وجہ سے اس میدان میں بھی انھیں خاصی شہرت ملی۔ طنز و مزاح سے آراستہ ان کے کئی مجموعے اور کتابیں شائع ہوکر قبول عام حاصل کرچکی ہیں۔ ان کی مطبوعات کی مجموعی تعداد 22 ہے۔ ان میں شوخی قلم، ننھے منوں کی سرکار، چاند نگر کی سیر، شہر احساس، شوشے، طنز انچے، کرکٹی مشاعرہ، ادبی اسپتال، آئینے احساس کے، اتر پردیش میں اردو میڈیا۔ ماضی،

حال اور مستقبل وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ عالمی سہارا کی خصوصی اشاعتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ قومی و بین الاقوامی سمپوزیم و سمینار میں سرگرم شرکت اور ریڈیو، ٹیلی ویژن پر نشریات نے بھی گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ ماہنامہ شگوفہ (حیدرآباد) نے ان پر خاص نمبر شائع کیا۔ میرٹھ یونیورسٹی میں ان پر ایم فل کا مقالہ لکھا گیا جو ان کی مقبول شخصیت کا گواہ ہے۔ 115 ادبی وثقافتی تنظیموں اور اداروں نے انھیں انعامات و اعزازات سے نوازا۔ وہ ایک خوش مزاج، ذہین اور وسیع المطالعہ انسان تھے، اپنے عملے کے ساتھ گھل مل کر رہتے تھے۔ راقم الحروف نے کافی دنوں تک ان کے ساتھ کام کیا ہے۔ وہ ہمیشہ شفقت اور محبت سے بلاتے تھے، ہمیشہ اپنے ماتحتوں کا خیال رکھتے تھے۔ بڑی سے بڑی غلطی پر بھی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتے تھے، بلکہ بہت ہی نرم لہجہ میں اور مشفقانہ انداز میں سمجھا دیتے تھے۔ ایک بار ہم جب ڈیوٹی ختم کرکے ان کے ساتھ اسٹاف بس میں گھر جارہے تھے تو راستے میں ایک بات پر میں نے کچھ عرض کیا تو وہ لمحہ بھر کے لیے الجھے ضرور، لیکن معاً بعد ایک بڑے بھائی کی طرح ہنس کر کہنے لگے 'مائی ڈیئر' غصہ مت ہونا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ اتنے بڑے عہدے پر ہونے کے باوجود انھوں نے میری غلطی کو فوراً معاف کردیا اور ناصحانہ انداز میں کہا 'ہمیشہ اپنے بڑوں کی عزت کرو، دوسروں کے بہکاوے میں نہ آؤ' ان کی یہ بات آج تک یاد ہے، بلکہ جب بھی اپنے سے بڑوں سے کوئی ناراضگی ہوتی ہے، تو ان کا یہ جملہ یاد آجاتا ہے اور پھر اس کو دماغ سے نکال دیتا ہوں۔ ان کی رحلت سے اردو صحافت اور ادب ایک ایسی قیمتی آواز سے محروم ہوگیا ہے جس کی گونج دیر تک محسوس کی جاتی رہے گی۔ وہ نہایت مخلص، اپنے ساتھیوں پر اعتماد کرنے والے انسان تھے۔ زندگی کی آخری سانس لینے سے محض ایک روز قبل انھوں نے اپنے گھر بلاکر راقم الحروف کو اپنی تازہ کتاب 'ظرافستان' تبصرہ کے لیے دی۔ اسی بہانہ میری ان سے آخری ملاقات ہوئی۔ ورنہ شاید دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی ایک مخلص، رحم دل اور بے لوث مشفق انسان کے دیدار سے محروم رہ جاتا۔ انھوں نے آخری ملاقات میں ایک کتاب ترتیب دینے کی بات بھی کہی، جس پر میں نے کہا کہ سر! 'کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل' ہم جیسے چھوٹوں کو بس تبصرہ تک ہی محدود رکھیے، لیکن انھوں نے برجستگی سے کہا، نہیں میاں، تم اس کام کو بخوبی کرسکتے ہو، میں تمھیں سہارا سے جانتا ہوں۔ خیر، یہ تھی ان کی شفقت اور چھوٹوں پر اعتماد۔

مختصر یہ کہ، مرحوم اسد رضا ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت تھے جنھوں نے اردو ادب کو وقار، شگفتگی اور فکر کی دولت سے مالا مال کیا۔ ان کی تحریریں آج بھی قاری کو محظوظ کرنے کے ساتھ ساتھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ وہ جسمانی طور پر ہم میں موجود نہیں، مگر اپنے الفاظ، خیالات اور تخلیقات کے ذریعے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ وہ کہنہ مشق شاعر اور طنز و مزاح کے باوقار قلمکار تھے جنھوں نے اردو ادب اور صحافت کو وقار بخشا۔ اردو ادب میں ان کا نام بطور طنز و مزاح ہمیشہ احترام سے لیا جاتا رہے گا۔

■

Mohd Naushad Alam Nadvi
E-167, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025
Email: mohdnaushad14@gmail.com
Mob. 9015763829 , 8826096452

راج کپور

بالی ووڈ کا ستارہ

ف۔س۔اعجاز

راج کپور (1924-1988) لوگوں کے چہیتے اداکار تھے اور باذوق فلم بینوں میں اپنی تکنیکی صلاحیتوں، ترقی پسندی، اور کہانی کے موضوع کے ساتھ کامیاب برتاؤ کی وجہ سے بے حد مقبول تھے۔ جتنا کچھ راج کپور ہمیں دے گئے اُس سے سوا اور اس سے بہتر دینے کا ارمان ان کے دل میں تھا۔

ایک کلیپر بوائے سے لے کر ہیرو بننے تک کا سفر انھوں نے بڑے پُر پیچ راستوں سے طے کیا اور ہیرو کا مقام حاصل کرنے سے پہلے سنیما تکنیک کے ہر ہر پہلو پر دسترس حاصل کر لی تھی۔ اس علم نے بعد میں اداکاری، ہدایت کاری، منظر نامہ نگاری، صدا بندی، ادارت، موسیقی اور فوٹو گرافی کے شعبوں میں اُن کی بہت مدد کی۔ اپنے والد پرتھوی راج کپور یا اساتذہ کیدار شرما اور وی شانتارام وغیرہ کے لیے راج کپور ساری عمر ایک سعادت مند اولاد اور شاگرد ہی بنے رہے۔ اور پرستاروں کی نیک خواہشات کے علاوہ ماں باپ اور بزرگوں کی دعاؤں کے طفیل دولت اور عظمت بیک وقت حاصل کرتے رہے۔

راج کپور نے جب ہوش سنبھالا اور ''آگ'' اور ''آہ'' فلم کے تجربوں کے ناکام پہلوؤں پر غور کیا تو اپنی اداکاری اور ہندوستانی فلم سازی میں ایک نئی طرز کو جنم دیا جسے فلمی تجارت میں فارمولا کہتے ہیں۔ اور جس کی بدولت بعد میں انھیں ہندی فلمی صنعت کے ''شومین'' کا لقب دیے دیا گیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ''فارمولا'' اور ''شومین'' سنجیدہ کام کرنے والوں کے لیے یہ کچھ غیر مناسب اور محض تجارتی اصطلاحیں ہیں۔ کیونکہ فلسفہ فارمولا نہیں ہوتا اور زندگی کو زندگی کی طرح پیش کرنا ''شومینی'' یا دکھاوا نہیں بلکہ آرٹ ہے۔ راج کپور کو شومین کہنا ایک طرح سے عظیم فلم ساز و اداکار کی ذہانت کو پس پشت ڈال دینا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ راج کپور نے اپنے تئیں شومین نہیں کہلانا چاہا بلکہ اپنے کیریئر کے ذریعہ یہ بتانا چاہا ہے کہ یہ دنیا ''شو ورلڈ'' ہے۔ یا بقول شیکسپیئر دنیا ملنے اور بچھڑنے کا اسٹیج ہے۔

راج کپور نے اداکاری کو تخلیق کیا، اسے پہنا اور اوڑھا نہیں۔ ان کے جوتے جاپانی، پتلون انگلستانی اور ٹوپی روسی ضرور تھی لیکن انکا دل ہندوستانی ہی تھا۔ جب انھیں یہ ادراک حاصل ہوا کہ ہندوستان کے لاکھوں اور کروڑوں معصوم اور ناخواندہ لوگوں سے ان کا واسطہ پڑنے والا ہے اور ان کے دلوں میں انھیں گھر کرنا ہے تو سب سے پہلے انھوں نے اپنے ہم وطنوں کی سادگی اور معصومیت پر غور کیا۔ پھر اس پر غور کیا کہ کس طرح وہ خود کو اور اپنی فلموں کو ان سادہ لوح عوام کے لیے قابل قبول بنائیں۔ انھوں نے ضرور یہ سوچا ہوگا کہ وہ اپنی فلموں میں آج کے 'سپر مین' کے برخلاف پردۂ فلم پر ایک معمولی انسان کے روپ میں نظر آئیں گے تو عوام ان کے بارے میں پُر مسرت ہو کر کہیں گے کہ ''یہ ہم میں سے ایک ہے۔ اور ہمارے جیسا ہے''۔ راج کپور کو اپنے ناظرین کی مسرت اور محبت سے اٹوٹ رشتہ قائم کرنا تھا۔ اس کے لیے انھوں نے اپنی ذہانت کو بروئے کار لا کر مشہور زمانہ مزاحیہ اداکار چارلی چپلن کے انداز کی ٹوپی اور پتلون کا استعمال کرنا شروع کیا۔ یہ استحصال اس وقت بہت مقصدی اور تخلیقی ثابت ہوا۔ راج کو کردار کی باطنی سادگی اور معصومیت کے اظہار کے لیے ایک موثر لباس مل گیا جسے آج اُن کی ایک لازمی پہچان قرار دیا جاتا ہے۔ یہی لباس جب کامیڈین نور محمد چارلی نے ٹھیک چارلی چپلن کی نقالی کے لیے استعمال کیا تو وہ انھیں چپلن کے نقال کی حیثیت سے تو مشہور کر گیا لیکن نور محمد کے کردار میں کوئی مستقل اور دیرپا تخلیقی رنگ نہیں بھر سکا۔ دوسری طرف راج کپور نے چارلی چپلن سے مستعار لی ہوئی ٹوپی اور پتلون کے بغیر بھی سادگی اور معصومیت کا راست اظہار ''جاگتے رہو'' اور ''تیسری قسم'' فلموں میں انتہائی کامیابی سے کیا ہے۔ ان فلموں میں وہ دھوتی پہنے ہوئے گنوار نظر آتے ہیں۔

رومانس اور راج کپور —— اس موضوع کا ذکر راج کپور کے حوالے سے ''برسات'' فلم سے لے کر آج تک ہوتا چلا آ رہا ہے۔ حالانکہ خود راج کپور کو رومانس کے ذکر سے زیادہ پردۂ فلم پر دکھائے جانے

والے رومانس کی فکر رہا کرتی تھی۔ انھوں نے ایسے ہیرو اور ہیروئن تخلیق کیے جو لوگوں کا خواب اور آئیڈیل ہوتے ہیں۔ جوان، خوبصورت، ایک دوسرے پر فدا ہونے اور مرمٹ جانے والے، دیوارِ دولت کو محبت کے بیچ سے گرا دینے والے، دنیاوی رسم اور مصلحت کی حدوں کو پار کرنے والے ہیرو اور ہیروئن۔ لاکھوں کروڑوں ناآسودہ نوجوانوں کے دلوں کا ارمان کہ وہ کسی کو چاہیں اور خود انھیں چاہا جائے۔ اس خواب کے پورا ہونے سے تسکین و مسرت اور ناکام ہونے سے حزن و ملال کی کیفیت کو پردۂ فلم پر راج کپور نے دیدنی بنا کر پیش کیا۔ راج کپور نے پیار کرنے والوں کے جذبہ محبوبیت کو سمجھا تھا۔ اور محبتیں جی کر اپنے کردار نبھائے تھے۔ ادھوری محبت زندگی میں افسانوی رنگ بھر دیتی ہے۔ راج کپور نے پہلے نرگس کے ساتھ اپنے نشاط قرب کو فلم میں منتقل کیا اور پھر برسات، آوارہ، شری 420 کے بعد اپنی ناکام اور کھوئی ہوئی محبت کی بازیافت میں سرگرداں رہے۔ سنگم، جس دیش میں گنگا بہتی ہے وغیرہ میں انھوں نے بھرپور نسائیت ضرور دکھائی لیکن نرگس کی محبوبانہ نرگسیت وہ دوبارہ پیش نہ کر سکے۔ حالانکہ ان کی یہ کھوج برابر جاری رہی۔ ڈمپل کپاڈیہ کے چہرے میں نرگس سے تھوڑی سی مشابہت ان کی فلم ''بوبی'' میں کسی حد تک کام بھی آئی اور ''بوبی'' سے بہ حیثیت پروڈیوسر انھوں نے بے پناہ دولت کمائی لیکن اس کھوئے ہوئے چہرے کا انبساط وہ کبھی نہ پا سکے جو ایک دفعہ زندگی میں آ کر کھو چکا تھا اور بعد میں انھیں ٹکڑا ٹکڑا تو ہر کہیں ملتا رہا لیکن مجسم ایک شکل اور ایک روپ میں دوبارہ میسر نہ ہوا۔ اگر ''میرا نام جوکر'' کے بعد آر کے فلمز کے ہیرو نہ بدل گئے ہوتے تو لوگوں کو اس کا احساس بہتر طور پر ہوتا اور

> راج کپور نے اداکاری کو تخلیق کیا، اسے پہنا اور اوڑھا نہیں۔ ان کے جوتے جاپانی، پتلون انگلستانی اور ٹوپی روسی ضرور تھی لیکن ان کا دل ہندوستانی ہی تھا۔ جب انھیں یہ ادراک حاصل ہوا کہ ہندوستان کے لاکھوں اور کروڑوں معصوم اور ناخواندہ لوگوں سے ان کا واسطہ پڑنے والا ہے اور ان کے دلوں میں انھیں گھر کرنا ہے تو سب سے پہلے انھوں نے اپنے ہم وطنوں کی سادگی اور معصومیت پر غور کیا۔

اس کا نفسیاتی ردِعمل یقیناً ظاہر ہوتا۔ مگر راج کپور نے اچھا کیا کہ ''میرا نام جوکر'' کے بعد لوگوں پر اپنے آپ کو تھوپا نہیں۔ اور یہ بھی اچھا ہوا کہ انھیں اپنی عمر کے بڑھنے کا احساس ہو گیا اور اس کے بعد انھوں نے کیرکٹر رول نبھانا شروع کر دیے جن کے لیے ان کی ایک دم سے سنجیدہ ہو جانے والی شخصیت خوب کام آئی حالانکہ ''کل آج اور کل''، ''دھرم کرم'' وغیرہ کے سنجیدہ رول کے علاوہ ''دو جاسوس'' میں کافی دلچسپ اور تفریحی رولز ادا کیے۔

راج کپور میں تازگی اور نئے پن کے لیے ایک زبردست للک پائی جاتی تھی۔ گرچہ ان کی ہر فلم محبت کے تھیم پر بنتی تھی لیکن ہر محبت کے پس منظر میں ایک جیتا جاگتا اور سچا ماحول ایک نہ ایک سماجی پرابلم کے ساتھ ضرور دکھایا جاتا تھا۔ آوارہ اور شری 420 میں یہ خصوصیات واضح ہیں جن میں محبت کے پس منظر میں سوسائٹی کے گرے ہوئے اور مفلس بنائے گئے لڑکوں کی نفسیات کو اجاگر کرنے کے لیے طبقاتی کشمکش کو سیلولائڈ پر کامیابی سے دکھایا گیا۔ ان دو فلموں نے راج کپور کو سوشلسٹ فلم ساز کے طور پر روس میں زبردست مقبولیت دلا دی۔ ہر چند کہ راج کپور کی فلموں میں سماجی شعور کی کارگذاری کو صرف اُن کی اپنی اپج نہیں کہا جا سکتا۔ وہ بیشتر خواجہ احمد عباس کے قلم کی دین تھی جن کی طرز فکر سے راج کپور ذہنی طور سے ہم آہنگ تھے۔ ''میرا نام جوکر'' واقعی خواجہ احمد عباس کا ایک تحریری کرشمہ تھی۔

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ خواجہ احمد عباس خود اپنے لیے کامیاب تجارتی فلمیں کیوں نہیں بنا سکتے تھے۔ عباس صاحب بھی مانتے تھے کہ وہ خود اپنی کہانی پر اتنی کامیاب فلم نہیں بنا سکتے تھے۔ وہ معترف تھے کہ سنیما کی مصلحتیں سمجھنے کے باوجود وہ اپنے آپ کو اس کی مصلحتوں میں نہیں ڈھال پاتے تھے۔ 50 اور 60 کے دہوں میں ترقی پسند ادب پورے شباب پر تھا۔ اسی دور میں راج کپور نے ترقی پسند نظریات کا خوبصورت تجارتی استعمال کیا مگر عباس صاحب یہ کام خود نہ کر سکے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ بعض آپریشن مریض کو بے ہوش یا سُن کرنے کے انجکشن لگانے کے بعد کرنا پڑتے ہیں، وہ راست آپریشن کرنے لگتے تھے۔ لہٰذا ان کی فلمی پیشکش کو اشتراکی پروپیگنڈا سمجھ لیا جاتا تھا۔ راج کپور فلم بنانے کے دوران کسی ایک طبقے کو نہیں بلکہ مجموعی طور پر عام لوگوں کو ذہن میں رکھتے تھے۔ اس لیے تفریح اور رومانس کے ذریعہ سنیما بینوں کو پہلے ایک NEUTRAL نقطے تک لاتے تھے پھر انھیں وہ کچھ دیتے تھے جس کے لیے فلم بنانا ہوتی تھی۔ راج کپور نے اپنی فلموں میں طبقاتی کشمکش کو موثر ڈھنگ سے دکھایا ہے۔ لیکن انھوں نے پیغام کو پروپیگنڈا نہیں بننے دیا۔ عباس صاحب اور راج کپور کی ترقی پسندی میں یہی فرق تھا۔ عباس صاحب سوچتے تھے کہ سوشلزم کا

راج کپور نے آر کے فلمز کے علاوہ دیگر بینرز کی فلموں میں بھی کامیاب اداکاری کی ہے۔ مثلاً پرساد فلمز کی ''شاردا'' کو لیجیے۔ جس میں محبوبہ مینا کماری ہیروکی سوتیلی ماں بن کر گھر میں آتی ہے۔ محبوب خان کی فلم ''انداز'' میں راج کپور نے دلیپ کمار کے مقابل نرگس کے حاسد عاشق اور پھر شکی مزاج شوہر کا کردار بڑی خوبی سے نبھایا۔ ایک اور مدراسی پروڈکشن ''نذرانہ'' میں راج کپور نے دوسرے نصف حصے میں ایک بجھے ہوئے اور ناکام رومانی ہیروکا اچھا تاثر پیش کیا۔

فرض کہاں ادا ہوتا ہے، راج کپور سوچتے تھے کہ نظریہ قبول کہاں اور کس حد تک ہوتا ہے؟۔ عباس صاحب اور ان جیسے کئی ڈائرکٹر فلمیں تیار کرتے وقت ناظرین کی کم اور ایوارڈوں کی زیادہ سوچتے تھے۔ ''چار دل چار راہیں'' عباس صاحب کی ایک مقصدی ملٹی کاسٹ فلم تھی جس میں چار ہیروز میں سے مین ہیرو راج کپور تھے۔ مگر پھر بھی فلم تجارتی طور سے ناکام رہی۔ عباس صاحب سوشلزم کی منزل کے لیے سڑک کھودتے رہے اور راج کپور فرہاد کی صورت شیریں کے لیے نہر کھودنے کا کام کرتے رہے۔ شاید راج صاحب ادب کے ناقابلِ عمل حصہ کو فلم سے خارج کر دیا کرتے تھے۔ دستوفسکی کے روسی ناول ''جرم وسزا'' کے مرکزی خیال پر مبنی ہندی فلم ''پھر صبح ہوگی'' میں راج کپور سے بڑا فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ لیکن اس فلم کا بیشتر حصہ ہیرو کے ارتکاب جرم اور سزا کے اندیشوں کے مابین ضمیر کی کشمکش اور خیر وشر کے ٹکراؤ کے لیے وقف رہا۔ اس میں شک نہیں کہ راج کپور نے ''پھر صبح ہوگی'' میں ایک مجرم کی ذہنی و جذباتی کشمکش کی اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھر دیا تھا۔

راج کپور کی فلموں میں لوکیشن، کیمرے کے زاویے، سنگیت اور گیت بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ سنگیت پر راج کپور کو اچھا خاصا ملکہ حاصل تھا۔ رام کمار گنگولی اور شنکر جے کشن سے لے کر لکشمی کانت پیارے لال اور رویندر جین تک نے آر کے فلمز کے لیے جو موسیقی ترتیب دی اس قسم کی موسیقی وہ دوسرے پروڈیوسرس کی فلموں میں ترتیب نہ دے سکتے تھے اگرچہ دوسروں کے لیے بھی انھوں نے بہت اچھی اچھی دھنیں تیار کیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ راج کپور کے ہوم پروڈکشن میں سنگیت کا ایک علیحدہ مزاج روا رکھا جاتا تھا جو ان کی اپنی ہر فلم میں نمایاں رہتا تھا۔ یہ بات پس منظر کی موسیقی کے لیے اور بھی خصوصیت سے کہی جاسکتی ہے۔ یہ بات مجھے خواجہ احمد عباس مرحوم سے ہی معلوم ہوئی تھی۔ راج کپور کو ایک ساز اکارڈئین سے بڑی محبت تھی اگرچہ انھوں نے دَف بھی اکثر و بیشتر استعمال کیا ہے۔ شاید ان دونوں سازوں کے استعمال کی ایک خاص وجہ یہ رہی ہو کہ یہ دونوں ساز روس میں ہندوستان سے زیادہ رائج تھے جہاں راج کپور کے بینر کی فلمیں لوگ شوق سے دیکھتے تھے۔ راج کپور نے اپنے لیے ایک مخصوص آواز کے انتخاب میں بھی بڑی سمجھداری سے کام لیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مکیش کی آواز کو کے ایل سہگل کے اثر سے نکال کر راج کپور نے ایک الگ پہچان دے ڈالی۔ راج کپور کی فلموں میں گیت بہت معمولی اور آسان بول والے ہوتے تھے جو ظاہر ہے کہ پچاس سے سو الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ گیت ان کی کہانیوں اور سچویشنز میں پیوست ہوا کرتے تھے۔ ان گیتوں کو شاعری نہیں بلکہ تُک بندی ہی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن آر کے فلمز کے گیتوں کے بولوں سے کسی بات اور کسی کیفیت کی ترسیل ضرور ہوتی تھی خصوصاً شیلندر کے گیت حسّی سطح کو چھوتے تھے۔ حسرت جے پوری کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ صحیح اردو الفاظ کو مسخ کر کے مقبول گیت لکھنے میں کامیاب تھے۔ لیکن شیلندر کو ان کی دیگر تکنیکی صلاحیتیں بلند کر دیتی ہیں۔ ان کی فلم ''تیسری قسم'' اس کا ثبوت ہے جس کے گیت انھوں نے لکھے اور جس میں راج کپور نے ایک سادہ لوح دیہاتی کا کردار بڑی خوبی سے ادا کیا۔ پھنیشور ناتھ رینو کے ناول کے اس کردار میں راج کپور کے علاوہ کوئی دوسرا اداکار اتنا موثر اور موزوں یقیناً نہ ہوتا۔

راج کپور نے آر کے فلمز کے علاوہ دیگر بینرز کی فلموں میں بھی کامیاب اداکاری کی ہے۔ مثلاً پرساد فلمز کی ''شاردا'' کو لیجیے۔ جس میں محبوبہ مینا کماری ہیروکی سوتیلی ماں بن کر گھر میں آتی ہے۔ محبوب خان کی فلم ''انداز'' میں راج کپور نے دلیپ کمار کے مقابل نرگس کے حاسد عاشق اور پھر شکی مزاج شوہر کا کردار بڑی خوبی سے نبھایا۔ ایک اور مدراسی پروڈکشن ''نذرانہ'' میں راج کپور نے دوسرے نصف حصے میں ایک بجھے ہوئے اور ناکام رومانی ہیروکا اچھا تاثر پیش کیا۔ اس قسم کے سنجیدہ رولز کے علاوہ راج کپور نے رشی کیش مکھرجی کی ہدایت میں بنی ''اناڑی'' اور ایک اور دوسرے ہدایت کار کی فلم ''دلھا دلھن'' میں سادھنا کے مقابل سادہ اور چنچل کردار نبھائے (یہ فلم انگریزی فلم ''رومن ہولیڈے'' سے اخذ کی گئی تھی)۔ اور پھر کئی ایک ہلکے اور سطحی رول بھی کیے۔

ان فلموں کے ذکر سے ہٹ کر ایک فلم ایسی ہے جو اس اداکار نے اپنی مختلف شناخت اور خاص اپنی تسکین کے لیے بنائی لیکن جس نے اسے نیلام کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یعنی ''میرا نام جوکر''۔ یہ فلم راج کپور کا بڑا عزم تھی۔ اس کے ذریعہ انھیں ناظرین سے بہت کچھ کہنا تھا، ایک باضبط، زخم خوردہ اور جہاں دیدہ محبت پیش کرنا تھی۔ میں نے شروع میں لکھا تھا کہ راج کپور کا ہیرو سادگی اور معصومیت کا اظہار ہوتا تھا۔ لیکن تب یہ بات میں نے سادگی اور معصومیت کے سامنے کوئی خطِ

فاصل قائم کیے بغیر کہی تھی۔ جس طرح المیہ کے سامنے طربیہ اور مسرت کے مقابل غم اٹل ہوتا ہے اسی طرح شاطرانہ پن اور عیاری کے پس منظر سے نیک دلی اور محبت کی سچائی ایک نبرد آزما قوت کے طور پر ابھرتی ہے۔ ''میرا نام جوکر'' خواجہ احمد عباس نے لکھی بھی خوب تھی اور راج کپور نے بنائی بھی خوب تھی۔ لیکن افسوس وہ بیشتر فلم بینوں کے لیے ایک ناخوشگوار ثابت ہوئی۔ اس فلم نے یہ ثابت کر دکھایا کہ ہمارے فلم بین چارلی چپلن کی ٹوپی اور لباس سے زیادہ دور اب تک نہیں جاسکے ہیں اور ایک جوکر کے رنگے ہوئے چہرے اور ہیٹ کی معنویت Significance تک پہنچنے میں انھیں اب بھی وقت لگے گا۔ اس میں شک نہیں کہ راج کپور کی اس ناکامی کے دکھ میں ان کے پرانے پرستار ان کے برابر کے شریک رہے۔ اور پھر اپنے ارادے کے برخلاف اس طویل فلم کا دوسرا حصہ راج کپور نے پروڈیوس نہیں کیا۔ شاید ہمارے فلم بینوں میں ابھی وہ شعور پیدا نہیں ہوا ہے جو ایسی فلموں کا متحمل ہوسکے۔ یا شاید یہ فلم ہندوستان میں قبل از وقت بن گئی تھی۔ اس فلم میں ''جوکر'' کا کردار بہت معنی خیز اور بہ یک وقت 'حسیت' اور 'بے حسی' کا علامیہ تھا۔ تین ناکام محبتوں کے بعد عاشق محسوس کرتا ہے کہ ایک مکمل جوکر بن چکا ہے۔ اس میں ایک سنگدلانہ قناعت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک دل پھینک کی طرح راجو کا دل اچھلتا رہتا ہے، ہر بار ایک کاری زخم لگتا ہے اور ہر صدمے کے بعد وہ اپنے دل کو بڑا ہوتا محسوس کرتا ہے۔

فلم تین حصوں میں ہے۔ ہر حصے کے کلائمکس میں قدیم یونانی ڈراموں کی سی ایک دھیمی دھیمی اداسی پائی جاتی ہے۔ فلم کی ناکامی کا ایک سبب یہ تھا کہ اتنے منجھے ہوئے فن کی توقع لوگوں کو راج کپور سے نہیں تھی۔ اس فلم کے ہر ہر سین میں خاموش ہدایت کاری کے بہترین نمونے بھی دیکھے گئے۔ مثلاً جوکر کی کوششوں سے جب اس کی تیسری محبوبہ پدمنی ایک معمولی چورنی سے قوالہ اور پھر قوالہ سے فلمی ہیروئن بن جاتی ہے اور اسے اور جوکر کو پروڈیوسر راجندر کمار ہوائی جہاز سے بمبئی کی فلم نگری میں لے جاتا ہے تو اڑان بھرتے ہوئے جہاز میں پروڈیوسر (راجندر کمار) کے ہاتھ میں انگریزی رسالہ ''ٹائمز''۔ پدمنی کے ہاتھ میں ''فورچون'' دکھایا گیا ہے جبکہ جوکر ''لائف'' میگزین دیکھ رہا ہے۔ اسی طرح اولین جدائی میں جوکر کو روتا دکھایا گیا ہے لیکن بعد میں ہر جدائی کے منظر میں ناکام عاشق یعنی جوکر کی آنکھوں پر دھوپ کا رنگین چشمہ لگا دکھا کر مغمومیت کے تاثر کو بے پناہ کر دیا گیا ہے۔ ہر دو عشقیہ واردات کے درمیان منجھا ہوا سنیما ٹوگرافر رادھو کرمکار جسے بجا طور پر راج کپور کی تیسری آنکھ کہا جاتا ہے، راجو کی رنگین عینک پر سے جھلملاتا ہوا ایک رنگین بونا جوکر پردہ فلم پر لے آتا ہے جو اپنے وجود کی اداسی سمیت بڑھتے بڑھتے پورے اسکرین پر چھا جاتا ہے۔ یہاں خاموش سنیما فوٹوگرافی کا فن خود کو محسوس کراتا ہے۔

میں نے راج کپور کے سلسلے میں ابھی چارلی چپلن کا ذکر کیا ہے۔ یہاں میں یہ بھی کہوں گا کہ راج کپور کے بعض کاسٹیوم اور اطوار/Manners چارلی چپلن

سے مستعار تھے۔ جیسے آوارہ، شری 420، اناڑی اور سب سے بڑھ کر میرا نام جوکر (کسی حد تک ''سپنوں کا سوداگر'' میں بھی) میں راج کپور کے ملبوسات اور اطوار کو بغور دیکھیں تو شاید آپ خود کو مجھ سے متفق پائیں گے۔ لیکن ہم اسے نقالی نہیں کہہ سکتے کیونکہ راج کپور کے ٹوپی اور پتلون پہننے اور میز زبرتنے میں ایک فرق تھا۔ وہ یہ کہ چارلی چپلن (میں نے اس کی کئی خاموش فلمیں دیکھی ہیں) ان چیزوں کو کامیڈی کے لیے استعمال میں لاتا تھا جبکہ راج کپور نے انھیں قصداً بالانجام ٹریجڈی کے تاثر کو ابھارنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ ایک اور فرق میں نے محسوس کیا ہے۔ وہ یہ کہ چارلی چپلن کی خاموش فلموں میں بیک گراؤنڈ میوزک جو اکثر کٹتے، بلی اور ہجوم کے ساتھ بھاگ دوڑ کے مناظر میں تیز Sharp ہو جاتی ہے اور مغمومیت کے مناظر میں سست وائلن کے ساتھ مدھم ہو جاتی ہے اس انداز کا سنگیت اکثر راج کپور اپنی فلموں میں شنکر جے کشن کے ذریعہ استعمال میں لاتے تھے۔ راج کپور اپنی فلموں کی موسیقی پر اپنی پسند کو حاوی رکھتے تھے۔

بہر حال، راج کپور نے ''میرا نام جوکر'' کی ناکامی کے بعد شاید یہ طے کرلیا تھا کہ اب اونچا فن ہندوستانی فلم بینوں کے سامنے پیش نہیں کرنا ہے۔ فلم ''بوبی'' خواجہ احمد عباس نے ہی لکھی اور ''میرا نام جوکر'' کے نقصان کو عبور کرنے کے لیے بنائی گئی۔ نوجوان محبت کو لے کر اس فلم میں کچھ سماجی مسائل پیش کیے گئے اور اس کا تھیم قدرے جرأت مندانہ تھا لیکن ''ستیم شوم سندرم'' اور ''رام تیری گنگا میلی'' میں راج کپور کافی سمجھوتہ پرست نظر آنے لگے۔ ان فلموں میں ضرورت سے زیادہ چمک دمک اور شہوانیت (EROTICISM) کے جذبے کے اظہار سے باذوق فلم بینوں نے راج کپور کے فن کو روبہ انحطاط ہوتے ہوئے دیکھا۔ شاید اس کے بعد فلم ''حنا'' میں مسلم سوشل تھیم کی وجہ سے وہ کسی قدر حجاب و تکلف اور مسلم کلچر کا نمونہ پیش کرتے اور انھیں ان کی کھوئی ہوئی فنی عظمت دوبارہ مل جاتی۔ فلم بہر حال بہت کامیاب رہی۔ لیکن اس کامیابی کو راج کپور کی آنکھیں نہیں دیکھ سکیں۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ بین الاقوامی ذوق کو مد نظر رکھتے ہوئے بنائی گئی اپنے زمانے کی ناکام باکس آفس فلم ''میرا نام جوکر'' آج ایک بڑی کلاسک ہندی فلم سمجھی جاتی ہے۔

موت اور آخری انعام راج کپور کے لیے ایک ساتھ پہنچے۔ مئی 1988 کی بات ہے۔ صدر جمہوریہ شری وینکٹ رمن سے دہلی میں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ حاصل کرنے سے قبل ہال میں بیٹھے بیٹھے راج کپور کو دمہ کا دورہ پڑا اور ایوارڈ لیتے ہی وہ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں داخل کردیے گئے جہاں ایک ماہ زندگی اور موت کی کشمکش کے بعد 2 جون 1988 کو ان کا انتقال ہوا۔

■

Fay Seen Ejaz
Editor Mahnama Insha
(Distinguished International Urdu Magazine)
25B, Zakaria Street, Kolkata-700073
Mob : 9830483810
email: inshapublcations@yahoo.co.in

انو پما پول

کرناٹک میں معاصر اردو ادب

ایک جائزہ

سرزمین کرناٹک تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے۔ زمانہ قدیم سے یہاں کئی سلاطین نے حکمرانی کی ہے۔ نداس، موریہ، چالوکہ، راشٹر کوٹا، سلطنتِ وجے نگر، بہمنی، قطب شاہی اور سلطنت خداداد کے حکمرانوں نے اس زمین کو نہ صرف تہذیبی وثقافتی اعتبار سے فروغ دیا بلکہ ادب کی سرپرستی اور اس کی آبیاری میں کوشاں رہے۔ آزادی وطن سے پہلے کرناٹک کا اصل نام ریاستِ میسور تھا، جو برطانوی اقتدار کا ایک حصہ تھا۔ 1973 میں ریاستِ میسور کا نام بدل کر ریاست کرناٹک کر دیا گیا۔ یہاں کی علاقائی زبان کنڑا ہے مگر مشترکہ زبان اردو ہے جو زمانۂ قدیم سے بہمنیوں اور خاص طور پر عادل شاہی عہد کی دکنی زبان ریاست کرناٹک کے تمام علاقوں میں اپنا اثر قائم کر چکی ہے۔ دکنی اردو دکن اور کرناٹک کی زندہ زبان ہے اور زندہ زبان اسی وقت مٹتی ہے جب اس کے بولنے والے نہ رہیں۔ ادب میں دکنی اردو کا استعمال نہ رہا مگر عوام میں روزمرہ کی حیثیت سے دکنی اردو زندہ زبان کی حیثیت سے آج بھی فروغ پا رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ دکنی ادب کو اگر دوبارہ اہم رسائل کے ذریعہ فروغ دیا جائے تو تلنگانہ سے زیادہ کرناٹک سے اس کا ذخیرہ سامنے آئے گا۔ کیونکہ ابھی دکنی کا استعمال اسلوب میں صرف مزاح کے لیے ہوتا ہے۔ اورنگ آباد اور حیدرآباد کی زبان اس معاملہ میں بہت ہی زیادہ سہل پسند واقع ہوچکی ہے جب کہ کرناٹک میں بیدر، گلبرگہ، شیموگہ اور جیسے جیسے میسور کی جانب سفر کریں گے آپ کو لفظیات میں بہت ہی زیادہ تنوع دیکھنے کو ملے گا۔ اس سے اردو زبان وادب کے ذخائر میں اضافہ ہی ہوگا، شاید ہی کسی قسم کا نقصان ہو۔

> آزادی وطن سے پہلے کرناٹک کا اصل نام ریاستِ میسور تھا، جو برطانوی اقتدار کا ایک حصہ تھا۔ 1973 میں ریاستِ میسور کا نام بدل کر ریاست کرناٹک کر دیا گیا۔ یہاں کی علاقائی زبان کنڑا ہے مگر مشترکہ زبان اردو ہے جو زمانۂ قدیم سے بہمنیوں اور خاص طور پر عادل شاہی عہد کی دکنی زبان ریاست کرناٹک کے تمام علاقوں میں اپنا اثر قائم کر چکی ہے۔

بہرحال اردو زبان وادب کے فروغ کا جب بھی تذکرہ چھڑے گا تو میر سرزمین کرناٹک کے ذکر کے بنا مکمل نہیں ہوگا۔

ہندوستان کی دوسری ریاست کی طرح کرناٹک میں بھی شعروادب کا مذاق عام ہے۔ اس وقت کرناٹک میں تین نسلوں کے قلمکار وفنکار سرگرم عمل ہیں اور اردو زبان وادب کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ کرناٹک میں سب سے سرگرم اور محترم ادیب وشاعر کی حیثیت سے خلیل مامون صاحب یاد کیے جاتے تھے۔ جو چند مہینے پہلے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ وہ نظموں کے سب سے منفرد اور توانا شاعر تھے۔ اور 'نیا ادب' کے نام سے کتابی سلسلہ بھی نکالتے تھے۔ وہ نیا ادب کے نام سے ہر مہینے ادبی پروگرام بھی کیا کرتے تھے جن سے کرناٹک میں ادبی چہل پہل برقرار تھی۔ ان کے گزر جانے کے بعد ایک طرح کے سناٹے کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں انھیں یاد کرنا بطور خراج عقیدت بھی ہے۔

کرناٹک کے فنکاروں نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ شاعری، فکشن، تحقیق وتنقید میں ان کی خدمات نمایاں ہیں۔ مجتبیٰ حسین، سلیمان خطیب، محمود ایاز، اکرام باگ، م۔ن سعید، خالد سعید، ڈاکٹر طیب انصاری، وہاب عندلیب، خلیل مامون، میمونہ تسنیم، ممتاز شیریں،

حلیمہ فردوس ان تمام نامور ادیب و شاعر نے کرناٹک کی ادبی تاریخ میں اپنا نام روشن کیا ہے اور ہمارے یہاں کا معاصر ادبی منظر نامہ انہی سب سے روشن ہے۔

فکشن نگاری کے حوالے سے کرناٹک کا ادب سرسبز و شاداب ہے۔ یہاں کے فکشن نگاروں کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو ایک لمبی فہرست نظر آتی ہے۔ کرناٹک کی فکشن نگاری کی تاریخ کا دور کم و بیش 81 سال کا رہا ہے۔ اس مختصر سے عرصے میں ریاست کرناٹک کے تقریباً 15 ناول نگار اور 150 افسانہ نگاروں نے ادبی نثر کے فروغ میں اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ روایت، عصریت، جدیدیت اور مختلف رجحانات تحریکات و میلانات کا امتزاج یہاں کے فکشن میں نمایاں ہے۔ اسلوب، آہنگ اور لب و لہجہ کے اعتبار سے یہاں کے فنکاروں نے اپنی پہچان بنائی ہے۔ فکشن میں میمونہ تسنیم، ممتاز شیریں، حنا روحی، یوسف عارفی، انل ٹھکر، م ن سعید، اکرام باگ، وحید انجم جیسی نامور شخصیات کا ذکر ملتا ہے۔

اکرام باگ کا شمار کرناٹک کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے کرناٹک کی افسانہ نگاری کو نئی فنی تبدیلیوں سے آشنا کروایا۔ ان کے افسانوں میں پوشیدہ تلخ حقائق نے مطالعہ کے شوقین قاری کو اپنے فنکارانہ سحر میں باندھے رکھا۔ ان کے افسانے جدیدیت، تجریدیت اور علامت نگاری کے نئے باب سے روشناس کرواتے ہیں۔ اکرام باگ کے افسانوں کے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''اکرام باگ کے افسانے بنیادی طور پر ذاتی المیے کی داستانیں ہیں۔ انھوں نے تجرید اور شدت تاثر سے بھرے ہوئے افسانے لکھے ہیں۔ ان کے افسانے میں علامت کے پردے میں تمام تر رعنائی اور رنگینی کے ساتھ باہر کی روشنی اور اندر کی روشنی کو یکجا چھان کر نئے رنگوں میں پیش کرتے ہیں۔

اکرام باگ کے افسانوں کا مجموعی تاثر زیاں اور گزران کے ماتم کا ہے۔ دنیا کارگاہ عمل تو ہے لیکن اس کے عمل زیادہ تر زیاں، گمشدگی کی طرف لے جاتے ہیں۔ انسان اپنی تمام ذہنی اور علمی قوتوں کے باوجود دنیا میں پوری طرح قائم نہیں ہوتا۔ اس کے دوست اور چاہنے والے ہی اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں نے جدیدیت اور شب خون کو اعتبار بخشا۔ اگرچہ میں ان کے بارے میں کبھی کچھ لکھ نہ سکا لیکن جدید ادب کی جدوجہد ان کے بغیر کامیاب نہ ہوتی۔''

(اندوختہ: اکرام باگ، ص12)

علامت نگاری میں جہاں انتظار حسین اور سلام بن رزاق کا نام آتا ہے وہیں یوسف عارفی کا بھی نام لیا جاتا ہے۔ تہذیبوں کا زوال اور انسانیت کی مٹتی ہوئی قدروں کو علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ 'آج کے بعد' منظر عام پر آچکا ہے۔ اس مجموعہ کی ادبی شہرت کے باعث 2002 میں کرناٹک اردو اکادمی نے انھیں بہترین افسانہ نگار کے ایوارڈ سے نوازا۔ یوسف عارفی نے بہت کم لکھا اور جو بھی تحریر کیا وہ معیاری ہے۔

کرناٹک کے فنکاروں نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ شاعری، فکشن، تحقیق و تنقید میں ان کی خدمات نمایاں ہیں۔ مجتبیٰ حسین، سلیمان خطیب، محمود ایاز، اکرام باگ، م۔ن سعید، خالد سعید، ڈاکٹر طیب انصاری، وہاب عندلیب، خلیل مامون، میمونہ تسنیم، ممتاز شیریں، حلیمہ فردوس ان تمام نامور ادیب و شاعر نے کرناٹک کی ادبی تاریخ میں اپنا نام روشن کیا ہے۔

ریاست کرناٹک کے ایک اہم فکشن نگار انل ٹھکر ہیں۔ ان کے تین افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ہندوستان کی تہذیب، فرقہ وارانہ فسادات، فرد کے مسائل ان کے افسانوں کے اہم موضوعات ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ناول نگاری میں بھی اہم مقام حاصل کیا ہے۔ دور جدید میں سلمیٰ صنم، کوثر پروین، ضیاء جعفر، ضیاء کرناٹکی اور طاہرہ نورانی کے افسانے رسالوں کی زینت بن رہے ہیں۔ افسانوں کے بمقابل ناول کا سرمایہ کم ہے۔ تاہم اہم ناول نگاروں کا ذکر ضروری ہے۔ حسنیٰ سرور (سیما) انل ٹھکر (پس اشک) برجس بیگم (کفارہ) فریدہ رحمت اللہ (قسمت کے خریدار) قابل ذکر ہیں۔

اس موقع پر اگر صرف انل ٹھکر کے بارے میں بات کروں تو یہ کہہ سکتی ہوں کہ وہ کرناٹکا کے واحد ہمہ جہت فنکار ہیں جنھوں نے نثری تخلیقات میں ناول، افسانہ اور ڈرامے میں کرناٹک کی عمدہ نمائندگی کی ہے۔ لیکن انھیں خاطر خواہ پذیرائی نہیں ملی۔ اپنی زندگی میں وہ اپنی تحریری اور ذاتی نمائندگی رسائل و سمینار میں کراتے رہے لیکن جو تخلیقات انھوں نے چھوڑی ہیں ان پر سنجیدگی سے بھی غور کرنا چاہیے۔ انھوں نے اردو ادب کو نصف صدی سے زائد دیا ہے۔ ایسے میں مجھے امید ہے کہ اہم رسائل میں چند صفحات ضرور انھیں دیے جائیں گے، تاکہ ان کی شمع جلتی رہے۔ بہرحال ان کے افسانہ نگاری کے متعلق حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

''انل ٹھکر ایک اچھے افسانہ نگار ہیں ان کے افسانے کہانی پن کی زندہ مثال ہیں۔ وہ افسانے پر کہانی کو طاری کرنے کے لیے کدو کاوش نہیں کرتے بلکہ غیر معمولی خلاقی سے افسانہ کی خلقی افسانویت کو دریافت کرنے کے عمل کو روا رکھتے ہیں۔ دریافت کے اس اکتشافی عمل میں وہ مصنف کی حیثیت سے پس منظر میں چلے جاتے ہیں اور افسانہ خود اپنی افسانویت کی یافت اور تحفظ کرتے ہوئے اپنے کلی وجود کا اثبات کرتا ہے۔ یہی وہ عمل ہے جو افسانے کو افسوں بناتا ہے اور قاری غیر ارادی طور پر اس کے حاوی اثر کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ اس نکتے کی قدرے تفصیل بیان کی جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ کہ انل ٹھکر افسانہ نگار کی حیثیت سے افسانے پر حاوی ہوتے ہیں نہ اس میں دخل اندازی کرتے ہیں۔ افسانہ ان کی تخلیقی شخصیت جو ثقافتی علامتی اور اساطیری عناصر کا مرکب ہے، سے تمام تر آب و رنگ کشید کر کے فنی لوازم کا احترام کرتے ہوئے اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے اور ایک زندہ، خود کفیل اور حرکی وجود کی طرح دھڑکتا ہے، پھیلتا ہے اور آس پاس کی فضا کو مرتعش اور منور کرتا ہے۔'' (موہی پرندے: انل ٹھکر، ص10)

طنز و مزاح میں کرناٹک کے تخلیق کاروں کی ایک طویل فہرست ملتی ہے۔ مجتبیٰ حسین، سلیمان خطیب،

حلیمہ فردوس، رؤف خوشتر، منظور وقار، مشتاق سعید کے نام قابل داد ہیں۔ جنھوں نے طنز و مزاح کو اپنے فن کا خاص وصف بنایا ہے۔ ان سب میں نمایاں نام مجتبیٰ حسین اور سلیمان خطیب کے ہیں۔ آفاقی شہرت یافتہ طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کا تعلق شہر گلبرگہ سے ہے۔ شہر گلبرگہ اردو زبان وادب کے سلسلے میں آج بھی بہت زرخیز ہے۔ مجتبیٰ حسین اس شہر کے سپتر ہیں۔ آج ہندوستان کے طنز و مزاح کا سنہرا باب انہی کے نام سے روشن ہے۔ چودہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں سے سات کتابیں مزاحیہ مضامین پر مبنی ہیں۔ تکلف برطرف، آخر الغرض، آخر کار، قطع کلام، قصہ مختصر اور بہر حال، خالص مزاحیہ مجموعے ہیں۔ آزادی کے بعد خاکوں کا بار صرف کرنا ٹک نے اٹھائے رکھا ہے۔ اس سرزمین میں خاکہ نگاروں کی ایک طویل فہرست شامل ہے۔ اس سلسلے میں بھی مجتبیٰ حسین کے خاکے طنز و مزاح کا بہترین مرقع ہیں۔ آدمی نامہ، سو ہے وہ بھی آدمی اور ہوئے ہم دوست جس کے، میں پیش کردہ خاکے ہماری توجہ کا مرکز ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی ادبی اہمیت کا انداز اس بات سے لگا لیں کہ آپ کے انتقال کے بعد ادب کی قد آور شخصیت شمس الرحمٰن فاروقی کے قلم سے ایک طویل مضمون رقم ہوا اور رسالوں کا زینت بنا۔ گوپی چند نارنگ نے بھی آپ کے فن کے بارے میں خوبصورت رائے دی ہے۔

''جتنے بھی گُر ہیں اس فن کے مجتبیٰ حسین اس سب میں واقف ہیں اور ان حربوں کو وہ نہایت سہولت سے فطری طور پر برتتے رہے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو وہ 'Born Humourist' ہے۔''

(مجتبیٰ حسین، فن کے چند پہلو، گوپی چند نارنگ)

طنز و مزاح میں اور ایک اہم نام سلیمان خطیب کا ہے۔ جن کی طنزیہ شاعری نے دور جدید کے دکنی ادب پر اپنا گہرا نقوش مرتب کیا ہے۔ زندگی کے معمولی سے پہلو جس کو ہم کبھی نظر انداز کر دیتے ہیں ان پہلوؤں کو سلیمان خطیب اتنی جاذبیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ ہم ان کے دلدادہ بن جاتے ہیں۔ طرہ یہ کہ اس میں دکنی زبان کا تڑکہ سونے پہ سہاگے کا کام کرتا ہے۔ دکنیات کے ضمن میں جتنی قدر قلی قطب شاہ، ملا وجہی، غواصی کو حاصل ہے اتنی ہی عزت سلیمان خطیب کی ہے۔ دور جدید میں بھی دکنی میں اتنی خوبصورت نظمیں پیش کی ہیں وہ بے مثال ہیں۔ ہنستے ہنستے سماج کی برائیوں و کمزوریوں پر بہت گہری چوٹ کرتے ہیں کہ انسان اپنے اندر پوشیدہ عیبوں پر نادم ہو جاتا ہے۔ نظم تجارت شادی کے یہ چند مصرعے دیکھیے۔

جس کی بچی جوان ہوتی ہے
کس مصیبت میں جان ہوتی ہے
بوڑھے ماں باپ کے کلیجے پر
ایک بھاری چٹان ہوتی ہے
جی میں آتا ہے اپنی بچی کو
اپنے ہاتھوں سے خود ہی دفنا دیں

خالص طنز و مزاح میں ایک اہم نام حلیمہ فردوس کا ہے۔ اتفاق سے ان کا تعلق بھی شہر گلبرگہ سے ہے۔ تنقید و تحقیق میں جتنی پارکھی نظر رکھتی ہیں طنز و مزاح پر اتنی ہی مضبوط گرفت رکھتی ہیں اور بچوں کے ادب سے بھی آپ کو خاصی دلچسپی ہے۔ طنز و مزاح پر مبنی مضامین کے دو مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'ارج' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ تلمیحات اقبال، کرشن چندر، فیض اور عصمت کے فن پر آپ کے مضامین توجہ کے طالب ہیں۔

ابھی تک جن مصنفین کا ذکر کیا ہے ان کا ایک خاص وصف یہ بھی کہ اپنے ریاستی یا غیر ریاستی ادب کو اردو کے قلب میں ڈھالا ہے اور اردو کے دامن کو وسیع سے وسیع تر بنانے میں کوشاں ہیں۔ اس سلسلے میں ترجمہ نگاری کے فن میں ماہر منصور، پروفیسر م۔ ن سعید، حمید الماس، شاد باگل کوٹی، ساغر کرناٹکی کی خدمات بھی نا قابل فراموش ہیں۔ پروفیسر م ن سعید 'خواب نامہ ٹیپو سلطان' گریش کارناڈ کی تخلیق The Dreams of Tippu Sultan کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نصابی کتابوں میں یہ ڈرامہ شامل ہے۔ اس ضمن میں ایک اہم نام ماہر منصور کا ہے۔ تقریباً چالیس کتابوں کو اردو کے قالب میں منتقل کیا ہے۔ کنڑ اور دوسری زبانوں کے ایوارڈ یافتہ کتابوں کا انتخاب ماہر منصور نے کیا اور اردو میں ترجمہ کیا انھوں نے اتنا کام کر لیا کہ شاید ایک صدی میں اتنا کام نہیں ہو سکتا۔ ترجمہ نگاری کا آغاز بھی ریاست کرناٹک سے عبارت ہے۔ ابن عاصی اپنے مضمون اردو ادب میں فن ترجمہ نگاری کی روایت میں لکھتے ہیں:

''کہا جاتا ہے کہ اردو زبان میں ترجمہ نگاری کے حوالے سے سب سے پہلی کتاب 'نشاۃ العشق' ہے۔ یہ ایک صوفی بزرگ عبداللہ حسینی جو حضرت بندہ نواز گیسو دراز کے پوتے تھے نے اردو ترجمہ کی۔''

(کرناٹک میں اردو ماضی اور حال، ص 41)

دنیا خلیل مامون کو بطور شاعر پہچانتی ہے۔ لیکن وہ جتنے بڑے شاعر ہیں اتنے ہی بڑے ترجمہ نگار بھی۔

خلیل مامون کی ادبی خدمات پر ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ شہرہ آفاق انگریزی نظموں کا ترجمہ انیس لیلیٰ نظمیں کے عنوان سے 1989 میں شائع ہوا علاوہ ازیں 'کنڑ ادب شاعری اور فکشن کا ترجمہ' 1994 میں شائع ہوا۔ اور تاثرات کے عنوان سے ان کے تنقید کی مضامین کا مجموعہ منظر عام پر آیا۔ ان کے تنقیدی نظریات مغربی ادب کو بہتر طور سمجھنے اور پرکھنے میں معاون ہیں۔

تحقیق و تنقید کے حوالے سے کرناٹک کا ادب ترقی کے راستے طے کر رہا ہے۔ کرناٹک کی چند معتبر ادبی شخصیات نے تحقیق و تنقید کے میدان میں اپنی چھاپ چھوڑی ہے۔ تحقیق و تنقید کے حوالے سے اہم نام پروفیسر م ن سعید کا ہے۔ ان کی تحقیقی تصانیف میں 'حضرت خواجہ بندہ نواز سے منسوب دکنی رسائل'، 'حیات وجہی'، 'قطب مشتری تحسین و تخمین'، 'دُرالاسرار' شامل ہیں۔ ان کے تنقیدی و تحقیقی نظریات اور صلاحیتوں کا اعتراف اردو ادب کی قد آور شخصیات نے کیا ہے۔ ڈاکٹر طاہرہ نو رانی نے اپنے مقالے ''پروفیسر م ن سعید کی تحقیقی اور تنقیدی خدمات'' میں لکھتی ہیں کہ ''بابائے اردو مولوی عبدالحق نے معراج العاشقین کے دیباچے میں اردو کے پہلے نثر نگار کی حیثیت سے خواجہ بندہ نواز کا تعارف کرایا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تقلید میں خواجہ بندہ نواز کو اردو کا اولین نثر نگار تسلیم کر لیا اس میں مولوی نصیر الدین ہاشمی، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور خلیق انجم جیسے نام شامل ہیں۔'' پروفیسر م ن سعید نے تیرہ قلمی نسخوں کے حوالے سے یہ بات ثابت کر دی کے معراج العاشقین خواجہ بندہ نواز کی تصنیف نہیں ہے۔ دکنی ادب کی تحقیق ہو یا تحقیق کے اصول وضوابط پر مبنی تحقیق ہو اس میں پہلا نام پروفیسر م ن سعید کا آتا ہے۔ پروفیسر گیان چند جیسی قد آور شخصیت نے ان کے تحقیقی کام کو سراہا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

''...ان کا مقالہ تحقیقی حزم و احتیاط اور تحقیقی تجزیے کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ انھوں نے ایک ایک اردو رسالے کو جانچ کر یہ طے کیا کہ خواجہ صاحب نے اردو میں کوئی رسالہ نہیں لکھا۔''

(عصر حاضر میں جنوبی ہند کے ممتاز اردو ناقد اور محقق: ڈاکٹر تمیم احمد۔ وی)

تحقیق کے سلسلے میں ایک اور اہم نام ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کا ہے۔ آپ کی تحقیقی تصانیف 'ریاست میسور میں اردو مثنوی کا ارتقا'، 'کرناٹک میں اردو مثنویاں'، 'میسوری اردو اور علامت فاعل'، 'شعور زبان'، 'قدیم اردو نظم' شامل ہیں۔ انھوں نے تقریباً تین سو مثنویوں کے متن کا تقابلی مطالعہ کیا اور وہ رائے قائم کی کہ اردو داں طبقے نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کی تحقیق کے بارے میں خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''ان کا کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جس کا ہر صفحہ غور وفکر کی دعوت نہ دیتا ہو۔ جس میں انھوں نے زبان کے مطالعہ کو نفسیات، عمرانیات اور دوسرے سائنسی علوم سے جوڑنے کی کوشش نہ کی ہو۔ ان کی علمی دنیا بھی مضبوط ہے اس لے انھوں نے اردو کے کلاسیکی ادب کا مطالعہ بہت محنت سے کیا ہے۔ ان کے یہاں جو تاریخی، تحقیقی اور فلسفیانہ تعلیم ہے وہ بھی عام دسترس سے باہر۔'' (شعور زبان، ص 13)

> تحقیق کے سلسلے میں ایک اور اہم نام ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کا ہے۔ آپ کی تحقیقی تصانیف 'ریاست میسور میں اردو مثنوی کا ارتقا'، 'کرناٹک میں اردو مثنویاں'، 'میسوری اردو اور علامت فاعل'، 'شعور زبان'، 'قدیم اردو نظم' شامل ہیں۔

تحقیق و تنقید کے میدان میں جن محققین و ناقدین نے اپنی خدمات انجام دیں ان میں ڈاکٹر طیب انصاری (عہد آصفیہ اردو نثر) خالد سعید (بارہ مضامین) وہاب عندلیب (تحقیق و تجزیہ) پروفیسر عبدالرب استاد (دِرادب)۔ نئی نسل کے لکھنے والوں کی فہرست میں ڈاکٹر طاہرہ نورانی اور ڈاکٹر ریشا قمر کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر طاہرہ نورانی کی تحقیقی کتاب 'ریاست کرناٹک میں تعلیم و تدریس ایک جائزہ' منظر عام پر آچکی ہے۔ انھوں نے شمس الرحمٰن فاروقی کے فکشن پر کام کیا ہے۔ ان کی کتاب 'شمس الرحمٰن فاروقی اور ان کے افسانے' 2014 میں شائع ہوئی۔

شاعری کے ضمن میں بات کریں تو ریاست میں بیش بہا سرمایہ موجود ہے۔ محمود ایاز، حمید الماس، خلیل مامون، خالد سعید، راہی فدائی، سلیمان خطیب، تنہا تماپوری کی شاعری نے ایک صدی کو متاثر کیا ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں خلیل مامون اور سلیمان خطیب کا ذکر آچکا ہے۔ یہاں خالد سعید کی شاعری کے بھی چند کلمات ضروری ہیں جس میں بدلتی نئی تہذیب کا المیہ اور اس نئی تہذیب میں انسان کی زندگی کا عکس خالد سعید کی شاعری کا خاصہ ہے۔ انھوں نے کیا خوب لکھا ہے۔

ہمارے بستی میں کون پھر معتبر رہے گا
کہ آئینوں میں اُتر رہا ہے غبار سا کچھ
اک تو کہ سود و نفع کا قائل ہے ہر گھڑی
اک میں کہ خرچ ہوتا ہوں بے کار بے سبب

سلیمان خمار، راہی قریشی، ساغر کرناٹکی، کے مدنا منظر، ساجد حمید، اکرم نقاش اور حامد اکمل ایسے کئی نام میں جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے عہد سازی کی ہے۔ میں نے رواروی میں حافظ کرناٹکی کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا، کیونکہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن اور ادب اطفال کے لیے تحریک کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جامعاتِ کرناٹک میں تحقیق کا کام اپنے عروج پر ہے۔ آنے والے دور میں نئی تحقیق ہمارے پیش نظر ہوگی۔ تخلیقی میدان میں بھی نئے نام جگمگا رہے ہیں۔

ماخذ و مصادر

1 اندوختہ: اکرام باگ
2 آج کے بعد: یوسف عارفی
3 موسمی پرندے: انل ٹھکر
4 کرناٹک میں اردو ماضی اور حال: پروفیسر خواجہ اکرام الدین، ڈاکٹر ریشا قمر
5 عصر حاضر میں جنوبی ہند کے ممتاز اردو ناقد اور محقق۔ ڈاکٹر تمیم احمد۔ وی
6 جنوبی ہند میں اردو کی ابتدا، ارتقا اور مسائل: انجمن ترقی اردو (ہند) کرناٹک
7 کلیات میمونہ تسنیم: پروفیسر م ن سعید
8 گیسوئے اردو: ڈاکٹر منظور احمد دکنی
9 شعور زبان: ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

Dr. Anupama Pol
Assistant Professor & Head Department of Urdu
Bangalore University-560056
Mob. 8123504051
Email: anupama388@gmail.com

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے اور کتاب کے مشمولات کے تعلق سے قارئین کو اہم معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت پائی جاتی ہے۔ قدیم رسائل ومجلات نے نئی مطبوعات سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تبصرہ ایک ذمہ داری کا عمل بھی ہے۔ اس لیے مبصرین کو تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، طوالت، تحسین اور نکتہ چینی سے گریز کرتے ہوئے کتاب کے اہم نکات پر اظہار خیال کرنا چاہیے۔ رسالے میں اردو زبان وادب سے متعلق انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں پر تبصرے بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا مبصرین اس جانب بھی توجہ فرمائیں۔ (ادارہ)

زبان اور علم زبان

مصنف: عبدالقادر سروری

صفحات: 270، قیمت: 190 روپے، سنہ اشاعت: 2026

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر عادل حیات

S-11/11، سیکنڈ فلور، نزد ریان پبلک اسکول، جوگابائی ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی

زبان اور اس کی ساخت کو سائنسی، منطقی اور تجزیاتی انداز میں سمجھنے کا نام 'علم زبان' یا لسانیات (Linguistics) ہے۔ موجودہ سائنسی دور میں جہاں ہر علم کو تجربے اور منطق کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے، وہیں ادب کے ساتھ ساتھ زبان کا سائنٹفک مطالعہ بھی انتہائی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ ایک وقت تھا جب اردو میں علم لسانیات پر باقاعدہ، جامع اور تحقیقی مواد کی شدید کمی تھی۔ اس دور میں اردو کے محققین اور جامعات کے طلبہ وطالبات کو لسانیات کے پیچیدہ نظریات سمجھنے کے لیے عموماً انگریزی کتابوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا، جو اکثر مقامی لسانی مزاج سے مکمل طور پر مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ اسی علمی خلا کو پر کرنے کے لیے عبدالقادر سروری نے کئی دہائیوں قبل 'زبان اور علم زبان' کے نام سے یہ معرکہ آرا اور وقیع کتاب تصنیف کی تھی، جس نے درحقیقت اردو میں جدید لسانیاتی مطالعے اور تحقیق کی باقاعدہ ایک مضبوط بنیاد رکھی۔

قومی اردو کونسل نے علمی اور تہذیبی ورثے کے تحفظ کے اپنے شاندار اشاعتی سلسلے کو برقرار رکھتے ہوئے اس اہم اور نایاب کتاب کا تازہ ایڈیشن 2026 نہایت دیدہ زیب انداز میں شائع کیا ہے۔

کتاب کے آغاز میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال کا ایک بصیرت افروز اور فکر انگیز پیش لفظ شامل ہے۔ انھوں نے اس جدید ڈیجیٹل اور صارفی دور میں مطبوعہ کتابوں کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ ''مطبوعہ کتابوں کے لمس کی لذت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔'' واقعی ای بکس اور اسکرین ریڈنگ کے اس تیز رفتار دور میں بھی مطبوعہ کتابوں کی معنویت، ان کی افادیت اور ان کا تہذیبی وقار برقرار ہے۔ کونسل کا یہ اشاعتی قدم دراصل ہمارے علمی اور ثقافتی ورثے کو محفوظ کرنے اور اسے آنے والی نسلوں تک بحفاظت منتقل کرنے کی ایک اہم کڑی ہے۔

یہ کتاب کل 20 مفصل ابواب کا احاطہ کرتی ہے۔ عبدالقادر سروری نے لسانیات جیسے خشک، تکنیکی اور پیچیدہ سمجھے جانے والے موضوع کو اس طرح سلیقے، روانی اور عام فہم انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری کی دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے عام لسانیات کے کسی بھی اہم پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ کتاب کا باقاعدہ آغاز 'زبان اور اس کی ماہیت' سے ہوتا ہے۔ اس میں حقیقی زبان سے بحث کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ تکلمی، تحریری اور اشاروں کی زبان میں کیا فرق ہے۔ علم زبان کی اہمیت بتاتے ہوئے یونانی (افلاطون وغیرہ)، رومی اور عرب علما کی قیاس آرائیوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں جغرافیائی، نسلی، ذہنی اور تہذیبی اثرات کے تحت زبان کے ارتقا کی سائنسی وجوہات بیان کی گئی ہیں۔

علم زبان کی شاخیں اور صوتیات وصوت تجزیہ کا حصہ تقریباً چار ابواب پر مشتمل ہے۔ اس حصے کو کتاب کا تکنیکی اور سائنسی مغز بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں انسانی آوازوں کے مخرج کی کارکردگی اور مصوتہ (Vowels) اور مصمتہ (Consonants) کی سائنسی بنیادوں پر تقسیم کو واضح کیا گیا ہے۔ صوتی تبدیلی کے باب میں عالمی سطح پر تسلیم شدہ قوانین (جیسے گرم کا قانون اور گراس من کا قانون) پر بحث کی گئی ہے۔ صوت تجزیہ (Phonemics) کے باب میں بامعنی اور اہم اصوات کے فرق اور اس کی عملی افادیت کو ساپیر اور پائیک کے حوالوں سے پیش کیا گیا ہے۔

اس کے بعد تشکیلیات، نحو اور معنیات کے ابواب شامل ہیں۔ سروری صاحب نے تشکیلیات کے تحت الفاظ کی اندرونی بناوٹ کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے، جس میں مادّے (Roots)، سابقے (Prefixes) اور لاحقے (Suffixes) کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نحو (Syntax) کے ذیل میں جملوں کی ظاہری و باطنی ساخت، مسند اور مسند الیہ کا تعلق اور انضمامی و امتزاجی زبانوں (عربی اور عبرانی وغیرہ) کا تقابلی اور نحوی فرق واضح کیا گیا ہے۔ معنیات کے باب میں الفاظ کے معنوں میں ارتقائی تبدیلی، استعارہ، نرم گوئی اور زبان کے سماجی استعمال سے پیدا ہونے والے نئے مفاہیم کا تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔

تاریخی طریقہ، زبانوں کی تقسیم اور تاریخ جیسے ابواب میں تاریخی طریقۂ تحقیق پر

گفتگو کرتے ہوئے ماخذی زبانوں اور خاص طور پر ہند یورپی زبانوں کی بازتعمیر کا ذکر ہے۔ زبانوں کو ان کی بناوٹ (ترکیبی، غیر ترکیبی، تصریفی) اور خاندانی اعتبار (سامی، حامی، چینی، دراوڑی وغیرہ) سے تقسیم کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی زبانوں پر ایک مکمل باب موجود ہے جس میں ہند آریائی زبانوں، سنسکرت اور اردو کے آغاز وارتقا پر سیر حاصل گفتگو ہے۔ سولہویں باب میں ہندوستانی قواعد نویسوں (جیسے پانی) سے لے کر جدید دور کے علما تک علمِ زبان کی پوری تاریخ سمیٹ لی گئی ہے۔ اسی طرح کتاب کے اٹھارویں باب 'تحریر کا آغاز اور ارتقا' میں قدیم تصویر نگاری اور تصور نگاری سے لے کر خالص ابجدی حروف اور ہندوستانی رسم الخط (برہمی اور خروشتی وغیرہ) کی ابتدا اور ارتقا کی ایک دلکش تاریخی روداد پیش کی گئی ہے۔

عبدالقادر سروری نے اس کتاب کے پہلے اور دوسرے طبع کے دیباچوں میں خود اس تاریخی حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ اگرچہ ان سے قبل ڈاکٹر سید سجاد حسین اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور (جنھوں نے ہندوستانی لسانیات لکھی) نے اس موضوع پر ابتدائی اور قابلِ قدر کام کیا تھا، لیکن جدید لسانیات اور خاص طور پر صوتیات اور صوت تجزیہ جیسے خالص سائنسی اور تکنیکی پہلوؤں پر اردو میں یہ پہلی مبسوط اور جامع کتاب تھی۔

اس کتاب کی سب سے بڑی انفرادیت اور مصنف کا سب سے اہم کارنامہ اس کی 'اصطلاح سازی' ہے۔ انگریزی کی مشکل، جدید اور پیچیدہ لسانی اصطلاحات کے نہایت موزوں، سلیس اور بامعنی اردو متبادل وضع کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ مصنف نے بڑی دیدہ ریزی اور لسانی شعور کے ساتھ یہ اصطلاحات متعارف کرائیں، جن کی ایک مفصل فرہنگ کتاب کے آخر میں شامل کی گئی ہے تاکہ قاری کو کسی قسم کی الجھن نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اصطلاحات (جیسے مصوتہ، مصمتہ، تشکیلیات، صوتی تجزیہ وغیرہ) آج اردو لسانیات کا مستقل حصہ بن چکی ہیں۔

عبدالقادر سروری کی کتاب 'زبان اور علم زبان' محض ایک عام نصابی کتاب نہیں بلکہ اردو میں لسانیات کی ایک مکمل، جامع اور مستند انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب اردو لسانیات کے طلبہ و طالبات، اساتذہ کرام اور زبان کی ساخت و تاریخ میں علمی دلچسپی رکھنے والے ہر باشعور قاری کی ذاتی لائبریری کی زینت ہونی چاہیے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان یقیناً اس بات پر مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے ماضی کے اس عظیم تاریخی اور علمی ورثے کو معدوم ہونے سے بچایا اور اسے نئی نسل تک نہایت خوبصورت، دیدہ زیب اور معیاری انداز میں منتقل کرنے کا اہم قومی فریضہ انجام دیا ہے۔

خواتین و اطفال سے متعلق قوانین (ایک درسی کتاب-جلد اوّل)

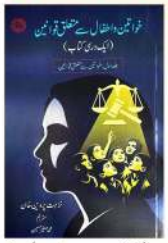

مصنفہ: نزہت پروین خان، مترجم: محمد صغیر حسین
صفحات: 678، قیمت: 405 روپے، سنہ اشاعت: 2026
ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: عشرت ظہیر
مکان نمبر 546، تھرڈ فلور، گلی نمبر A-6، ذاکر نگر، نئی دہلی۔25

پیش نگاہ کتاب 'خواتین واطفال سے متعلق قوانین (ایک درسی کتاب-جلد اول)' کی مصنفہ پروفیسر نزہت پروین خان، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ قانون سے 1992 میں منسلک ہوئیں، وہ ٹائمز گروپ گریٹر نوئیڈا، اتر پردیش کے زیر اہتمام چلنے والے بینیٹ یونیورسٹی کے اسکول آف لا کی سابق ڈین بھی رہ چکی ہیں اور بار کونسل آف انڈیا ٹرسٹ کے قائم کردہ قانونی تعلیم وتحقیق کی انڈیا انٹرنیشنل یونیورسٹی (آئی آئی یو ایل ای آر) گوا کے مشاورتی بورڈ کی رکن بھی ہیں۔ انھوں نے دہلی کے مختلف علاقوں میں خواتین سے متعلق قوانین کے سلسلے میں عوامی بیداری اور حساسیت کے لیے قانونی بیداری پروگرام کے قومی کونسل برائے خواتین کے انسپانسر کردہ تحقیق پروجیکٹ بھی کیے ہیں۔

یہ مختلف تعلیمی و انتظامی عہدوں اور مناصب پر فائز رہی ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں گلوبلائزیشن آف پروفیشنل لیگل ایجوکیشن، کنسٹی ٹیوشنل کانسیپٹس، لیگل کنٹرول آف ایئر پولیوشن پرابلمس اینڈ پرسپیکٹیوز، سوشیو اکونومک آفینسیز فارینسک سائنس اینڈ انڈین لیگل سسٹم قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر نزہت پروین کی متذکرہ کتاب کو انگریزی سے اردو میں ایم اے، ایل ایل بی، سند یافتہ محمد صغیر حسین نے ترجمہ کیا ہے۔ وکالت کے علاوہ یہ تصنیف وتالیف اور ترجمہ سے شغف رکھتے ہیں۔ اس اہم، کارآمد، حساس اور ٹیکنیکل کتاب کا رواں دواں ترجمہ، ترجمہ نگاری کے فن پر ان کی مضبوط گرفت کا گواہ ہے۔

دراصل خواتین خود اپنی پہچان سے بیگانہ ہیں اور چشم پوشی بھی کرتی ہیں— خود کی خود سے پہچان کی ضرورت ہے، اور اس ضرورت اور اس جانب پیش قدمی کے لیے ضروری ہے کہ قانون اور مملکت کے ذریعے دی گئی قوت کو سمجھیں، جانیں اور اسے اپنی زندگی کا حصہ بنائیں— اس نقطہ نظر سے اور اس جانب اقدام کے لیے یہ کتاب 'خواتین و اطفال سے متعلق قوانین' بے حد اہم، کارآمد اور آلۂ حیات کی حیثیت کی حامل ہے۔

پیش نگاہ کتاب 'خواتین واطفال سے متعلق قوانین' (ایک درسی کتاب-جلد اوّل) میں خواتین سے متعلق قوانین کا احاطہ کرتے ہوئے اسے کل پانچ ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔

باب اوّل کے تحت 'خواتین کا مقام ومرتبہ اور بھارت کا آئین' کے زیر عنوان ہندوستان میں خواتین کی اہمیت، عہد قدیم میں خواتین کی حیثیت، عہد وسطیٰ میں خواتین کی حیثیت، بھکتی تحریک، سیاسی تحریک، سماجی، مذہبی تحریک، آئینی توضیعات، جنسی ناانصافی، جبر واستبداد، استحصال اور تشدد وغیرہ عنوانات کے تحت تفصیلی بحث اور وضع کردہ قوانین کی وضاحتیں ہیں۔ ان تفصیلات وتوضیحات کے بعد خواتین کو بااختیار، مضبوط ہستی بنانے والی سہولیات کا ایک سلسلہ درج ہے۔ مثلاً بیٹی بچاؤ بیٹی پڑھاؤ اسکیم 2015، خواتین ہیلپ لائن 2016، راشٹریہ مہیلا کوش 1993، زچگی راحت پروگرام 2017، سوکنیا سمردھی یوجنا 2015 وغیرہ— اس باب کے اختتام پر مختلف آرٹیکل اور عدالتوں کے فیصلوں کو درج کرتے ہوئے وضاحت کی گئی ہے کہ قانون نے خواتین سے متعلق کس کس بنیاد پر اور کس کس شکل میں مستحکم زندگی جینے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ مثلاً:

> ''انوج گرگ بنام ہوٹل ایسوسی ایشن آف انڈیا (55) میں عدالت نے واضح کیا کہ اصناف کے مابین واقع جسمانی فرق کا خیال رکھنا ضروری ہے.... یہ مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ حفاظت کے ایسے حالات پیدا کرے جہاں خواتین سکون واطمینان اور خود اعتمادی کے ساتھ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں پوری کرسکیں۔''

باب دوم میں 'خواتین کے لیے بین الاقوامی قوانین اور کنونشنز' کے زیرعنوان خواتین کے انسانی حقوق کو 'حقوق لاینفک' قرار دیا گیا ہے— اس تعلق سے عورتوں پر ساری دنیا میں آئے دن ہونے والے جور وستم بالجنس اور ان کے استحصال کا تذکرہ کیا گیا ہے او رپھر عورتوں کی حیثیت کو برقرار رکھنے کے متعدد بین الاقوامی دستاویزات کی وضاحتیں کی گئی ہیں۔ مثلاً:

''...رکن ملکوں نے یہ عہد کرلیا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے اشتراک عمل سے ساری دنیا میں اصولاً اور عملاً حقوق انسانی اور بنیادی آزادیوں کا زیادہ سے زیادہ احترام کریں گے اور کروائیں گے—''

اس باب میں مختلف آرٹیکل کی تفصیلات بھی درج ہیں اور اسی زمرے میں مختلف کارآمد کنونشن کی کارگزاریوں کو واضح کیا گیا ہے۔ مثلاً:

* بین الاقوامی مزدور تنظیم کنونشن برائے مساوی اجرت 1951
* خواتین کے سیاسی حقوق پر کنونشن 1952
* تعلیم میں تفریق کے خلاف یونیسکو کنونشن 1960
* خواتین کے ساتھ تفریق کی بیخ کنی پر اعلامیہ 1967

وغیرہ وغیرہ—

اس باب کے اختتام پر نتیجہ کے طور پر رقم کیا گیا ہے کہ:

''...یہ ضروری ہے کہ خواتین کے حقوق انسانی کے تحفظ کی مہم اور بھی زیادہ مخصوص محاذوں پر مخصوص مسئلوں پر چلائی جائے اور اس کے دائرہ کار میں عام حقوق انسانی کو بھی شامل کیا جائے—''

باب سوم میں 'خواتین کے خلاف جرائم' کے تحت جرائم کی مختلف شکلوں کو واضح کیا گیا ہے۔ اس تعلق سے ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ مثلاً عورتوں پر تشدد سے متعلق قوانین، زنا بالجبر اور جنسی دست درازی، انسانوں کی ممنوعہ تجارت اور عدالتی احکامات، دخترکشی اور مادہ جنین کشی، دخترکشی کی روک تھام میں سماجی تعاون، جہیز، جہیزی موت کا جرم، خواتین کے خلاف سائبر کرائم وغیرہ۔

اس طرح اس باب میں جرائم کی مختلف شکلوں کو بھی واضح کیا گیا ہے اور ان کے سدباب اور جرائم کے خلاف کاروائی کے لیے ان سے متعلق قوانین، تعزیرات ہند کی پرانی توضیعات، عدالتی رجحانات اور مختلف ترمیمی ایکٹ کو اس طرح درج کیا گیا ہے کہ ان کی واقفیت کی روشنی میں خواتین کو ظلم واستبداد کے خلاف سینہ سپر ہونے کا حوصلہ ملتا ہے اور محافظت کی راہیں روشن ہوتی ہیں۔ اس باب میں مختلف مقدموں اور ان سے متعلق فیصلوں میں جرم کے تدارک کی صورت حال کو نمایاں کیا گیا ہے۔ مثلاً:

''ریاست اڑیسہ بنام تھکارا بیسرا (35) میں یہ تسلیم کیا گیا کہ زنا بالجبر محض ایک جسمانی دست درازی ہی نہیں، بلکہ یہ بسا اوقات متاثرہ کی پوری شخصیت کو منتشر کردیتی ہے۔ زانی بے بس عورت کی روح کی تذلیل کرتا ہے اور اسی لیے مستغیثہ کے بیان حلفی کو پورے مقدمے کے پس منظر میں دیکھا جانا چاہیے—''

اس باب میں مختلف النوع مقدموں اور ان سے متعلق کارروائی اور فیصلوں کی تفصیلات کے بعد 'اختتامیہ' میں تحریر ہے:

''خواتین کے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لیے متعدد قوانین کے باوجود خواتین کے خلاف جرائم اور ان کو نشانہ بنائے جانے کے واقعات کی شرح میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے... تاہم مزید سخت اور عبرتناک قوانین کی ضرورت ہے تاکہ ایسے جرائم کے ارتکاب کے بارے میں ارادہ رکھنے والے کو یہ حوصلہ نہ مل سکے...''

باب چہارم میں 'عائلی قوانین کے تحت حقوق نسواں' کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس باب کا تعارف کراتے ہوئے مصنفہ نے لکھا ہے:

''کثرت میں وحدت ہمارے ملک کی وراثت ہے۔ آئین ہند کا آرٹیکل 14 مساوات اور قوانین کا مساوی تحفظ فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے عوام جو مختلف مذاہب وعقائد کی پیروی کرتے ہیں۔ مثلاً ہندو، مسلم، عیسائی اور پارسی وغیرہ اپنے اپنے عائلی قوانین کے تابع ہوتے ہیں۔''

اس باب میں عائلی قوانین کی وضاحتیں، قانون اور عدالتی اقدام کی روشنی میں پیش کی گئی ہیں۔ اس تعلق سے موضوع کی حساسیت کے اعتبار سے عنوانات قائم کیے گئے ہیں اور ان کی توضیحی صورتیں منکشف کی گئی ہیں۔ چند ذیلی عنوانات سے اس باب کی اہمیت واضح ہوگی۔ مثلاً:

''ازدواجی تعلقات میں عورتوں کی اہمیت، شادی اور طلاق، شادی سے متعلق ہندو قوانین، شادی سے متعلق مسلم قوانین، شادی سے متعلق عیسائی قوانین، شادی سے متعلق پارسی قوانین، خواتین اور حق ملکیت، ہندو خواتین کا حق ملکیت، عدالتوں کے حق ملکیت سے متعلق مسلم قانون۔ ہندوستان میں عائلی عدالت کا نظام—''

مصنفہ نے ذیلی عنوانات کے تحت مختلف مقدمات اور ان سے متعلق فیصلوں کی تفصیلات درج کی ہیں اور بالآخر نتیجتاً رقمطراز ہیں:

''حصول آزادی کے بعد عائلی قوانین میں عدالتوں اور قانون ساز اداروں کی مداخلت سے جستہ جستہ اصلاحات تو ہوئیں، لیکن ایسی اصلاحات، ہر ملک میں اکثریت کے قوانین کے دائرے تک محدود رہتی ہیں۔''

باب پنجم 'ہندوستانی قوانین مزدوری اور خواتین' کے زیرعنوان رقم کیا گیا ہے۔ اس باب میں مزدوری یا روزگار قوانین سے متعلق مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ٹریڈ یونین کی کارکردگی، کارکنوں کی اجرت، اوقات، تعطیلات، ناجائز مزدوری، مناسب مزدوری کی عدم ادائیگی، صحت، بقائے زندگی سے متعلق اقدامات کا تفصیلی احاطہ کیا گیا ہے۔ اس تعلق کی توضیح میں مزدوری قوانین اور تحفظ خواتین، یومیہ اجرت پانے والی عورتیں اور زچگی راحت، کارخانہ ایکٹ ادائیگی بونس کی تفصیلات میں عورتوں کو دی جانے والی رعایتوں کا بیان ہوا ہے۔

آخر میں اس امر کا ارادہ کیا گیا ہے کہ:

''...ہمارا ہدف ایسی پالیسیاں وضع کرنا اور اداراتی نیز انفرادی تبدیلیاں پیدا کرنا ہے جو ہر جا اور ہر جگہ خواتین اور لڑکیوں کی زندگیوں کو بہتر اور بہتر از بہتر بنانے میں مددگار ہوں گی۔''

'خواتین واطفال سے متعلق قوانین' (ایک درسی کتاب جلد اول) خواتین کے اپنے آپ کی پہچان کرانے کا وسیلہ ہے، یہ کتاب خواتین کے تشخص، نشو واور دنیا میں باوقار اور اعتماد کے ساتھ جینے کی راہوں کا نشان ہے—!

زراعت کو آب وھوا میں ھونے والی تبدیلی کے مطابق بنانا

مصنف: محمد اسرارالحق

صفحات: 72، قیمت: 120 روپے، سنہ اشاعت: 2026

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد یونس انصاری، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی

جس طرح زندہ رہنے کے لیے ہوا، پانی اور غذا لازمی ہے اسی طرح غذا کے لیے زراعت بے حد ضروری ہے۔ کرۂ ارض پر ہوا اور پانی پہلے سے ہی اپنی اصل حالت میں موجود ہیں جسے شفاف بنا کر حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن غذا کا حصول اتنا آسان نہیں، یہ بذریعہ زراعت ہی ممکن ہے یعنی غذائی اشیا کی پیداوار کا انحصار زراعت وکاشتکاری پر ہے۔ اگر زراعتی عمل کو روک دیا جائے تو یہ انسانی وجود کی بقا کے لیے سنگین مسئلہ بن جائے گا اور لوگ کھانے کے لیے ترس جائیں گے۔ یوں اس فن اور پیشہ کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ زندگی کے لیے کس قدر ناگزیر ہے۔

زراعت کا دائرہ کار بہت وسیع ہے جو نہ صرف فصلیں اگانے تک محدود ہے بلکہ گائے، بھینس، بھیڑ، بکری اور مرغ وماہی پالنا بھی اس میں شامل ہے۔ زراعت انسانی زندگی کی بنیادی ضرورت یعنی غذا کی فراہمی جیسے اناج، دال، سبزیاں، پھل، دودھ اور شہد کے حصول کا فن ہے۔ یہ عمل کئی مراحل سے ہوکر گزرتا ہے۔ اس میں مزدور اور کسان محنت ومشقت سے اپنے پیشے کو انجام دیتے ہیں، پھر خرید وفروخت کے لیے غذائی اجناس کو بازار میں لایا جاتا ہے جس سے ملک کی معیشت کو تقویت ملتی ہے۔ دنیا کے کئی ملکوں کی معیشت کا دارومدار تو اسی پر ٹکا ہے۔ یہاں تک کہ دنیا کی جی ڈی پی میں بھی زراعت کا بنیادی رول ہوتا ہے۔ غذا کے بغیر انسانی زندگی کے وجود کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ زراعت محض فن ہی نہیں بلکہ یہ وہ علم ہے جس کے سوتے سائنس سے جا ملتے ہیں۔ سائنس سے اس کا گہرا تعلق رہا ہے، بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ زراعت سائنس کا وہ شعبہ ہے جہاں تحقیق وایجادات کے ذریعے پیداوار کے نئے نئے طریقے تلاش کیے جاتے ہیں اور کم وقت میں زیادہ اور اچھی فصلیں اگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

محمد اسرارالحق نے 'زراعت کو آب وہوا میں ہونے والی تبدیلی کے مطابق بنانا' جیسی کتاب لکھ کر اردو قارئین کو زمینی حقیقتوں، موسمی تبدیلیوں اور سائنسی تحقیقات سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے دور حاضر کے اہم موضوع، زراعت اور ماحولیات کا جائزہ پیش کر کے ایک ایسی پیش رفت کی ہے جس سے کسانوں کے ساتھ ساتھ عوام الناس بھی بہرہ مند ہوسکیں گے۔ مصنف نے اس کتاب کو مندرجہ ذیل چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے (1) آب وہوا میں تبدیلی ایک حقیقت (2) آب وہوا میں تبدیلی اور زراعت (3) آب وہوا میں تبدیلی کی اہم وجوہات (4) ترقی پذیر ممالک پر آب وہوا میں تبدیلی کے اثرات (5) بین الاقوامی اور قومی سطح پر آب وہوا میں تبدیلی کی روک تھام کے لیے ممکنہ اقدامات (6) اختتامی کلمات۔

پہلے باب میں ہمیں موسم کے بدلتے مزاج اور اس کی حقیقت کا علم ہوتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ کن اسباب کے تحت موسمی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ یہ حقیقت ہے کہ موجودہ صدی میں آب وہوا بہت تیزی کے ساتھ تبدیل ہوئی ہے۔ عالمی سطح پر 2016 میں اوسط درجہ حرارت سب سے زیادہ درج کیا گیا اور 2020 میں بھی اتنا ہی درجہ حرارت رہا ہے۔ موسم کی ایک تبدیلی یہ بھی دیکھی جارہی ہے کہ سمندری طوفان Trophical Typhones جلدی جلدی آرہے ہیں، بن موسم بارشیں ہورہی ہیں، گرین ہاؤس گیس کے اخراج میں اضافہ ہوا ہے، پہاڑوں کی برف پگھلنے کے واقعات بھی سامنے آئے ہیں۔ اس کے علاوہ پہاڑی علاقوں میں سیلاب نے قہر برپا کیے ہیں یہی وہ اسباب ہیں جن سے موسم کا اعتدال وتوازن بگڑا ہے۔

'آب وہوا میں تبدیلی اور زراعت' کتاب کا اہم موضوع ہے۔ آب وہوا کی تبدیلی کے چلتے فن زراعت کو بروئے کار لانا کس قدر چیلنج بھرا ہوسکتا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ بدلے ہوئے ماحول کا اثر کھیتی پر بے حد شدید ہوتا ہے۔ گیہوں کی فصل اگانی ہو تو اس کے لیے ماحول مکمل طور پر سازگار ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح مخصوص پھلوں کی پیداوار مخصوص ماحول کے تحت ہی کی جاسکتی ہے۔ دنیا کے ہر حصے میں موسم کا اپنا الگ مزاج ہوتا ہے اور موسم کی یہی خاصیت اس حصے کی پہچان بن جاتی ہے جس سے وہاں اسی مناسبت سے پیڑ پودے اگائے جاتے ہیں۔ لیکن موجودہ وقت میں ماحولیاتی تبدیلی کے سبب فصلوں کی پیداوار کو سمجھنے میں بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے لہٰذا اب کسانوں کے لیے ان طریقوں سے آشنا ہونا ضروری ہے کہ موسم کب کروٹ بدلتا ہے، سردی میں برف کی کمی، گرمی میں درجہ حرارت کی زیادتی اور بے موسم بارش کے فصل پر کیا نقصانات ہوسکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کا ذکر اسرارالحق نے سادہ اور عام فہم زبان میں کیا ہے۔

کتاب میں آب وہوا کی تبدیلی کی وجوہات بھی بتائی گئی ہیں۔ ایک وجہ لوگوں کا طرز زندگی ہے جس نے گلوبل وارمنگ جیسی صورت حال پیدا کردی ہے۔ دوسرا گلوبل وارمنگ سے گلیشئر کا پگھلنا پھر اس سے سطح آب کا بڑھنا۔ ایک واقعہ دوسرے کو جنم دیتا نظر آتا ہے اور یہ سلسلہ اس قدر طویل ہوتا جارہا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف زراعت کو خطرات لاحق ہوگئے ہیں بلکہ زندگی نت نئے مسائل سے دوچار ہورہی ہے۔ دیگر وجوہات میں پلاسٹک کا استعمال، ایندھن پر مکمل انحصار، شہری آبادکاری کے لیے جنگلوں کا صفایا کرنا، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ اور موبائل کے کچرے کو ادھر ادھر پھینک دینا شامل ہیں۔

اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ پہلے چار ابواب میں آب وہوا کی تبدیلی کے اسباب پر غور کیا گیا ہے اور آخری باب میں ان سب کا حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر ماحولیاتی تبدیلی کی روک تھام کے لیے کیا ممکنہ اقدامات کیے گئے ہیں۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے تو یہاں آب وہوا کی تبدیلی کو روکنے کی حتی الامکان کوششیں کی گئیں ہیں۔ گرین ہاؤس گیس کے اخراج کو 2030 تک 33 سے 35 فیصد تک کم کرنے کا ہدف متعین کیا گیا ہے اور جگہ جگہ پیڑ پودے لگانا اور ہریالی میں اضافہ کرنے جیسے اقدامات بھی کیے گئے ہیں۔

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ بارش کا پانی ضائع چلا جاتا ہے، اگر اسے استعمال میں لے لیا جائے تو یہ ایک مثبت قدم ہوگا۔ اس سلسلے میں مصنف نے ایک تجویز یہ پیش کی ہے کہ جب آسمان سے پانی برسے تو اسے جمع کرلیا جائے اور جمع شدہ پانی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے طریقوں کو بہتر بنایا جائے۔ اسی مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے ملک کے مختلف حصوں میں 70 سے زیادہ تالاب بنائے جاچکے ہیں۔

'زراعت کو آب ہوا میں ہونے والی تبدیلی کے مطابق بنانا' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعہ شائع ہونے والی کتابوں میں سے ایک اہم کتاب ہے جو زراعت اور ماحولیات جیسے بیش قیمتی موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب اردو قارئین کے ساتھ ساتھ کسانوں کے لیے معلوماتی اور سودمند ثابت ہوگی۔

تحقیق و تنقید

رباعی کا فن ایک تحقیقی جائزہ

مصنف: ڈاکٹر اختر ریاض

صفحات: 48، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2025

مطبع: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: خوشبو پروین

K12، پہلی منزل، حاجی کالونی، جامعہ نگر، نئی دہلی

'رباعی کا فن ایک تحقیقی جائزہ' ڈاکٹر اختر ریاض کی پانچویں کتاب ہے۔ اس سے پہلے عروض کے حوالے سے ان کی کتاب 'ریاض عروض' بھی شائع ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر اختر ریاض وظیفہ یاب آئی اے ایس آفیسر ہیں۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد موصوف اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب محض 48 صفحات پر مشتمل ہے، اس کا انتساب انھوں نے ان شعرا و طلبا کے نام کیا جو رباعی کے فن سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب پانچ ابواب میں منقسم ہے۔ پہلا باب مصنف کے پیش لفظ، فن رباعی پر ڈاکٹر امیر حمزہ کی تقریظ کے علاوہ رباعی کا فن جس کو موصوف نے چھ ذیلی عنوانات کے تحت لکھا ہے۔ رباعی کی تعریف، رباعی کے موضوعات، اقسام رباعی، رباعی کی زبان، رباعی اور قطعہ میں فرق، رباعی اور قطعہ کی خصوصیات، دوسرے باب میں رباعی کی ایجاد کے متعلق مختلف نظریات کو بنیاد بنایا گیا ہے، جس شمس بن قیس رازی، دولت شاہ سمرقندی، مفتی محمد سعد اللہ، منشی دیوی پرساد سحر، قدر بلگرامی، مولانا محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، حکیم نجم الغنی، حمید عظیم آبادی، احسن مارہروی، عندلیب شادانی، سید محمد عباس اور جلال الدین اصفہانی کے نظریات پیش کیے ہیں۔ تیسرا باب رباعی کا زحافات ہے، جس کے پانچ ذیلی عناوین ہیں۔ چوتھا باب رباعی کے اوزان جس کے ذیلی عناوین چار ہیں پانچواں باب کتابیات۔ ڈاکٹر ریاض نے اس کتاب میں رباعی کی تعریف یوں بیان کی ہے:

''رباعی عربی کا لفظ رباع کے آگے یائے نسبتی بڑھا کر بنایا گیا ہے جس کے معنی چار والا کے ہیں۔''

(رباعی کا فن ایک تحقیقی جائزہ از ڈاکٹر اختر ریاض، ص 1)

انھوں نے رباعی کی تعریف بیان کرنے کے بعد رباعی کے موضوعات کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح جب رباعی خانقاہوں میں نشو ونما پا رہی تھی تو اس کے موضوعات پند و نصائح، فقر و فنا، اخلاق و موعظت، معارف و حقائق اور ترک دنیا وغیرہ ہوا کرتی تھیں۔ اس کے بعد کس طرح بدلتے زمانے کے ساتھ ساتھ اس صنف نے اپنے اندر نئے نئے موضوعات کو اپنے سانچے میں ڈھالا، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے لے کر جوش و فراق تک کا سفر طے کیا۔ صنف رباعی نے کبھی اپنا دائرہ محدود نہیں رکھا اور نہ ہی کبھی خود کو محدود رکھنے کی کوشش کی بلکہ اس نے اپنے اندر اتنی لچک پیدا کر لی کہ اس کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ رباعی کے تین اقسام کا ذکر بھی اس کتاب میں ہے رباعی خصی ہوتی ہے غیر خصی یا مستزاد، رباعی کی زبان کے متعلق ڈاکٹر ریاض کہتے ہیں کہ:

''کامیاب شاعری کے لیے ضروری ہے کہ مختلف اصناف سخن کے لیے مختلف قسم کے الفاظ استعمال کیے جائیں۔ قصیدے کے لیے الفاظ کی شان و شوکت، ترکیبوں کی بلند آہنگی... اسی طرح غزل کے لیے نرم و نازک، شیریں، دلکش اور حسین الفاظ کی ضرورت ہے... لیکن ان اصناف سخن میں رباعی کی زبان نہایت سلجھی ہوئی اور صاف ہو شستہ ہو تا کہ قارئین کے دل و دماغ اس کے اثرات کو فوراً قبول کر لے۔''

(رباعی کا فن ایک تحقیقی جائزہ، از ڈاکٹر اختر ریاض، ص 8)

رباعی اور قطعہ میں فرق بالکل آسان اور عام فہم الفاظ میں بیان کیا ہے، جس سے قاری کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو، بالخصوص طلبا کو رباعی اور قطعہ کی خصوصیات بھی بیان کی ہیں جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ صنف رباعی کی ایجاد کے متعلق مختلف نظریات ہیں۔ ان نظریات کو ڈاکٹر ریاض نے 13 کتابوں کے حوالے سے پیش کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رباعی کی ایجاد شخصی ہے ان کے پیش کردہ 13 کتابوں کے حوالے سے اکثر نظریات میں امیر یعقوب بن لیث صفار کے بچے کا واقعہ نقل کیا گیا ہے اور رباعی کا موجد انھوں نے علمائے عروض کے خیال کے مطابق رودکی کو ہی مانا ہے۔

تیسرا باب رباعی کے زحافات پر ہے جو بہت ہی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ موصوف نے رباعی کے زحافات کے متعلق بحث کو بہت ہی سادہ سہل اور آسان انداز میں پیش کیا ہے جس سے عروض سے ہلکی پھلکی شد بد رکھنے والے بھی اس کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ چوتھے باب میں رباعی کے اختراع کردہ تمام اوزان کے متعلق مختصراً گفتگو کی ہے۔ رودکی کے اختراع کردہ 24 اوزان اور علامہ سحر عشق آبادی کے بارہ اوزان کو درست مانتے ہوئے، دلائل کے ساتھ اس پر مکمل اور مدلل جواز پیش کیا ہے۔ زار علامی کے اختراع 18 اوزان اور عبید اعظم اعظمی کے 28 اوزان کو مسترد قرار دیتے ہیں جس کی وضاحت بھی پیش کرتے ہیں۔ عبید اعظم اعظمی کے اختراع کردہ اوزان کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ:

''عبید اعظم اعظمی کا ایجاد کردہ 28 اوزان رباعی محض 'ایجاد بندہ ہے' جس کی آہنگ عروض کی روشنی میں کوئی اہمیت نہیں بلکہ یہ یکسر مسترد کرنے لائق ہے۔'' (رباعی کا فن ایک تحقیقی جائزہ، از ڈاکٹر اختر ریاض، ص 44)

'رباعی کا فن ایک تحقیقی جائزہ' کے متعلق ایک عمومی رائے یہ دی جا سکتی ہے کہ مختصراً رباعی کے فن کو آسان طریقے سے سمجھنے کے لیے یہ کتاب کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ مجھے اس کتاب میں تھوڑی کمی یہ محسوس ہوئی کہ اس کتاب میں نظریات کے متعلق ذرا تفصیلی گفتگو ہونی چاہیے تھی۔ ڈاکٹر امیر حمزہ کی کتاب 'رباعی تحقیق' کے منظر عام پر آنے کے بعد تو رباعی کے آغاز کے متعلق کئی در پیچے وا ہوئے ہیں۔ اس لیے اس پر مزید گفتگو ہونی چاہیے تھی۔ جہاں تک موصوف نے زار علامی کے 18 اوزان اور عبید اعظم اعظمی کے 28 اوزان کو مسترد کیا ہے اور اس کے لیے جو دلائل پیش کیے میں بھی ان سے متفق ہوں بلکہ میں نے بھی اپنی پی، ایچ ڈی کے مقالے میں اس پر تفصیلی بحث کے ساتھ دونوں صاحبان کے اوزان کو مسترد کیا ہے۔ بہر حال یہ کتاب موضوع کے اعتبار سے اپنی نوعیت کی اہم کتاب ہے۔

سوانح

مظہر الحق، تحریک آزادی ہند کا فراموش کردہ قائد

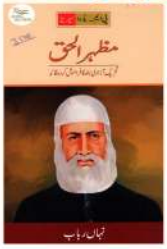

مصنفہ : نہاں
صفحات:115، قیمت:170 روپے
ناشر:ڈائرکٹر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، نئی دہلی۔70
مبصر:عبدالمنان صمدی
2939، گلی نمبر 5، طیب کالونی، کولی، علی گڑھ

برصغیر کی تاریخ بالخصوص تحریکِ آزادیٔ ہند ایک ایسا ہمہ گیر اور وسیع موضوع ہے جس میں بے شمار شخصیات نے اپنے اپنے انداز میں خدمات انجام دیں۔ کچھ نام تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف سے محفوظ ہو گئے، جبکہ بعض ایسے بھی رہے جن کی قربانیاں اور جدوجہد وقت کے ساتھ پس منظر میں چلی گئیں۔ انھیں شخصیات میں ایک اہم اور باوقار نام مظہرالحق کا ہے، جنھیں نہاں رباب نے اپنی تصنیف میں ازسرِنو زندہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ کتاب محض ایک سوانحی کتاب نہیں بلکہ ایک سنجیدہ تاریخی بازیافت (Historical Retrieval) ہے، جس کے ذریعے مصنفہ نے ایک ایسے قائد کو قومی حافظے میں واپس لانے کا بیڑا اٹھایا ہے جس کی خدمات تحریکِ آزادی میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔

اس کتاب کی اہمیت اس لیے بھی دوچند ہو جاتی ہے کہ اسے ساہتیہ اکادمی یووا پرسکار 2025 کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ انتخاب نہ صرف مصنفہ کی ادبی و تحقیقی کاوش کا اعتراف ہے بلکہ اس امر کی دلیل بھی ہے کہ موضوع کی معنویت اور پیشکش کی سنجیدگی نے علمی حلقوں کو متاثر کیا ہے۔ ایک نسبتاً مختصر کتاب کا اس درجے پر سراہا جانا اس کی فکری گہرائی اور افادیت کا غماز ہے۔

کتاب کے ابتدائی حصے میں مصنفہ اس بنیادی نکتے کو ابھارتی ہیں کہ کسی بھی قوم کی شناخت اس کی تاریخ اور زبان سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر قوم اپنی تاریخ سے ناواقف ہو جائے تو اس کا فکری تسلسل منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی تناظر میں مظہرالحق کا انتخاب نہایت بامعنی ہے۔ وہ نہ صرف سیاسی میدان کے فعال کردار تھے بلکہ قومی یکجہتی، ہندو مسلم اتحاد اور آزادی کے لیے ہمہ جہت جدوجہد کے علمبردار بھی تھے۔ مصنفہ نے ان کے سوانحی کوائف کو محض زمانی ترتیب میں پیش کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی شخصیت سازی کے عوامل تعلیم، خاندانی پس منظر، فکری اثرات اور سماجی ماحول کو بھی نمایاں کیا ہے۔ اس اندازِ پیشکش سے قاری کو یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ ایک قائد کی تشکیل کن داخلی اور خارجی عوامل کے امتزاج سے ہوتی ہے۔

کتاب کو چھ ابواب میں منظّم کیا گیا ہے، جو تحقیقی ترتیب اور فکری ارتقا کا احساس دلاتے ہیں۔ پہلے باب میں سوانحی حالات بیان کیے گئے ہیں؛ دوسرے باب میں شخصیت اور اوصاف کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

تیسرے اور چوتھے ابواب میں علمی و سیاسی خدمات اور تحریکِ آزادی میں ان کے عملی کردار کو موضوع بنایا گیا ہے؛ پانچویں باب میں ہم عصر قائدین کے ساتھ تعلقات اور تقابلی جائزہ شامل ہے؛ جبکہ چھٹے باب میں سیاسی زندگی کے نشیب و فراز اور اسبابِ سبکدوشی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ ابواب نہ صرف مواد کی تنظیم کا ثبوت ہیں بلکہ اس بات کی بھی نشان دہی کرتے ہیں کہ مصنفہ نے تحقیق کو محض معلوماتی نہیں بلکہ تجزیاتی سطح پر لے جانے کی کوشش کی ہے۔

نہاں رباب کی سب سے نمایاں خوبی ان کا اسلوبِ بیان ہے۔ انھوں نے نہایت سادہ، شستہ اور رواں زبان اختیار کی ہے۔ عبارت میں تصنع یا غیر ضروری ثقالت نہیں پائی جاتی، بلکہ تسلسل اور وضاحت نمایاں ہے۔ یہی وصف اس کتاب کو محققین کے ساتھ ساتھ عام قارئین کے لیے بھی قابلِ استفادہ بناتا ہے۔ تاریخی موضوعات پر لکھی گئی کتب میں اکثر اسلوب کی پیچیدگی قاری کو متن سے دور کر دیتی ہے، لیکن یہاں زبان کی سلاست قاری کو آخر تک باندھے رکھتی ہے۔

تاہم تحقیقی معیار کے سخت پیمانوں پر اگر اس تصنیف کو پرکھا جائے تو بعض مقامات پر حوالہ جاتی مضبوطی اور تنقیدی مکالمے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اگر مختلف مؤرخین کی آرا کا تقابلی جائزہ زیادہ وسعت سے شامل کیا جاتا اور بعض اہم واقعات کے سیاسی پس منظر کو مزید گہرائی کے ساتھ واضح کیا جاتا تو کتاب کا علمی وزن مزید بڑھ سکتا تھا۔ اسی طرح چند مقامات پر تجزیاتی بحث کو مزید وسعت دینے کی گنجائش موجود تھی، جس سے متن میں فکری تنوع میں اضافہ ہوتا۔

ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ دیگر مجاہدینِ آزادی کا ذکر بیشتر مقامات پر ناموں تک محدود رہ گیا ہے۔ اگر ان شخصیات کے کارناموں کی مختصر جھلک بھی شامل کی جاتی تو تاریخی تناظر زیادہ واضح اور ہمہ گیر ہو سکتا تھا۔ اس اضافے سے مظہرالحق کے کردار کو اپنے عہد کے وسیع تر سیاسی منظرنامے میں دیکھنے میں مزید آسانی ہوتی۔

ان نکات کے باوجود کتاب کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ یہ نئی نسل کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ آزادی کی تاریخ چند معروف ناموں تک محدود نہیں۔ بے شمار ایسی شخصیات ہیں جن کی جدوجہد اور قربانیاں اجتماعی شعور میں پوری طرح محفوظ نہیں رہ سکیں۔ نہاں رباب کی یہ کاوش اسی کمی کو دور کرنے کی ایک مخلصانہ اور بامقصد کوشش ہے۔ انھوں نے نہ صرف ایک تاریخی کردار کو ازسرِنو متعارف کرایا بلکہ مطالعہ تاریخ کے ذوق کو بھی جلا بخشی ہے۔

کتاب کا ایک اور مثبت پہلو یہ ہے کہ اس میں جذباتیت کے بجائے اعتدال اور سنجیدگی غالب ہے۔ مصنفہ نے شخصیت پرستی سے گریز کرتے ہوئے خدمات اور کردار کو مرکزِ بحث بنایا ہے۔ یہی طرزِ فکر ایک سنجیدہ محقق کی پہچان ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں تجزیاتی گہرائی میں اضافہ ممکن تھا، لیکن مجموعی طور پر یہ تصنیف ایک اہم تحقیقی پیش رفت کی علامت ہے۔

مجموعی جائزے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ 'مظہرالحق: تحریکِ آزادی ہند کا فراموش کردہ قائد' اردو تحقیقی ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ایک اہم تاریخی شخصیت کو دوبارہ قومی شعور میں جگہ دیتی ہے بلکہ اس امر کی یاددہانی بھی کراتی ہے کہ تاریخ کے اوراق میں ابھی بہت سے گوشے تشنۂ تحقیق ہیں۔ نہاں رباب کی یہ کاوش ان کی سنجیدگی، محنت اور خلوص کا روشن ثبوت ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ وہ آئندہ بھی اسی عزم اور تحقیقی شعور کے ساتھ ایسے موضوعات پر قلم اٹھائیں گی اور اردو ادب و تاریخ کے سرمائے میں مزید گراں قدر اضافہ کریں گی۔

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

شعبہ اردو پٹنہ کالج وقومی اردو کونسل کے باہمی اشتراک سے یک روزہ سمینار

پٹنہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور شعبۂ اردو، پٹنہ کالج، پٹنہ کے باہمی اشتراک سے یک روزہ سمینار بعنوان 'بہار کی علاقائی زبانوں سے اردو کا رشتہ' پٹنہ کالج کے تاریخی سمینار ہال میں منعقد ہوا جس میں ماہرینِ ادب، اساتذہ، محققین اور طلبہ کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

سمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت معروف ادیب و ناقد پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ اردو زبان کو وسعت دینے کے لیے ہمیں عربی و فارسی کے ساتھ دیگر زبانوں سے بھی الفاظ اخذ کرنے چاہئیں، انھوں نے اردو کو محبت، سیاست اور انقلاب کی زبان قرار دیتے ہوئے کہا کہ بہار کی علاقائی زبانوں کے ساتھ اردو کا رشتہ نہایت گہرا اور فطری ہے، اور یہ رشتہ صدیوں کے لسانی و تہذیبی تعامل کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر ہم ان زبانوں کے باہمی تعلق کو سمجھیں تو اردو کے دائرے کو مزید مضبوط اور وسیع بنا سکتے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ عموماً اردو پر عربی و فارسی کے اثرات کی بات کی جاتی ہے، مگر علاقائی زبانوں کا اثر بھی اردو زبان پر اتنا ہی غیر معمولی ہے اس لیے علاقائی زبانوں کے ساتھ اردو کے رشتے کو سمجھنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ لسانی ہم آہنگی اور باہمی اشتراک کے بغیر زبانوں کی ترقی ممکن نہیں، اور ہمیں بغیر کسی امتیاز کے تمام زبانوں کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔ انھوں نے نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) اور انڈین نالج سسٹم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ مادری زبانوں اور علاقائی زبانوں کو فروغ دینا دراصل علمی ترقی کی بنیاد ہے۔

کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ممتاز مؤرخ پروفیسر امتیاز احمد (سابق ڈائرکٹر، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری) نے کہا کہ بہار میں میتھلی، مگہی اور دیگر علاقائی زبانوں نے اردو کو مالا مال کیا ہے اور اردو نے بھی انھیں بہت کچھ دیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مختلف زبانوں سے ترجمے کے عمل کو فروغ دینا چاہیے تاکہ ہم ایک دوسرے کے ادب اور تہذیب سے واقف ہو سکیں۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ لسانی و ادبی تبادلہ ہی علم کے دائرے کو وسیع کرتا ہے۔

مہمانِ خصوصی ڈاکٹر خالد انور (ممبر آف لیجسلیٹو کونسل، بہار) نے کہا کہ

زبانوں کے باہمی لین دین پر سنجیدہ گفتگو ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ زبانوں کو الگ تھلگ رکھ کر ترقی ممکن نہیں، بلکہ کھلے ذہن کے ساتھ ہر زبان کے ادب کا استقبال کرنا ہوگا۔ مہمانِ اعزازی پروفیسر انل کمار (پرنسپل، پٹنہ کالج) نے کہا کہ اردو ایک نہایت شیریں اور دلکش زبان ہے، جسے سن کر دل خوش ہو جاتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس زبان کی مٹھاس اور تہذیبی رنگ اسے دوسری زبانوں سے ممتاز بناتے ہیں۔ مہمانِ اعزازی ڈاکٹر اظفر شمسی (ممبر، بہار اسٹیٹ مائنارٹی کمیشن و پرنسپل، ڈی ایس ایم کالج، جھاجھا) نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے زمینی سطح پر سنجیدہ کوششوں کی ضرورت ہے۔ انھوں نے قومی کونسل کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ ایسے ادارے اردو کے مستقبل کے لیے امید کی کرن ہیں۔

جناب پرمود کمار سنگھ (سب ایڈیٹر، دینک جاگرن) نے کہا کہ زبانوں کے درمیان تفریق پیدا کرنے کے بجائے انھیں قریب لانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ لسانی ہم آہنگی ہی ایک مضبوط اور متحد معاشرے کی بنیاد ہے۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شاداب شمیم نے کی، جبکہ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر نعمان قیصر نے پیش کیے اور کلماتِ تشکر ڈاکٹر بالمکی رام نے ادا کیے۔

سمینار کا پہلا تکنیکی سیشن 'بھوجپوری اور انگیکا کا اردو سے رشتہ' کے عنوان سے منعقد ہوا، جس کی صدارت جناب مشتاق احمد نوری نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ بہار کی زبانیں اپنی زرخیزی اور وسعت کے اعتبار سے نہایت اہم ہیں۔ انھوں نے میتھلی کو ایک زرخیز اور ادبی اعتبار سے مضبوط زبان قرار دیتے ہوئے کہا کہ بھوجپوری اگرچہ کثیر تعداد میں بولی جاتی ہے، مگر اس میں ادبی کام کو مزید فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے بہار کی مختلف بولیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ تمام زبانیں اردو کے ساتھ مضبوط رشتہ رکھتی ہیں۔

مہمانِ اعزازی ڈاکٹر محمد احسن (ریجنل ڈائرکٹر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، بھوپال) نے کہا کہ کسی بھی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اسے تعلیم سے جوڑنا ضروری ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کے سمیناروں میں دیگر زبانوں اور علوم کو بھی شامل کرنا چاہیے تاکہ ایک جامع علمی ماحول پیدا ہو۔ اس سیشن میں ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، ڈاکٹر آفتاب احمد منیری، ڈاکٹر عبدالباسط حمیدی، ڈاکٹر منہاج الدین، ڈاکٹر شبنم پروین اور ڈاکٹر شبیر عالم نے مقالے پیش کیے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر نعمان قیصر نے انجام دیے۔

دوسرا تکنیکی سیشن 'میتھلی اور مگہی کا اردو سے رشتہ' کے عنوان سے منعقد ہوا، جس کی صدارت پروفیسر ابوبکر رضوی (رجسٹرار، پاٹلی پتر ایونیورسٹی) نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ میتھلی اور مگہی جیسی زبانیں اردو کے لسانی سرمائے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور ان کے باہمی تعلق کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ زبانیں صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں اور ان کا اشتراک ہماری مشترکہ تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔

مہمانِ اعزازی پروفیسر سورج دیو سنگھ (صدر شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی) نے کہا کہ اردو اور علاقائی زبانوں کے درمیان تعلق کو فروغ دینا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ لسانی ہم آہنگی علمی ترقی کی بنیاد ہے۔ جناب محمد افضل (ممبر آف گورننگ کونسل، این سی پی یو ایل) نے کہا کہ ہمیں حکومت ہند اور وزیر تعلیم کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے یہ موقع فراہم کیا جس کی وجہ سے ہم بہار کی علاقائی زبانوں سے اردو کا رشتہ پر گفتگو کر رہے ہیں اور مجھے امید ہے کہ اس طرح کے موضوعات پر بات کرنے سے دوسری زبانوں کے لوگ بھی اردو سے واقف ہوں گے اور یقیناً اس سے اردو زبان کا فروغ بھی ہوگا۔

اس سیشن میں ڈاکٹر نثار فیضی، ڈاکٹر عطا عابدی، ڈاکٹر زرنگار یاسمین، ڈاکٹر عبد الحی، ڈاکٹر اشہد کریم الفت اور ڈاکٹر نرجس فاطمہ نے مقالات پیش کیے۔

یہ سمینار مفید علمی و ادبی مباحث، مکالمے اور فکری تبادلے کے ساتھ کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا، جس نے اردو اور بہار کی علاقائی زبانوں کے باہمی رشتے کو ایک نئے زاویے سے سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔

اس موقع پر صف سامعین میں ڈاکٹر ریحان غنی، پروفیسر عبدالواحد انصاری، پروفیسر صفدر امام قادری، پروفیسر جاوید حیات، ڈاکٹر افضل حسین، ڈاکٹر شہاب الدین، ڈاکٹر افشاں بانو، ڈاکٹر صبوحی عشرت، ڈاکٹر اسنیہ لتا، ڈاکٹر شویتا کماری، ڈاکٹر سدھارتھ، ڈاکٹر اویناش، ڈاکٹر سمن کماری، ڈاکٹر نقی احمد جان اور ڈاکٹر انوار الہدیٰ، کے علاوہ سامعین کی بڑی تعداد موجود رہی۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 25 مارچ 2026

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

جن کتابوں نے متاثر کیا

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجئے۔

زبان، ادب اور تعلیم سے متعلق خبریں

ماہنامہ اردو دنیا میں 'خبر نامہ' کے تحت علمی، ادبی، ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ ان خبروں سے ہماری ادبی و ثقافتی سرگرمیوں، تنوع اور زبان و ادب کی سمت و رفتار کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ خبر نامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ کوشش کے باوجود بہت سی اہم خبریں ہم تک موصول ہونے سے رہ جاتی ہیں۔ اس لیے منتظمین سے گزارش ہے کہ وہ اہم علمی، ادبی و ثقافتی تقریبات اور وفیات سے متعلق خبریں درج ذیل ای۔ میل editor@ncpul.in | urdudunyancpul@yahoo.co.in پر ارسال کرنے کی زحمت کریں۔ (ادارہ)

دہلی

ایم این این ڈیجیٹل انڈیا پروگرام کا انعقاد

نئی دہلی: ایم این این۔ ڈیجیٹل انڈیا پروگرام کامیابی کے ساتھ ڈیجیٹل شمولیت کو آگے بڑھا رہا ہے اور قابل رسائی اور قابل استطاعت پر حکمت عملی کے ذریعے ملک کے

ڈیجیٹل پبلک انفراسٹرکچر (DPI) کو مضبوط بنا رہا ہے۔ الیکٹرانکس اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے مرکزی وزیر اشونی ویشنو نے 11 مارچ کو لوک سبھا میں کہا اس پہل نے انٹرنیٹ تک رسائی کو بڑھا کر اور مضبوط ڈیجیٹل حل فراہم کر کے ڈیجیٹل تقسیم کو ختم کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وزیر اعظم شری نریندر مودی کی قیادت میں، ڈیجیٹل انڈیا زیادہ رسائی، قابل برداشت اور مضبوط ڈیجیٹل پبلک انفراسٹرکچر کے ذریعے ڈیجیٹل شمولیت کو آگے بڑھا رہا ہے۔ وزیر نے کہا کہ اس پروگرام کے ذریعے، ہندوستان نے تین جہتی حکمت عملی کا استعمال کرتے ہوئے ڈیجیٹل تقسیم کو ختم کیا ہے۔ انٹرنیٹ تک رسائی میں اضافہ، انٹرنیٹ کو سستا بنانا اور ڈیجیٹل عوامی بنیادی ڈھانچہ فراہم کرنا۔ انھوں نے ایوان کو مطلع کیا کہ ہندوستان کے ٹیلی کام ٹیرف عالمی اوسط سے 25 گنا کم رہتے ہیں، یہ ایک کارنامہ ہے جو اس شعبے میں شفافیت سے ممکن ہوا ہے۔ وزیر نے اس بات پر روشنی ڈالی کہ ڈی پی آئی کے کامیاب نفاذ کی وجہ سے ملک اب بڑی معیشتوں میں منفرد مقام رکھتا ہے۔ وزیر نے نوٹ کیا کہ آج تک 43.1 بلین سے زیادہ آدھار نمبر بنائے جا چکے ہیں، جو ایک عالمگیر ڈیجیٹل شناخت فراہم کرتے ہیں جو فلاحی اسکیموں تک رسائی کے قابل بناتا ہے۔ یہ بنیادی ڈھانچہ 56 وزارتوں میں 328 اسکیموں کے لیے آدھار سے منسلک براہ راست فائدہ کی منتقلی کی سہولت فراہم کرتا ہے، جو براہ راست بینک کھاتوں میں نقد فوائد منتقل کرتا ہے۔ یہ متعدد دستاویزات کے ساتھ کیا گیا ہے اور اس نے نقلی یا جعلی فائدہ اٹھانے والوں کو ختم کر دیا ہے۔ صرف مغربی بنگال میں ہی 67.10 کروڑ سے زیادہ آدھار آئی ڈی تیار کیے گئے ہیں۔ ڈیجیٹل ادائیگیوں کے حوالے سے، یونیفائیڈ پیمنٹس انٹرفیس (UPI) اب 460 ملین صارفین اور 5.6 کروڑ تاجروں کی خدمت کرتا ہے۔ یہ پلیٹ فارم 685 بینکوں کو جوڑتا ہے اور ہندوستان کی 81 فیصد ڈیجیٹل ادائیگیوں کو طاقت دیتا ہے، جو عالمی ریئل ٹائم ڈیجیٹل لین دین کا تقریباً 49 فیصد ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 12 مارچ 2026

خواتین اور بچوں کے خلاف آن لائن جرائم

نئی دہلی: مرکزی وزارت داخلہ کے سکریٹری گووند موہن نے کہا ہے کہ حکومت خواتین اور بچوں کے لیے محفوظ اور باوقار ڈیجیٹل ماحول یقینی بنانے کے لیے پرعزم ہے۔ انھوں نے 13 مارچ کو یہاں خواتین اور بچوں کے خلاف آن لائن جرائم کے موضوع پر منعقدہ قومی مکالمے کا افتتاح کیا۔ یہ پروگرام ہندوستانی سائبر کرائم کوآرڈی نیشن سینٹر کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا، جس کا مقصد مختلف اہم فریقوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر خواتین اور بچوں کے خلاف آن لائن جرائم کو روکنے اور ان سے مؤثر طریقے سے نمٹنے کے لیے مربوط نظام کو مضبوط بنانے پر غور و خوض کرنا تھا۔ انھوں نے کہا کہ حکومت ملک بھر میں خواتین اور بچوں کے لیے محفوظ، باحفاظت اور باوقار ڈیجیٹل ماحول فراہم کرنے کے لیے ادارہ جاتی نظام کو مضبوط بنانے اور تمام متعلقہ فریقوں کے درمیان تعاون کو فروغ دینے کے لیے پرعزم ہے۔ مسٹر موہن نے تیزی سے ڈیجیٹل ہوتے ماحول میں آن لائن جرائم سے پیدا ہونے والے بڑھتے ہوئے چیلنجز پر روشنی ڈالی اور ان جرائم سے موثر طور پر نمٹنے کے لیے ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کی سطح پر ادارہ جاتی صلاحیتوں کو مضبوط بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کو مضبوط اور خصوصی یونٹس قائم کرنے چاہیے اور مربوط ردعمل کا نظام تیار کرنا چاہیے۔ گووند موہن نے تمام ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کی قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کو ہدایت دی ہے کہ وہ خواتین اور بچوں کے خلاف آن لائن جرائم کے معاملات میں فوری اور مربوط ردعمل کو یقینی بنائیں۔ انھوں نے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ثالث اداروں سے اپیل کی کہ وہ انفارمیشن ٹیکنالوجی ایکٹ اور اس سے متعلق قواعد کی دفعات پر سختی سے عمل کریں اور تمام متعلقہ فریقوں سے محفوظ اور باحفاظت ڈیجیٹل ماحول کو یقینی بنانے کے لیے مشترکہ طور پر کام کرنے کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ قومی مکالمہ علم کے تبادلے، بہترین طریقہ کار کو شیئر کرنے اور ڈیجیٹل ماحول میں آن لائن جرائم

سے پیدا ہونے والے نئے چیلنجز سے نمٹنے کے لیے ایک مربوط قومی حکمت عملی تیار کرنے کے لیے اجتماعی غور وفکر کا اہم پلیٹ فارم فراہم کرتا ہے۔ افتتاحی تقریب کے موقعے پر ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے لیے خواتین اور بچوں کے خلاف آن لائن جرائم کے حوالے سے ماسٹر ٹرینرز انڈکشن پروگرام کا بھی آغاز کیا گیا۔ اس پروگرام کا مقصد تربیت یافتہ افسران کا ایک قومی گروپ تیار کرنا ہے جو اپنے اپنے ریاستوں میں صلاحیت سازی کے اقدامات کی قیادت کریں گے۔ اس پروگرام کے تحت منتخب افسران کو ابھرتے ہوئے سائبر خطرات، خاص طور پر خواتین اور بچوں کو نشانہ بنانے والے جرائم سے نمٹنے کے لیے خصوصی معلومات، تفتیشی تکنیک اور بہترین عملی طریقوں سے لیس کیا جائے گا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 14 مارچ 2026

ہندوستانی تاریخ وثقافت کے عربی مصادر

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ عربی کے زیر اہتمام 24 تا 25 مارچ 2026 کو 'ہندوستانی تاریخ و ثقافت کے عربی مصادر' کے عنوان سے دوروزہ بین الاقوامی سمینار منعقد ہوا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ہیفا شاکری

نے کی۔ بعد ازاں صدر شعبہ عربی پروفیسر نسیم اختر نے استقبالیہ خطاب میں عربی مآخذ کی تاریخی وتہذیبی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستانی تاریخ کے مستند مطالعے کے لیے عربی مصادر ناگزیر حیثیت رکھتے ہیں۔ فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز کی کارگزار ڈین پروفیسر ڈاکٹر نشاط منظر نے سمینار کے انعقاد پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اس موضوع کے وسیع تحقیقی امکانات پر روشنی ڈالی۔ کلیدی خطاب پروفیسر ثناء اللہ ندوی نے پیش کیا جس میں انھوں نے عربی مصادر کے تاریخی، تہذیبی اور علمی پہلوؤں کا جامع جائزہ لیا اور اس میدان میں مزید تحقیق کی ضرورت پر زور دیا۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر زبیر احمد فاروقی نے البیرونی اور المسعودی جیسے مورخین کے حوالے سے تقابلی مطالعہ پیش کرتے ہوئے موضوع کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا۔

اس موقعے پر چار اہم کتابوں کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ کتابوں کا تعارف ڈاکٹر محمد عمیر نے پیش کیا جب کہ افتتاحی اجلاس کے اختتام پر پروفیسر فوزان احمد نے مہمانوں اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ سمینار کے دوران افتتاحی واختتامی اجلاس کے علاوہ مجموعی طور پر 7 علمی نشستیں منعقد ہوئیں، جن میں تقریباً 55 مقالات پیش کیے گئے۔ مقالہ نگاران نے ملک کے مختلف حصوں بشمول بنگال، کیرلہ، ممبئی، اتر پردیش اور دہلی کے علاوہ مصر، الجزائر، لیبیا، سعودی عرب اور قطر سے بھی آن لائن شرکت کی۔ اختتامی اجلاس ایرانولوجی ہال میں منعقد ہوا، جس کی صدارت پروفیسر شفیق احمد خان نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر فضل اللہ شریف، ڈاکٹر محمد اجمل اور کلیم صفات اصلاحی نے اپنے تاثرات پیش کیے، جب کہ مفصل رپورٹ ڈاکٹر صہیب عالم نے پیش کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن نے انجام دیے اور صدر شعبۂ عربی پروفیسر نسیم اختر کے اختتامی کلمات کے سمینار اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 مارچ 2026

ابوسعید ابوالخیر کی صوفیانہ تعلیمات اور ہندوستان میں ان کی مقبولیت

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی کے ایرانولوجی ہال میں 'ابوسعید ابوالخیر کی صوفیانہ تعلیمات اور ہندوستان میں ان کی مقبولیت' کے عنوان سے توسیعی خطبے کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس خطبے کی مقرر خاص پروفیسر نشاط منظر، شعبہ تاریخ وثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ تھیں، جب کہ صدر شعبہ پروفیسر سید کلیم اصغر نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ نظامت ڈاکٹر زہرہ خاتون نے کی۔ پروفیسر نشاط نے موضوع کی مناسبت سے ابوسعید ابوالخیر کی صوفیانہ تعلیمات، ان کے انسان دوستی کا درس اور ہندوستان میں ان کی مقبولیت کے اسباب مختلف تصوف کی کتابوں کے حوالوں، جن میں بالخصوص شیخ ہجویری کی کشف المحجوب اور حضرت نظام الدین اولیا کے ملفوظات (فوائد الفواد) جسے امیر حسن سنجری نے مرتب کیا تھا، سے پیش کیے۔ انھوں نے ابوسعید کی ابتدائی زندگی اور شیخ ہجویری سے ان کی ملاقات کا ذکر بھی مختلف حوالوں جیسے سیر الاولیا، جوامع الحکایات اور اسرار التوحید وغیرہ کے توسط سے پیش کیا۔ انھوں نے اسرار التوحید فی مقامات ابوسعید کا ذکر بھی کیا جو ان کی وفات کے تقریباً 100 سال بعد ان کے پوتے ابن منور نے ترتیب دی تھی، اس موقعے پر ڈاکٹر محسن علی نے خانقاہوں میں لنگر سے متعلق روایات پر اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ یہ روایات ہمیں سکھوں کے یہاں بھی بحسن وخوبی نظر آتی ہے۔

پروگرام کے صدر پروفیسر سید کلیم اصغر نے ابوسعید کی فارسی رباعیات، نیز تصوف کیا ہے اور صوفیا کی تعلیمات کا بنیادی مقصد کیا ہوتا ہے اس پر بالتفصیل روشنی ڈالتے ہوئے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا، اس موقعے پر ڈاکٹر زہرہ خاتون کی تازہ تصنیف 'ہند وایران کے لسانی رشتے' (مقالات کا مجموعہ) کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ اس پروگرام میں مختلف یونیورسٹیوں اور شعبوں سے کثیر تعداد میں طلبا وطالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 31 مارچ 2026

روایت کی بازگشت اور تبدیلی کی آوازیں: عرب اسلامی ثقافت کے مستقبل کی نقشہ سازی

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ہندوستان-عرب ثقافتی مرکز کے زیر اہتمام 'روایت کی بازگشت اور تبدیلی کی آوازیں: عرب اسلامی ثقافت کے مستقبل کی نقشہ سازی' کے موضوع پر ایک روزہ قومی کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں 25 سے زائد اسکالرز، ماہرین تعلیم اور محققین نے شرکت کی۔ افتتاحی اجلاس میں جامعہ کے رجسٹرار پروفیسر مہتاب عالم رضوی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی، جب کہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے سینٹر فار عربی وافریقی مطالعات کے سابق چیئرپرسن پروفیسر مجیب الرحمٰن نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ اس موقعے پر سینئر عرب صحافی ڈاکٹر وائل عواد مہمان مقرر اور نئی دہلی میں جمہوریہ عراق کے سفید عدی حاتم محمد مہمانِ اعزازی کی حیثیت سے موجود رہے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر ہمایوں اختر نظمی ڈائرکٹر سینٹر فار ویسٹ ایشین اسٹڈیز نے کی۔ مرکز کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد آفتاب احمد نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے کانفرنس کے موضوع کا تعارف کرایا اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے جامعہ کے وائس چانسلر پروفیسر مظہر آصف اور رجسٹرار پروفیسر مہتاب عالم رضوی کا

شکریہ بھی ادا کیا۔ اپنے کلیدی خطاب میں پروفیسر مجیب الرحمٰن نے کہا کہ عرب اسلامی ثقافت تاریخی طور پر متحرک، ہمہ گیر اور علم پر مبنی رہی ہے، اور موجودہ چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے کلاسیکی روایات کی نئی تعبیر ضروری ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر مہتاب عالم رضوی نے ہندوستان اور عرب دنیا کے درمیان جغرافیائی و سیاسی تعلقات پر روشنی ڈالی۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر ہمایوں اختر نظمی نے کہا کہ ہندوستان اور عرب دنیا کے درمیان تعلقات تاریخی بنیادوں پر قائم ہیں، جو موجودہ دور میں ایک مضبوط اور ابھرتی ہوئی شراکت داری کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔ تقریب کے اختتام پر ڈاکٹر ذوالفقار علی انصاری نے شکریہ کے کلمات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 مارچ 2026

قرۃ العین حیدر یادگاری خطبہ

نئی دھلی: پریم چند آرکائیوز اینڈ لٹریری سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام قرۃ العین حیدر سے منسوب پہلے یادگاری خطبہ کا انعقاد 10 مارچ 2026 کو کیا گیا۔ اس

خطبے کو یادگار بنانے میں 2 اہم پہلو نمایاں ہیں۔ پہلا خود وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر مظہر آصف نے یہ خطبہ ارشاد فرمایا، دوسرا کہ اس کا عنوان 'رومی اور کبیر: ایک تقابلی مطالعہ' تھا۔ اس موقعے پر دانشوروں اور اسکالرز کو خطاب کرتے ہوئے پروفیسر مظہر آصف نے کہا کہ صوفیوں اور سنتوں کی مشترک شناخت دنیا بیزاری، انسانیت اور محبت ہے۔ چنانچہ رومی اور کبیر کے درمیان بظاہر بعد المشرقین کے باوجود گہری مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ رومی کا تعلق ایک تہذیب یافتہ، تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ ماحول سے ہے، جبکہ اس کے برعکس کبیر کا رشتہ ایک ان پڑھ، غیر متمدن اور دیہی زندگی سے ہے۔ لیکن دونوں کا وجدان، الوہی انوار سے وابستگی، حیات و کائنات سے متعلق درویشانہ اور قلندرانہ رویہ، نفسانی خواہشات، انا، تکبر اور دنیوی آلائشوں سے بیزاری، رومی اور کبیر کو ایک ہی منبع نور سے منسلک کر دیتی ہے۔

اس یادگاری خطبہ کی صدارت کے فرائض رجسٹرار جامعہ ملیہ اسلامیہ اور بین الاقوامی تعلقات پر بسیط نظر رکھنے والے پروفیسر محمد مہتاب عالم رضوی نے انجام دیے۔ اس حوالے سے ان کی صدارت کی معنی خیزی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے کہ رومی اور کبیر بھی دراصل 2 تہذیبوں اور 2 اقوام کے مابین نقطۂ اتصال ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے صدارتی کلمات میں پروفیسر مظہر آصف کی عالمانہ بصیرتوں کی تحسین کرتے ہوئے کہا کہ رومی اور کبیر دونوں کے یہاں امن، محبت اور اعلیٰ روحانی اقدار سے وابستگی اپنی انتہا پر ہے۔ رومی اور کبیر دراصل انانیت اور نفسانی خواہشات کو ختم کر دینے کا نام ہیں۔ اس باوقار جلسے کو خطاب کرتے ہوئے مہمان اعزازی اور ڈین فیکلٹی برائے انسانی علوم و السنہ پروفیسر اقتدار محمد خاں نے کہا کہ پروفیسر مظہر آصف کا قرآن سے گہرا شغف ان کے والد کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ ان کی دلچسپیوں کا دائرہ جتنی زبانوں اور علوم و فنون تک پھیلا ہوا ہے، ایسی شخصیات بہت کم ہی ہوتی ہیں۔ آج کے دور میں رومی اور کبیر کی تعلیمات کا آموختہ بہت ضروری ہے۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے پریم چند آرکائیوز اینڈ لٹریری سینٹر کے اعزازی ڈائریکٹر پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ اس سینٹر کو وائس چانسلر اور رجسٹرار کا بے پایاں التفات حاصل ہے اور انھیں کی سرپرستی کے سبب ہمیں اس سال 2 یادگاری خطبات کی داغ بیل ڈالنے کا موقع ملا۔ انھوں نے مہمانان کا خیر مقدم کرتے ہوئے انتظامیہ سے مطالبہ کیا کہ اس سینٹر کے شایانِ شان ایک آڈیٹوریم کی سخت ضرورت ہے۔

اس موقعے پر پروفیسر شہزاد انجم نے وائس چانسلر کی خدمت میں قرۃ العین حیدر کا شہرۂ آفاق ناول 'آگ کا دریا' ہدیہ کرتے ہوئے ان کی شال پوشی کی۔ ڈاکٹر سید محمد عامر نے رجسٹرار کو یہ تحفے نذر کیے۔ سینٹر سے وابستہ اسنگد ھارائے نے ڈین فیکلٹی برائے انسانی علوم و السنہ کا تحائف سے استقبال کیا۔ قرۃ العین حیدر یادگاری خطبے کی مناسبت سے ڈاکٹر ایس ایم عامر نے قرۃ العین حیدر کا ایک مختصر اور جامع تعارف پیش کیا، جبکہ مہمان مقرر پروفیسر مظہر آصف کے مفصل تعارف سے اسنگد ھارائے نے حاضرین کو روشناس کرایا۔ اس موقر خطبے کی نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے شعبۂ اردو سے وابستہ ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر خالد مبشر نے کہا کہ آج کا دن پریم چند آرکائیوز کی تاریخ میں نہایت یادگار ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سربراہ اعلیٰ نے بہ نفس نفیس یہ باوقار اور علمی خطبہ ارشاد فرمایا۔ پروگرام کا اختتام شردھا شنکر کے اظہار تشکر پر ہوا۔ اس موقعے پر پروفیسر خالد محمود، پروفیسر تسنیم فاطمہ، پروفیسر کوثر مظہری، پروفیسر حبیب اللہ، پروفیسر احمد محفوظ، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی اور ڈاکٹر شکیل اختر کے علاوہ بڑی تعداد میں جامعہ کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ و طالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 13 مارچ 2026

اتر پردیش

وکست بھارت 2047@ قانون و پالیسی کے تناظر میں امبیڈکر کا پائیداری اور جامع ترقی کا وژن

علی گڑھ: ڈاکٹر امبیڈکر چیئر آف لیگل اسٹڈیز اینڈ ریسرچ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے زیر اہتمام 'وکست بھارت 2047@ قانون و پالیسی کے تناظر

میں امبیڈکر کا پائیداری اور جامع ترقی کا وژن' عنوان پر ایک روزہ قومی سمینار منعقد کیا گیا، جس میں مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین، اسکالرز اور پالیسی مفکرین نے اپنے خیالات ظاہر کیے اور شرکا کو مستفید کیا۔ پروگرام کا آغاز پروفیسر ظفر احمد خان، چیئر پروفیسر، امبیڈکر چیئر کے استقبالیہ خطاب سے ہوا۔ انھوں نے ڈاکٹر بی آر امبیڈکر کے افکار کی موجودہ دور میں اہمیت کو اجاگر کیا۔ انھوں نے کہا کہ امبیڈکر کا وژن ہمیں ایک منصفانہ اور مساوی معاشرے کی تشکیل میں رہنمائی فراہم کرتا ہے اور یہ آج بھی ایک جامع اور پائیدار قومی ڈھانچے کی بنیاد ہے۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے شعبہ سیاسیات کے چیئرمین پروفیسر محمد نفیس انصاری نے 2047 تک ترقی یافتہ ہندوستان (وکست بھارت) کے اہداف کے حصول میں قانون، حکمرانی اور سماجی انصاف کے باہمی

تعلق پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ پائیدار ترقی اسی وقت ممکن ہے جب اس کی بنیاد شمولیت پر ہو، تاکہ ترقی کے ثمرات معاشرے کے ہر طبقے تک پہنچ سکیں۔ مہمانِ خصوصی، اے ایم یو رجسٹرار پروفیسر عاصم ظفر نے پالیسی سازی اور قومی تعمیر میں علمی مباحث کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ جامعات بصیرت افروز خیالات کو عملی پالیسیوں میں ڈھالنے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں، جو ایک جامع اور ترقی یافتہ ہندوستان کی تشکیل کے لیے ناگزیر ہے۔ ہائبرڈ طرز پر منعقدہ اس سمینار میں پانچ تکنیکی نشستیں شامل تھیں، جنھوں نے فکری تبادلے کے لیے ایک متحرک پلیٹ فارم فراہم کیا۔ کانفرنس میں مختلف شعبہ جات جیسے کہ قانون، سماجی علوم اور بین الاقوامی تعلقات سے تعلق رکھنے والے شرکا نے مجموعی طور پر 41 تحقیقی مقالات پیش کیے، جو امبیڈکر کے وژن کی کثیر جہتی نوعیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ نشستوں کی نظامت ڈاکٹر محمد ناصر، ڈاکٹر صائم فاروقی اور ڈاکٹر سید محمد یاور نے کی۔ سمینار کے دوران پائیدار اور جامع ترقی کے حصول کے لیے درکار عصری چیلنجوں اور پالیسی فریم ورک پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ ماہرین نے سماجی مساوات، قانونی اصلاحات اور ترقی کے عالمی تناظر جیسے موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تقریب کا اختتام علمی استفادہ اور باہمی تعاون کے عزم کے ساتھ ہوا جس نے قومی اہمیت کے موضوعات پر تنقیدی مکالمے اور تحقیق کے فروغ کے تئیں اے ایم یو کے عزم کو مزید مستحکم کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 3 اپریل 2026

اردو رباعی کا عصری منظر نامہ

لکھنؤ: اردو رباعی کا یہ بین الاقوامی سمینار اردو ادب کی سرگرمیوں میں اس لیے یاد کیا جائے گا کہ 'اردو رباعی' کے حوالے سے اردو دنیا کا یہ پہلا سمینار ہے جس میں

رباعی جیسی محتشم بالشان صنف پر فکر و فن کے حوالے سے ملک و بیرون ملک کے ادیب اور دانشوران شرکت کر رہے ہیں۔ مذکورہ باتیں پروفیسر عباس رضا نیر صدر شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ نے فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش لکھنؤ اور شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ کے اشتراک سے منعقد ہونے والے دو روزہ بین الاقوامی سمینار بعنوان 'اردو رباعی کا عصری منظر نامہ' بمقام اردو اکیڈمی ہال کے افتتاحی اجلاس کی نظامت کرتے ہوئے کہی۔ اس دو روزہ بین الاقوامی سمینار کا افتتاحی اجلاس 24 اپریل کو اردو اکیڈمی ہال لکھنؤ میں منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر صغیر افراہیم سابق صدر شعبہ اردو علی گڑھ یونیورسٹی، علی گڑھ نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر شہاب عنایت ملک صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی اور مہمان اعزازی پروفیسر شفیق احمد اشرفی سابق صدر شعبہ اردو خواجہ معین لدین چشتی لینگویج یونیورسٹی لکھنؤ رہے۔ پروفیسر خواجہ محمد اکرام نے کلیدی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ رباعی ایک مشکل صنف ہے کیونکہ اختصار اور اوزان کی پابندی کے ساتھ کسی ایک موضوع پر ادبی جمالیات کے ساتھ کسی خیال کو پیش کرنا فنی فکری صلاحیتوں کا متقاضی ہے۔ اس لیے اس صنف کے شعرا کم ہیں مگر وقت کے اعتبار سے اس صنف کی بڑی اہمیت ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ بلاشبہ فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی اور صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ پروفیسر عباس رضا نیر کا یہ عمل قابل فخر اور قابل ستائش ہے کہ آپ نے مشکل ترین صنف رباعی پر یہ دو روزہ سمینار منعقد کرانے کا فریضہ انجام دیا۔ اس افتتاحی سیشن کے دانشوران ادب نے جس طرح اس پر گفتگو کی وہ قابل رشک ہے اور جو مثالیں نئی نسل کے تعلق سے دیں اس سے اور بھی تقویت بڑھتی ہے کہ اردو رباعی کا مستقبل روشن ہے۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک نے کہا کہ موجودہ دور میں بہت کم شعرا ہیں جو اس مشکل صنف میں طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ پروفیسر شفیق احمد اشرفی نے اپنے خطاب میں کہا کہ رباعی صنفی اعتبار سے ایک مختصر اور قدیم صنف سخن ہے جو مشق کا تقاضہ کرتی ہے۔ افتتاحی اجلاس کے آخر میں ڈاکٹر جان نثار عالم نے مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔ چائے کے وقفے کے بعد پہلا تکنیکی اجلاس شروع ہوا جس کی صدارت پروفیسر شہاب عنایت ملک اور پروفیسر ثوبان سعید نے کی اور پروفیسر دبیر احمد، پروفیسر عابد حسین حیدری، سنجے مشرا شوق، فاروق جائسی اور ڈاکٹر ذیشان حیدر نے اردو رباعی کے عصری منظر نامے کے حوالے سے مختلف عنوانات پر مقالات پیش کیے۔ ظہرانہ کے وقفہ کے بعد دوسرا تکنیکی اجلاس ہوا جس کی صدارت پروفیسر صغیر افراہیم اور پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کی اور پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی، ساجد خیر آبادی، ڈاکٹر احتشام احمد اور ڈاکٹر مجتبیٰ حسن صدیقی نے مقالے پڑھے۔ تیسرے تکنیکی اجلاس ڈاکٹر عمیر منظر اور ڈاکٹر جان نثار عالم کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں ریسرچ اسکالر سید غلام عباس ہلوری، صائمہ انصاری، تحسین، محمد سہیل نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔

شام میں 'مشاعرہ رباعیات' کی محفل سجی جس کی صدارت فاروق جائسی نے کی اور نظامت کے فرائض شکیل گیاوی نے انجام دیے۔ شعرا کی حیثیت سے سنجے مشرا شوق، بے خود لکھنوی، ناز پرتاپ گڑھی، پروفیسر عباس رضا نیر، ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی، معید رہبر، اعجاز زیدی، ساجد خیر آبادی، ڈاکٹر عمیر منظر، ڈاکٹر ذیشان حیدر، ڈاکٹر مجتبیٰ حسن صدیقی، ابوشہر وغیرہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 25 مارچ 2026

محسن کاکوروی کی شاہکار نعت مدح خیر المرسلین

میرٹھ: محسن کاکوروی ایک فطری شاعر تھے۔ محض نو سال کی عمر میں آپ نے شاعری شروع کر دی تھی۔ آپ کے تقریباً ڈیڑھ ہزار اشعار ملتے ہیں لیکن کمال یہ کیا کہ جس کلام کو نعت کی شکل میں صنف کا درجہ دلایا اس کا نام محسن کاکوروی ہے۔ آپ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ قطعات زیادہ تر فارسی میں ہی ہیں۔ یہ الفاظ تھے بین الاقوامی شہرت یافتہ محقق و ناقد ڈاکٹر تقی عابدی کے جو شعبۂ اردو اور ایوسا کے مشترکہ اہتمام میں منعقد 'محسن کاکوروی کی شاہکار نعت مدح خیر المرسلین کی تشریح و تجزیہ: سمت کاشی سے چلا...' موضوع پر خصوصی مقرر کی حیثیت سے اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا

کہ قصیدہ 'مدح خیرالمرسلین' ایک کلاسیکی قصیدہ ہے جس میں تشبیب، گریز، مدح اور دعا ہے۔ جب یہ تحریر ہوا تو پتہ چلا کہ اس میں سومناتِ خیالی ہے۔ اس میں مقامی اور ہندو مذہب کے تیوہاروں اور داستانوں کا ذکر بھی ہے۔ جب یہ نعتیہ قصیدہ لکھا گیا تو لوگوں کو تعجب ہوا۔ شاعر کے پاس تصوفانہ خصوصیات ہیں۔ حرف کو استعارہ بنانا ان سب سے بڑا ہنر ہے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد وافسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی اور صدارت کے فرائض معروف محقق و ناقد پروفیسر صغیر افراہم نے انجام دیے۔ مہمانان کے بطور ان کی شرکت ہوئی۔ جب کہ مقررین کے بطور لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین اور دہلی سے معروف شاعر چندر بھان خیال موجود رہے اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ محسن کاکوروی کا کلام بہت سی یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔ اس لیے محسن کاکوروی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ قصیدہ کے حوالے سے ہم ان نکات کو سمجھ پائے جن سے ہمارے طلبا بہت دور ہیں۔ لوگ کلاسیکل لٹریچر سے واقف نہیں ہیں۔ ہمیں کلاسیکل لٹریچر سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ ایسی ہی گفتگو داستان، ناول، افسانوں، رباعی ومثنویوں پر بھی ہونی چاہیے۔ ہم آیوسا کے ذریعے ان اصناف کے تعلق سے بھی جانیں گے۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ڈاکٹر تقی عابدی صاحب نے قصیدہ کے پس منظر اور پیش منظر دونوں کو فنی خوبیوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 5 اپریل 2026

آنند نرائن ملا-فن اور شخصیت

لکھنؤ: بیسویں صدی کی ابتدا میں جن بلند پایہ شاعروں نے چمن اردو کی آبیاری کی ہے ان میں آنند نرائن ملا کا نام سرفہرست ہے۔ وہ شاعر بھی تھے اور مصلح ادب اور قوم بھی، آنند نرائن ملا دبستان لکھنؤ کی آبرو نہیں بلکہ دبستان اردو کی آبرو ہیں۔ وہ آخری وقت تک اردو کے گیسو سنوارتے رہے۔ اردو شاعری میں ان کا طرز ادا ان کے ذہن وفکر کا غماز ہے۔ ان کی شاعری نئے تقاضوں سے بہرہ ور ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار اودھ ویلفیئر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام واتر پردیش اردو اکادمی کے مالی تعاون سے منعقد سمینار 'آنند نرائن ملا-فن اور شخصیت' یوپی پریس کلب میں مہمانِ خصوصی ڈاکٹر احتشام احمد خان نے کیا۔ سمینار کی نظامت ڈاکٹر سیما صدیقی نے کی۔ اس موقعے پر انھوں نے مہمانان اور مقالہ نگاران کا تعارف بھی کرایا۔ سمینار کے آغاز میں سمینار کی کنوینر اور اودھ ویلفیئر فاؤنڈیشن کی صدر صبیحہ سلطانہ نے افتتاحی کلمات ادا کیے اور سوسائٹی کے اغراض ومقاصد بیان کیے۔ صدر جلسہ فدا حسین انصاری (سابق چیئرمین یوپی ہائیر ایجوکیشن سروس کمیشن) نے صدارتی خطاب میں کہا کہ ملا کے نزدیک زندگی فقط انسان کی آسودگی اور لذت پرستی نہیں ہے۔ ان کے یہاں تمام انسانوں کے مسائل اور پریشانی کو اپنی خوشیوں پر مقدم رکھنے کا نام زندگی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ملا کی شاعرانہ عظمت ان کی دردمندانہ شاعری ہے۔ مہمان ذی وقار انیس منصوری (سابق ریاستی وزیر) نے کہا ملا کے یہاں سماجی صورت حال اور وطن عزیز کا درد اتنا شدید ہے کہ اکثر غزلوں میں اس کا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ مہمانِ اعزازی حاجی فہیم صدیقی (صوبائی صدر انڈین نیشنل لیگ) نے کہا کہ ملا کے تصور انسانیت کا سرچشمہ کوئی ایک مذہب یا اخلاقی ضابطہ یا فلسفہ نہیں اور سیاسی ومعاشی نظریہ بھی نہیں ہے۔ ان کی فکر ان سب سے اپنی ذہنی غذا ضرور حاصل کرتی ہے۔ ان کا تصور انسانیت دراصل ایک فنکار کا تخلیقی تصور ہے جس کے نزدیک زندگی ایک جہد مسلسل ہے۔ سمینار کے مقالہ نگاران ڈاکٹر سید محمد صبیح ندوی، ڈاکٹر سیما صدیقی، ضیاء اللہ صدیقی، نکہت زہرا اور ڈاکٹر ارشاد بیاروی نے کہا کہ ملا کا اپنی نظر اور اپنی راہ پر اصرار کرنا اور جرأت بے باکی سے اظہار خیال کرتے رہنا ایسی دولت ہے جسے آنے والی نسلیں کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیں گی کیونکہ شاعری میں روشنی اور عظمت اپنے ذہن سے سوچنے اور ضمیر کی آواز سننے ہی سے آتی ہے اور ملا نے اسی کی راہ دکھائی ہے۔ کلمات تشکر صبیحہ سلطانہ اور ان کی صاحبزادیوں نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 مارچ 2026

لینگویج یونیورسٹی میں متعدد اہم تحقیقی و تعلیمی منصوبوں کو منظوری

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی میں علمی وتحقیقی سرگرمیوں کو ایک نئی جہت اس وقت حاصل ہوئی جب اتر پردیش محکمۂ اعلیٰ تعلیم نے ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ اسکیم کے تحت مختلف شعبہ جات کے متعدد اہم تحقیقی منصوبوں کو منظوری عطا کی۔ ان میں شعبۂ فارسی کے انچارج ڈاکٹر عارف عباس کا پروجیکٹ سینٹر آف ایکسیلینس کے تحت 'رامائن کے فارسی تراجم: ایک تنقیدی جائزہ' کے موضوع پر دو لاکھ اسی ہزار روپے کی مالیت کے ساتھ منظور کیا گیا۔ ڈاکٹر عارف عباس کے اس تحقیقی منصوبے کا بنیادی مقصد فارسی زبان میں رامائن کے مختلف تراجم کا تنقیدی، توضیحی اور تقابلی مطالعہ کرنا ہے۔ اس کے تحت یہ دیکھا جائے گا کہ ہندوستان کی اس عظیم اور مقدس رزمیہ روایت کو فارسی مترجمین اور اہل علم نے کس زاویے سے سمجھا، کن اسالیب میں منتقل کیا اور اپنے تہذیبی وادبی پس منظر میں کس طرح جذب کیا۔ اس تحقیق کا ایک نہایت اہم پہلو ہندوستان اور ایران کے درمیان صدیوں سے قائم لسانی، ادبی، علمی اور ثقافتی روابط کو نئی روشنی میں پیش کرنا بھی ہے۔ شعبۂ صحافت وابلاغ عامہ کے ڈاکٹر شچیندر شیکھر کو 'آیوشمان بھارت یوجنا کے تحت صحافتی ابلاغ میں امتیاز کے موضوع پر' جب کہ اسی شعبے کے ڈاکٹر کاظم رضوی کو 'سوچھ بھارت مشن کے تناظر میں میڈیا کا کردار' کے موضوع پر پروجیکٹ دیا گیا ہے۔ شعبۂ بزنس ایڈمنسٹریشن کے پروفیسر مشیر احمد کو 'معذور افراد کے لیے سرکاری اسکیموں کی افادیت بڑھانے کے اقدامات' کے موضوع پر تحقیقی منصوبہ دیا گیا ہے۔ اسی شعبے کے

پروفیسر سید حیدر علی کو 'قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے نفاذ میں بنیادی ڈھانچے اور تعلیمی چیلنجز' کے موضوع پر منصوبہ فراہم کیا گیا ہے۔ مزید برآں ڈاکٹر للنی مشرا، ڈاکٹر شویتا اگروال، ڈاکٹر ادھم سنگھ، ڈاکٹر تطہیر فاطمہ اور ڈاکٹر رضا عباس حیدری کو بھی مختلف سماجی، تعلیمی، معاشی اور تکنیکی موضوعات پر پروجیکٹوں کی منظوری دی گئی ہے۔ اس موقعے پر لینگویج یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اجے تنیجا نے تمام منتخب اساتذہ کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان تحقیقی منصوبوں سے سینٹر آف ایکسیلینس کے کام کو نئی رفتار ملے گی اور ان کے عملی نتائج براہ راست سماج تک پہنچ سکیں گے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ یہ منصوبے نہ صرف علمی امتیاز کو نئی بلندیوں تک لے جائیں گے بلکہ سماج کی مجموعی ترقی، بیداری، پالیسی سازی اور علمی اشتراک کے فروغ میں بھی نمایاں کردار ادا کریں گے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 1 اپریل 2026

ہندوستانی فلم اور اردو

میرٹھ: آج کے طالب علموں کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ فلموں سے اردو کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ زبان کسی کی جاگیر نہیں ہوتی۔ زبان کو کوئی بھی پڑھ، لکھ

سکتا ہے۔ اردو زبان کی بدولت ہی فلموں کو وقار عطا ہوا اور عوام میں بھی زبان مقبول ہوتی چلی گئی۔ اردو میں لکھے نغموں سے ہی بہت سے شعرا بھی کافی مقبول ہوئے۔ اردو کی کشش کا یہ حال ہے کہ خواہ لفظیات سمجھ میں نہ آئیں لیکن وہ اپنی جانب ضرور کھینچتی ہے۔ یہ الفاظ تھے معروف اسکالر پروفیسر عبداللہ امتیاز (صدر شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی) کے جو شعبۂ اردو اور اسماعیل نیشنل مہیلا پی جی کالج، میرٹھ کے مشترکہ پروگرام بعنوان 'ہندوستانی فلم اور اردو' میں شعبے کے پریم چند سمینار ہال میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ادا کر رہے تھے۔ پروگرام کی صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے انجام دیے۔ مہمانانِ خصوصی کے بطور پروفیسر عبداللہ امتیاز، پروفیسر ریاض احمد (صدر شعبۂ ایجوکیشن، مانو، نوح) اور پروفیسر انیتا راٹھی (پرنسپل، اسماعیل نیشنل مہیلا پی جی کالج، میرٹھ) نے شرکت کی اور مہمانانِ اعزازی کے بطور پروفیسر جمال احمد صدیقی (صدر شعبۂ لائبریری سائنس) اور پروفیسر دنیش کمار (صدر شعبۂ اکنامکس) نے شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر عفت ذکیہ، شکریہ ڈاکٹر شاداب علیم اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر آصف علی نے انجام دیے۔ سمینار کے پہلے اجلاس میں ڈاکٹر عفت ذکیہ نے 'ہندوستانی فلموں میں اردو غزل'، ڈاکٹر فرح ناز نے 'شکیل بدایونی کی فلمی خدمات'، نزہت اختر نے 'فلم نکاح کا تجزیاتی مطالعہ'، 'اطہر خان نے 'فلم پر اردو ثقافت کے اثرات'، ڈاکٹر چاندنی عباسی نے 'امراؤ جان: فلم اور فن' موضوعات پر اپنے پرمغز مقالات پیش کیے۔ مجلس صدارت پر پروفیسر ہما مسعود، پروفیسر ریاض احمد، آفاق احمد خاں، بھارت بھوشن شرما مجلس صدارت پر رونق افروز رہے۔ نظامت ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور شکریے کی رسم ڈاکٹر الکا وششٹھ نے ادا کی۔ سمینار کے دوسرے اجلاس میں، ڈاکٹر اسلم صدیقی نے 'فلمیں اور اردو'، 'فلموں میں کردار نگاری: ایک جائزہ'، ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے 'اردو گیتوں کے فروغ میں مجلّہ سیپ' کا کردار عنوانات سے اپنے مقالے پیش کیے۔ مجلس صدارت پروفیسر دیپا تیاگی (صدر شعبۂ ہندی، اسماعیل نیشنل پی جی کالج میرٹھ)، پروفیسر عبداللہ امتیاز، پروفیسر ہما مسعود، اور ڈاکٹر عفت ذکیہ رونق افروز رہیں، نظامت کے فرائض ڈاکٹر الکا وششٹھ نے انجام دیے۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر ریاض احمد نے کہا کہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے فروغ میں ہندوستانی فلموں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ بہت سی فلمیں ایسی ہیں جو سبھی کو یکساں طور پر متاثر کرتی ہیں۔ شعبۂ اردو مختلف موضوعات پر سمینار کا انعقاد کرتا رہتا ہے۔ بہت ہی فعال شعبہ ہے اور آج کا موضوع بھی اردو اور اس کے فروغ کے تعلق سے نہایت اہم ہے۔ پروفیسر دنیش کمار نے کہا کہ آج فلموں میں بدلاؤ نظر آرہا ہے جب کہ ہمارے وقت میں سنیما میں وہ ادب نظر آتا تھا جو کتابوں میں ہوتا تھا مگر آج کی فلموں میں ادب کی بہت کمی ہے۔ انسانیت، بھائی چارگی اور اتحاد کے تعلق سے جو چیزیں پہلے فلموں میں نظر آتی تھیں آج ان کا فقدان ہے۔ سماج کے تمام حصوں پر فلمیں اثر انداز ہوتی ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 26 مارچ 2026

قومی تعلیمی پالیسی 2020 پر آٹھ روزہ اورینٹیشن پروگرام

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ملاپورم سینٹر، کیرالہ میں قومی تعلیمی پالیسی (این ای پی) 2020 کے موضوع پر آٹھ روزہ اورینٹیشن پروگرام یو جی سی مالویہ مشن ٹیچر ٹریننگ سینٹر (ایم ایم ٹی ٹی سی)، اے ایم یو، علی گڑھ کی جانب سے منعقد کیا گیا ہے۔ 7 مارچ سے 16 مارچ تک جاری رہنے والے اس پروگرام کا مقصد اساتذہ کو قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے وژن، مقاصد اور اس کے نفاذ کی حکمت عملی سے روشناس کرانا ہے، جس میں جدید تدریسی طریقوں، تعلیمی ٹکنالوجی اور علمی قیادت پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ پروگرام کے کورس کوآرڈینیٹر اور شعبہ بزنس ایڈمنسٹریشن، اے ایم یو ملاپورم سینٹر کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر حمزہ وی کے نے استقبالیہ خطاب میں این ای پی 2020 کے انقلابی وژن کو اجاگر کرتے ہوئے اساتذہ کے لیے مسلسل پیشہ ورانہ تربیت کی ضرورت پر زور دیا۔ یو جی سی ایم ایم ٹی ٹی سی، اے ایم یو، علی گڑھ کی پروگرام ڈائرکٹر ڈاکٹر فائزہ عباسی نے بدلتے ہوئے اعلیٰ تعلیمی منظرنامے کے مطابق اساتذہ کو تیار کرنے میں تربیتی پروگراموں کی اہمیت پر روشنی ڈالی، جب کہ اے ایم یو ملاپورم سینٹر کے ڈائرکٹر پروفیسر ایم شاہ الحمید نے این ای پی 2020 کے مقاصد کے مطابق تعلیمی اداروں کے کردار پر زور دیتے ہوئے اختراع، کثیر شعبہ جاتی تعلیم اور تدریس و تحقیق میں ٹکنالوجی کے انضمام کی اہمیت بیان کی۔ پروگرام کے پہلے دن یو جی سی ایم ایم ٹی ٹی سی، سنت گاڈگے بابا امراوتی یونیورسٹی، امراوتی کے پروگرام ڈائرکٹر پروفیسر ایم عتیق نے تعلیمی ٹکنالوجی کے موضوع پر تکنیکی سیشن پیش کیے، جن میں انھوں نے اعلیٰ تعلیم میں تدریس و تعلیم کو موثر بنانے کے لیے ڈیجیٹل آلات اور ابھرتی

ہوئی ٹکنالوجی کے استعمال پر تفصیلی گفتگو کی۔ اس پروگرام کے دوران نصاب کی تیاری، علمی قیادت، پائیدار ترقی، تعلیم میں آئی سی ٹی، اسکل ڈیولپمنٹ، ہندوستانی تدریسی طریقے، تحقیق و ترقی، مصنوعی ذہانت اور شماریاتی تدریسی آلات، جامعہ تعلیم اور اعلیٰ تعلیم و سماج جیسے اہم موضوعات پر بھی سیشن منعقد کیے جائیں گے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 12 مارچ 2026

انیسویں صدی میں ہندوستان اور ایران میں فارسی زبان و ادب کے مروجہ رجحانات

علی گڑھ: مرکز تحقیقات فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے زیر اہتمام 'انیسویں صدی میں ہندوستان اور ایران میں فارسی زبان و ادب کے مروجہ رجحانات' موضوع پر دو روزہ بین الاقوامی سمینار کا افتتاحی اجلاس یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر پروفیسر محمد محسن خاں کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پروگرام کی ابتدا مرکز تحقیقات فارسی کے ڈائرکٹر پروفیسر محمد عثمان غنی کے خیر مقدمی کلمات سے ہوئی جس میں انھوں نے سمینار کے اغراض و مقاصد کا ذکر کیا اور انیسویں صدی عیسوی کے قیام اور درباری زبان کے علاوہ سرکار زبان کی حیثیت سے متروک ہونے کی وجہ پر بھی روشنی ڈالی، ساتھ ہی اس دور کے فارسی ادب بالخصوص شاعروں اور ادیبوں کے احوال و آثار کا بھی تذکرہ کیا۔ مرکز تحقیقات کی مشاور پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انیسویں صدی کے فارسی ادب نے ہندوستان میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ یہی وہ دور تھا جس میں ادیبوں اور شاعروں نے فارسی زبان و ادب کے ذریعہ دنیا بھر کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ برطانوی حکومت کے زیر اثر فارسی زبان کی سرکاری حیثیت باقی نہیں رہی لیکن اس کے باوجود شاعروں اور ادیبوں نے آزادانہ طور پر تصنیفات و تالیفات میں گراں بہا گنجینہ عطا کیا۔ ڈاکٹر فرید الدین فرید عصر، کلچرل کاؤنسلر، جمہوریہ اسلامی ایران، نئی دہلی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انیسویں صدی میں خیالی سفرنامے منظر عام پر آئے جن میں احتجاج تھا۔ اس دور میں یوروپین ادب کا ترجمہ بھی ہوا۔ اس دور سے اب تک کے ایرانی ادب میں سماج کی عکاسی ہوئی ہے۔ جنگ سے متعلق فارسی ادب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں جنگ کی مخالفت اور اتحاد پر زور دیا جاتا ہے۔ جس طرح شمالی افریقہ میں دوسری جنگ عظیم کے بعد وہاں کے ادیبوں نے بھی اسی بات پر زور دیا ہے کہ جنگ اچھی بات نہیں ہے۔ جنگ کی ضد میں ایران میں جو ادب تخلیق ہوا ہے اسے ادبیات دفاع مقدس کا نام دیا ہے۔ پروفیسر فرحت حسن، دہلی یونیورسٹی نے اپنے کلیدی خطاب میں کہا کہ میری تخلیق اور تحقیق کا تعلق مغل دور کی تاریخ سے ہے

اس لیے مجھے فارسی ادب کے مطالعے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہند فارسی ادب کو ترجمہ کرتے وقت مورخین کی ضرورت ہوتی ہے۔ ادب دراصل جذبات پر منحصر ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے بیشتر تذکرے خواتین پر تھے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ ادب کی تخلیق میں خواتین کا اہم کردار ہوتا ہے۔ تازہ گوئی کی اصطلاح پر خوب زور دیا گیا ہے۔ مقامی راجاؤں پر مغلیہ حکومت کا گہرا اثر مرتب ہوا کیونکہ مغلوں کی زبان فارسی تھی اس لیے سرکاری زبان کے ساتھ ساتھ ادبی زبان بھی فارسی ہی تھی۔ پروگرام کی نظامت اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد احتشام الدین نے کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 27 مارچ 2026

لائبریری کی بدلتی صورت حال

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبۂ لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس نے لائبریریز میں ابھرتے ہوئے رجحانات پر ایک دو روزہ بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی جس میں دنیا بھر سے نامور ماہرین، پیشہ ور افراد اور پالیسی سازوں نے شرکت کی اور لائبریری و انفارمیشن سائنس کے بدلتے ہوئے منظر نامے پر غور و خوض کیا۔ افتتاحی اجلاس میں کانفرنس کے کنوینر پروفیسر ایم معصوم رضا نے مصنوعی ذہانت کے دور میں لائبریریوں کی بڑھتی ہوئی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اطلاعات کے ماہرین کے لیے مسلسل سیکھنے اور نئی مہارتوں کا حصول ناگزیر ہے تاکہ وہ تکنیکی تبدیلیوں کا موثر انداز میں مقابلہ کر سکیں۔ پنجاب یونیورسٹی کی پروفیسر پریتی مہاجن (کانفرنس ڈائرکٹر) نے مؤثر انفارمیشن ڈلیوری سسٹم کی اہمیت کو اجاگر کیا اور اس کانفرنس کو علمی تبادلہ کا ایک عالمی پلیٹ فارم قرار دیا۔ امریکن لائبریری ایسوسی ایشن کی صدر محترمہ سیم ہیلمک نے آن لائن خطاب کیا۔ پروفیسر اکرام حسین، ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز، اے ایم یو نے موجودہ دور میں لائبریری خدمات کی تیزی سے بدلتی صورت حال پر روشنی ڈالی۔ مہمانانِ خصوصی ڈاکٹر اشوک کمار مشرا، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف انسالوپیسی پروفیشنلز آف آئی سی اے آئی، نوئیڈا نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈیجیٹل عہد میں لائبریریوں کے انقلابی کردار پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ جدید لائبریریاں اب صارف مرکوز اور باہمی تعامل کو فروغ دینے والی جگہوں میں تبدیل ہو رہے ہیں، جو تخلیقی صلاحیت اور علم کے تبادلے کو بڑھاتی ہیں اور روایتی تعلیمی حدود سے آگے اپنی اہمیت قائم کر رہی ہیں۔ اپنے صدارتی خطاب میں اے ایم یو وائس چانسلر پروفیسر نعیمہ خاتون نے مولانا آزاد لائبریری کو ایشیا کے بہترین علمی ذخائر میں شمار کرتے ہوئے کہا کہ لائبریریاں ایک بنیادی تبدیلی کے مرحلے سے گزر رہی ہیں اور وہ مصنوعی ذہانت، مشین لرننگ، ڈیٹا اینالیٹکس اور کلاؤڈ کمپیوٹنگ جیسی ٹکنالوجیز کے باعث متحرک اور جدید

مراکز میں تبدیل ہورہی ہیں۔ کانفرنس کے لیے تقریباً 120 تحقیقی مقالات موصول ہوئے، جن میں سے 63 مقالات کو پیش کش اور اشاعت کے لیے منتخب کیا گیا۔ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں سووینئر کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ آخر میں یونیورسٹی لائبریرین پروفیسر نشاط فاطمہ نے کلمات تشکر ادا کیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 مارچ 2026

فاطمہ شیخ کی زندگی اور تعلیم میں ان کا کردار

بارہ بنکی: اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے اشتراک سے بھارت ایجوکیشنل ویلفیئر ٹرسٹ کے مشترکہ

زیر اہتمام گورنمنٹ وومین ڈگری کالج شیخ سرائے، سیتاپور میں فاطمہ شیخ کی زندگی اور تعلیم میں ان کا کردار موضوع پر ایک دو روزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ مہمانِ خصوصی، شفاعت حسین، ڈائرکٹر، اتر پردیش وقت ڈیولپمنٹ کارپوریشن، حکومت اتر پردیش، لکھنؤ نے خواتین کی تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ فاطمہ شیخ کی زندگی خواتین کے لیے ایک تحریک ہے۔ ایک مسلم خاتون ہونے کے باوجود تعلیم کے میدان میں ان کی خدمات پر معاشرہ ہمیشہ فاطمہ شیخ کا مقروض رہے گا۔ بی جے پی حکومت کا بنیادی مقصد بیٹیوں کو بچانا اور بیٹیوں کو پڑھانا ہے۔ خصوصی مقرر کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے فخرالدین علی احمد گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، محمود آباد، سیتاپور کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر داؤد احمد نے کہا کہ فاطمہ شیخ کو ہندوستان کی پہلی مسلم ٹیچر مانا جاتا ہے۔ اس نے ساوتری بائی پھولے اور جیوتیبا پھولے کے ساتھ مل کر ایک تحریک شروع کی جس کا مقصد خواتین کے لیے تعلیمی اور سماجی حقوق حاصل کرنا تھا۔ اس نے اپنا گھر خواتین کی تعلیم کے لیے ایک اسکول کے لیے عطیہ کیا۔ پروگرم کی صدارت ڈاکٹر المین علی، سابق سکریٹری، اتر پردیش اقلیتی کمیشن، لکھنؤ نے کی۔ کوآرڈینیٹر انجینئر محمد انیس، ڈائرکٹر ٹیکنیکل ایجوکیشن ڈیولپمنٹ اینڈ پبلک ویلفیئر انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ تھے۔ آرگنائزنگ سکریٹری پروفیسر امیہ کمار اور سرپرست پرنسپل پروفیسر کامنی ورما نے اپنے خطابات میں طلبہ کو فاطمہ شیخ کی تعلیم میں خدمات کے بارے میں آگاہ کیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر رجنی کانت، پرنسپل، آر ایم پی جی کالج، سیتاپور اور ڈاکٹر ریا جیودویدی، پرنسپل، ڈی ڈی یوگورنمنٹ پی جی کالج، سیتاپور نے اپنی بصیرت کے ساتھ سمینار کو شرف بخشا۔ کلیدی مقررین کے طور پر ڈاکٹر کیرتی شرما، ڈاکٹر ششیر سریواستو، پروفیسر کلپنا سنگھ، ڈاکٹر اجیت یادو، ڈاکٹر کلدیپ کمار، ڈاکٹر نیلم یادو، اور ڈاکٹر شالنی چودھری نے اپنے خیالات سے طلبا اور شرکا کے باطن کو بیدار کیا۔ سمینار کی نظامت ڈاکٹر ہریکیش نے کی اور محمد انیس نے سبھی شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 مارچ 2026

مانولکھنؤ کیمپس میں پہلا یک روزہ ریسرچ اسکالر سمینار

لکھنؤ: موجودہ عہد میں بین شعبہ جاتی تحقیق ناگزیر

ہے۔ تحقیق کے اہم مقاصد میں اس کی اشاعت اور عصر حاضر میں اس کی کیا معنویت ہے، نہایت ضروری ہے۔ ان خیالات کا اظہار خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر ثوبان سعید نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے لکھنؤ کیمپس میں 2 اپریل کو منعقدہ پہلے یک روزہ ریسرچ اسکالرز سمینار میں کلیدی خطبہ کے دوران کیا۔ ریسرچ اسکالرز سمینار کی صدارت پروفیسر گلفشاں حبیب (ڈین اسکول آف لینگویجز، لینگویسٹکس اینڈ انڈولوجی، مانو حیدرآباد) نے فرمائی۔ کیمپس کی انچارج پروفیسر ہما یعقوب نے خیر مقدمی کلمات ادا کیے۔ نظامت تیمور احمد خاں نے کی اور شکریے کے کلمات اسما حسین نے ادا کیے۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے پروفیسر ثوبان سعید نے تحقیق کی اخلاقیات پر زور دیا۔ انھوں نے تحقیق کے تکنیکی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ سرقہ کی متعدد قسموں میں اے آئی کا استعمال اب بہت رائج ہو چکا ہے اس سے بچنا چاہیے۔ جامعات میں تحقیق کو اسی لیے اب باقاعدہ سافٹ ویئر کی مدد سے اسے چیک کیا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تحقیق کو عام کرنا بھی ضروری ہے تاکہ دوسرے لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اس موقعے پر انھوں نے مختلف فن پاروں خصوصاً رشید حسن خاں کی تحقیقات سے مثالیں بھی پیش کیں۔ انھوں نے ریسرچ اسکالر سے خطاب کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ وہ اپنی تحقیق میں مراجع و مصادر کا خاصا اہتمام کریں اسی سے محقق کا اعتبار قائم ہوتا ہے۔ پروفیسر ثوبان سعید نے کہا کہ تحقیق کے دو مقاصد ہیں یعنی تحقیق کیوں کی جائے اور کیسے کی جائے۔ ریسرچ اسکالر ان کے بغیر منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ پروفیسر ہما یعقوب نے اس موقعے پر خیر مقدم کرتے ہوئے پہلے ریسرچ سمینار کے انعقاد پر مسرت کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ کیمپس کی پہچان کا ایک پہلو یہاں کے ریسرچ اسکالر کی تحقیقات بھی ہیں۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر گلفشاں حبیب نے جہاں تحقیق کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی وہیں کہا کہ ہمیں اس بات پر بہت سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ ہم اپنی تحقیق کو کس طرح مزید بہتر بنا سکتے ہیں اور لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔ اس موقعے پر لکھنؤ کیمپس کے اس پہلے ریسرچ اسکالر سمینار کے

انعقاد پر انھوں نے خاص طور پر مبارکباد پیش کی۔ سمینار کے تین تکنیکی اجلاس ہوئے جس میں اسما حسین، محمد قاسم، انجم الثاقب، پی خواجہ معین الدین (شعبۂ انگریزی)، مریم خاتون، نفیسہ بتول، منتجب حسین، ماریہ خاتون، رقیہ تبسم، رضا عباس (شعبۂ فارسی)، فائزہ عریضی (شعبۂ عربی)، رابعہ بانو، محمد عمران، مہرالنسا، عدیلہ، سیف الدین احمد، سعدیہ خاتون، حسیب الدین (شعبۂ اردو) نے مقالے پڑھے۔ مختلف تکنیکی اجلاس کی صدارت پروفیسر ہمایوب، ڈاکٹر نکہت فاطمہ، ڈاکٹر ثمانیہ فیصل، ڈاکٹر مجاہد الاسلام، ڈاکٹر نور فاطمہ نے انجام دیے۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ، 3 اپریل 2026

اردو شاعری میں قومی یکجہتی اور حب الوطنی

سدھارتھ نگر: مسیحا اردو سوسائٹی کی جانب سے

اتر پردیش اردو اکادمی کے اشتراک سے ایک سمینار کا انعقاد 'اردو شاعری میں قومی یکجہتی و حب الوطنی' عنوان کے تحت جنتا انٹ ہاؤس، اٹوا سدھارتھ نگر میں کیا گیا، سمینار کی صدارت سماجی کارکن اسرار احمد فاروقی نے کی جب کہ نظامت کے فرائض مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس کے ڈاکٹر مسیح الدین خان نے انجام دیے، پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ماہر فزیشین ڈاکٹر توصیف ایچ خان نے شرکت کی اور مہمانانِ ذی وقار کی حیثیت سے ابوالہشام خاں، ممتاز صحافی عبدالقدوس، شاعر ہدایت اللہ شمسی، جمال احمد قدوسی شریک ہوئے۔ دیگر مقررین و مقالہ خواں میں ڈاکٹر عیاز احمد، ماسٹر شاہد حسین ماسٹر محمد زبیر، ماسٹر عبدالحلیم، مولانا نعیم ارشد قاسمی، ماسٹر عبدالفرید خاں، ماسٹر اسرائیل، مولانا احمد مسلم، عبارت حسین، ماسٹر احمد، سراج احمد وغیرہ شامل ہیں۔ پروگرام کے آغاز میں سوسائٹی کے سرپرست عبدالحلیم خان و منتظمین پروگرام نے بیج لگا کر مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقعے پر سوسائٹی کی جانب سے چار شخصیات کو ان کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ، شال و توصیفی سند سے نوازا گیا، ان میں سماجی خدمات کے لیے اسرار احمد فاروقی کو صحافتی خدمات کے لیے ممتاز صحافی عبدالقدوس کو تدریسی خدمات کے لیے ابوالہشام خاں کو اور سماجی خدمات کے لیے احمد خاں کو شال، مومنٹو مڈل اور سرٹیفکیٹ پیش کر کے اعزاز سے نوازا گیا۔ نظامت کرتے ہوئے سوسائٹی کے بانی ڈاکٹر مسیح الدین خان نے کہا کہ یہ موضوع بہت وسیع ہے، ہماری اردو کی شاعری میں قومی و یکجہتی بھری پڑی ہے۔ شعرا نے قومی یکجہتی و حب الوطنی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ سمینار کے صدر اسرار احمد فاروقی نے کہا کہ آج اردو پوری دنیا میں مقبول ہے، اور دن بدن اردو ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

مہمان شاعر ہدایت اللہ شمسی نے اردو شاعری پر اپنا طویل مقالہ پیش کیا اور اردو شاعری کے حوالے سے نثری اور شعری کلام پیش کیا، جمال احمد قدوسی نے اظہار خیال کرتے ہوئے اپنا شعری کلام بھی پیش کیا۔ دیگر حضرات نے اردو لکھنے پڑھنے پر زور دیا۔ پروگرام کے آخر میں سوسائٹی کے سرپرست عبدالحلیم و بانی سوسائٹی ڈاکٹر مسیح الدین خاں نے سبھی حضرات کا شکریہ ادا کیا و پروگرام کے اختتام کا اعلان کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 1 اپریل 2026

بہار

بہار انجمن جمہوریت پسند مصنفین کی میٹنگ میں اردو سیل کی تشکیل

موتیہاری: جن وادی لکھک سنگھ، بہار ریاستی کونسل کی میٹنگ 29 مارچ 2026 کو سوریہ کمپلیکس، جمال روڈ، پٹنہ میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر نیرج سنگھ نے میٹنگ کی صدارت کی۔ ریاستی سکریٹری کمار ونیتا بھ نے کام کی رپورٹ اور آئندہ پروگرام کے لیے ایک تجویز پیش کی، جسے موجودہ اراکین نے متفقہ طور پر منظور کیا۔ اجلاس میں درج ذیل فیصلے کیے گئے:

(1) رکنیت کی تجدید کو اَپ ڈیٹ کریں اور مرکزی کونسل کے اجلاس میں ضلعی نمائندگان یعنی صدور و مہتمم حضرات کی شرکت کو موقع بنا دیں۔

(2) اردو ذیلی کمیٹی، اردو سیل کی تنظیم نو کی گئی، کامریڈ شاہ ظفر امام کو کنوینر کے عہدے پر فائز کیا گیا وہیں صحافی و شاعر رفیع احمد آفتاب شاعر غلام سرور اور جمیل اختر کو ممبران منتخب کیا گیا

(3) لوک زبان کی ذیلی کمیٹی کو دوبارہ منظم کیا گیا، جس میں بھوجپوری بجیکا میتھلی اودیگر بولیوں کو شامل کیا گیا۔ کامریڈ الکھ دیو پرساد اچل کو کنوینر منتخب کیا گیا۔

(4) دونوں ذیلی کمیٹیوں کے اجلاس منعقد کیے جائیں اور اگلے تین مہینوں میں الگ الگ ریاستی سطح کے پروگرام منعقد کیے جائیں۔

(5) کہانی کار امرکانت کی صد سالہ پیدائش منانے کے لیے، تمام ضلعی اکائیوں کو 2 اور 3 مئی کو ان پر بات چیت کرنی چاہیے

(6) فلم اسکرین رائٹر ریتوک گھاٹک کی صد سالہ پیدائش کے موقعے پر مئی کے آخری ہفتے میں ریاستی مرکز پٹنہ میں ان پر مرکوز ایک پروگرام منعقد کرے گا۔ مشاعرے کے انعقاد، کہانی سنانے، میگزین کی اشاعت اور آن لائن پروگرامز کے حوالے سے بھی فیصلے کیے گئے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 31 مارچ 2025

تلنگانہ

رائٹ، جسٹس، ایکشن فار آل ویمن اینڈ گرلز

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبہ ویمن اسٹڈیز کی جانب سے عالمی یوم خواتین کے ضمن میں

رواں سال 2026 کے تھیم رائٹ، جسٹس، ایکشن فار آل ویمن اینڈ گرلز کے عنوان کے تحت ایک روزہ سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر مختلف شعبہ حیات میں بہترین کارکردگی کرنے والی کارنامہ ساز خواتین کو تہنیتی ایوارڈ پیش کرتے ہوئے ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ ان خواتین میں پروفیسر اشرف رفیع، محترمہ سلطانہ نظیر حسن، محترمہ خالدہ پروین، محترمہ اُما سدھیر، محترمہ روبینہ اور محترمہ عرشیہ حسن شامل ہیں۔ پروفیسر آمنہ تحسین ویمن اسٹڈیز نے ایوارڈ پانے والی ان خواتین کا تعارف پیش کیا جب کہ سمپوزیم میں بطور مہمان خصوصی پروفیسر آمنہ کشور اور محترمہ سکینہ صادق نے خطاب کیا۔ پروفیسر آمنہ کشور نے کہا کہ صرف خوبصورت نعروں سے خواتین کو بااختیار نہیں بنایا جاسکتا ہے بلکہ زمینی سطح پر مردوں کے ساتھ مل کر ہی ایک بہترین معاشرہ بنایا جاسکتا ہے۔ ڈین اسکول برائے فنون و سماجی علوم پروفیسر پی ایچ محمد نے اپنے خطاب میں خواتین کی جدوجہد اور حصولیابیوں کو اجاگر کیا جب کہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب پروفیسر سید عین الحسن نے اپنے صدارتی خطاب میں سماج میں صنفی مساوات کے لیے فکری نظریاتی اور تہذیبی عمل کو بدلنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ اپنی شناخت کو پہچاننا یعنی خودشناسی ہی اصل میں ایکشن کہلاتا ہے۔ صدر شعبہ ویمن اسٹڈیز ڈاکٹر شبانہ کیسر نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے پروگرام کے اغراض و مقاصد کو بیان کیا۔ واضح رہے کہ اردو انگریزی اور ہندی زبانوں میں یوم خواتین کے موقعے پر ڈبیٹ کامپٹیشن منعقد کیا گیا تھا۔ یونیورسٹی خواتین کو بااختیار بنانے کی اپنی سماجی ذمے داری کے تحت شعبہ ویمن اسٹڈیز اور مرکز برائے مطالعات نسواں کی جانب سے کیمپس میں گذشتہ ماہ خواتین دستکار میلے بھی منعقد کیے گئے تھے۔ سمپوزیم میں مباحثہ، پوسٹر سازی اور خواتین دستکار میلے کے فاتحین میں انعامات تقسیم کیے گئے۔ فیکلٹی شعبہ ویمن اسٹڈیز ڈاکٹر تبریز حسین نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 10 مارچ 2026

معاصر خواتین فکشن نگار: اسالیب اور موضوعات

حیدرآباد: ذکیہ مشہدی کے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری ہے، عذرا نقوی کی شاعری میں حساسیت اور نعیمہ جعفری پاشا

کی بچوں کے لیے کہانیوں کی اپنی اہمیت ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف افسانہ نگار ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی نے کیا۔ وہ شعبہ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد میں منعقدہ ایک علمی وادبی پروگرام میں توسیعی لیکچر دے رہی تھیں۔ لیکچر کا عنوان 'معاصر خواتین فکشن نگار: اسالیب اور موضوعات' تھا۔

ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی نے اپنے خطاب میں موجودہ دور کی اہم خواتین فکشن نگاروں کا تفصیل سے ذکر کیا اور ان کے فن، اسلوب اور موضوعات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے انجم قدوائی کے افسانوں کے موضوعات و اسلوب پر بھی اظہارِ خیال کیا اور صادقہ نواب سحر کی افسانہ نگاری کی اہمیت پر روشنی ڈالی، اور ثروت خان کے ہاں راجستھانی ثقافت کی جھلک پر بھی گفتگو کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے نگار عظیم، جیلانی بانو، زینت ساجدہ، نجمہ نکہت، قمر جمالی اور فریدہ زین کے فن کا بھی ذکر کیا اور بتایا کہ ان کے موضوعات میں معاشرتی مسائل، عورت کی شناخت، گھریلو زندگی اور بدلتے ہوئے سماجی رویے نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ پروفیسر آمنہ تحسین کے حوالے سے انھوں نے بتایا کہ انھوں نے سلطانہ کا خواب جیسی اہم کتاب کا ترجمہ اور تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ مزید برآں نازیہ حسن اور شائستہ فاخری کے کام کا بھی ذکر کیا گیا۔ لیکچر میں یہ بات خاص طور پر سامنے آئی کہ معاصر خواتین فکشن نگار اپنے اسلوب میں سادگی، سچائی اور حقیقت نگاری کو اہمیت دیتی ہیں، جب کہ ان کے موضوعات میں عورت کے مسائل، سماجی ناہمواریاں، اور انسانی جذبات کی عکاسی نمایاں ہوتی ہے۔ اس موقعے پر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر احسن ایوبی نے فارسی کہانی کا اردو ترجمہ بعنوان 'خرگوش اور ٹماٹر' پیش کیا جس میں عورت کی مظلومیت اور بے بسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس پروگرام کی صدارت پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی نے کی جب کہ نظامت کے فرائض پروفیسر احمد خان نے انجام دیے۔

پروگرام کے اختتام پر پروفیسر فیروز عالم نے شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر شعبہ اردو کے دیگر اساتذہ اور ریسرچ اکالرز ایم اے اور بی اے کے طلبہ وطالبات بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 31 مارچ 20206

ترجمہ اور تغیر: زبان، ثقافت اور سماج کے باہمی روابط کا مطالعہ

حیدرآباد: عہد قدیم سے انسانی تمدن کی ترقی اور تہذیبی تغیر وتبدیلی میں فن ترجمہ نے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ مصر، یونان اور روم کی قدیم ترین تہذیبوں کے علمی وثقافتی سرمائے سے دنیا محروم ہی رہ جاتی اگر انھیں ترجموں کے ذریعے اگلی نسلوں تک منتقل نہیں کیا جاتا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبہ ترجمہ کی جانب سے منعقدہ دوروزہ قومی سمینار سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر ارجمند آرا نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ سمینار کا موضوع 'ترجمہ اور تغیر: زبان، ثقافت اور سماج کے باہمی روابط کا مطالعہ' تھا۔ پروفیسر ارجمند آرا نے اس موضوع پر کلیدی خطاب کیا۔ پروفیسر ارجمند نے اپنے خطاب میں مزید کہا کہ عہد وسطیٰ میں اگر عرب یونان کے فلسفے اور علوم کو عربی زبان میں منتقل نہ کرتے تو آج دنیا ارسطو اور افلاطون کے ناموں سے بھی واقف نہیں ہوسکتی تھی۔ ترجمہ کا عمل انسانی تہذیب اور ثقافت کے تسلسل اور ترقی کا سب سے اہم وسیلہ رہا ہے۔ وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی پروفیسر سید عین الحسن جو پدم شری ایوارڈ یافتہ ہیں نے سمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے کہا کہ علمی، دنیا کبھی بھی ترجمے سے صرف نظر نہیں کرسکتی اور دنیا کے ہر بڑے ادیب نے اپنی زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں ترجمہ ضرور کیا ہے۔ وائس چانسلر نے ترجمہ کی اہمیت، ترجمہ اور ثقافت کے باہمی تعلق اور ترجمے کی حرکیات پر نہایت بصیرت افروز نکات بیان کیے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر علی رفاد فتیحی نے کہا کہ ترجمہ محض ایک لسانی سرگرمی نہیں بلکہ ایک مکمل ثقافتی عمل ہے جس میں ایک زبان کی ثقافت دوسری زبان کی ثقافت میں ڈھل جاتی ہے۔ اس منتقلی میں مترجم کو مختلف قسم کی لسانیاتی و

ثقافتی چیلنجز سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر باراں فاروقی نے اپنے خطاب میں کہا کہ مختلف ثقافتوں میں زبان کے الفاظ اپنے مخصوص معنی کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں انھیں جب دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے تو وہ معنی باقی نہیں رہ پاتے، اس لیے بدقی زبان کو اپنے معنوی سیاق کے ساتھ نئے الفاظ وضع کرنے پڑتے ہیں۔ مہمان اعزازی کی حیثیت سے تشریف لائے ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے اردو زبان میں الفاظ کی وسعت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں الفاظ سازی کے لیے جو اصول بنائے گئے تھے ان کی مدد سے ہم آج بھی مختلف نئے الفاظ تراش سکتے ہیں اور ہر قسم کے مضامین کو اردو میں آسانی کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے۔ قبل ازیں افتتاحی اجلاس میں صدر شعبہ ترجمہ پروفیسر خالد مبشر نے خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے تمام مہمانوں اور شرکا کا استقبال کیا۔ سمینار کے کوآرڈی نیٹر پروفیسر سید محمود کاظمی نے سمینار کا تعارف پیش کیا۔ جب کہ اسکول برائے السنہ، لسانیات و ہندوستانیات کی ڈین پروفیسر گلفشاں حبیب نے اسکول اور اس کے مختلف پروگراموں اور کورسز کا تعارف پیش کیا۔ پروفیسر فہیم الدین احمد نے افتتاحی اجلاس کی کارروائی چلائی اور ڈاکٹر کہکشاں لطیف نے اظہار تشکر کا فریضہ انجام دیا۔ اس موقعے پر وائس چانسلر پروفیسر سید عین احسن کے ہاتھوں شعبہ کے اسکالرس کے تحقیقی کاموں پر مشتمل پوسٹر پریزنٹیشن شوکیس کا بھی افتتاح ہوا۔ شعبہ ترجمہ کے اس سمینار میں ملک کے مختلف حصوں سے متنوع مضامین کے ماہر اساتذہ، محققین اسکالر کی ایک کثیر تعداد شریک ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 27 مارچ 2026

گجرات

اردو کل-آج اور کل

گجرات/ لکھنؤ: احمد آباد کے رہنے والے سوشل ایکٹوسٹ/ کاروباری محمد عرفان قادری نے اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ گجرات اردو ساہتیہ اکیڈی گاندھی نگر اور اکھل سدبھاونا ٹرسٹ کے مشترکہ زیر اہتمام، شہر کے ایک ہوٹل میں ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت معروف صنعت کار ڈاکٹر نعیم ترمذی نے کی۔

اردو کل- آج اور کل' کے موضوع پر منعقد ہونے والے سمینار میں پروفیسر ڈاکٹر ناظمہ انصاری شعبۂ اردو کی سربراہ (گجرات آرٹس اینڈ سائنس کالج احمد آباد) نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو صرف ایک زبان نہیں ہے، بلکہ ثقافت، جذبات اور انسانیت کی آئینہ دار ہے۔ احمد آباد کے معروف نقاد پروفیسر وارث حسین علوی کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی علمی خدمات کو سراہا گیا۔ حضرت امیر خسرو کے بارے میں ان کی تقریر نے محفل کو ادبی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ اردو شاعری کے بنیادی ستون میر تقی میر، مرزا غالب اور مرزا مومن کا ذکر کیا گیا۔ پروگرام میں علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کی اردو شاعری پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ پروفیسر محمد اسلم نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر نعیم ترمذی نے تعلیم کی اہمیت، سماجی ذمہ داری اور معاشی طور پر پسماندہ طبقوں کے بچوں کو تعلیم کی فراہمی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ رفیق ایم شیخ اور سید منیر بابا نے انسانیت، خدمت اور تعلیم کے اصولوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مہمان خصوصی میں محمد عرفان قادری بابا، ریشماں بانو کاٹھی اور صبا خان شامل تھے۔ پروگرام کی میزبانی بشار ہارون رضوی اور شبیر ہاشمی نے کی۔ ادبی نشست میں شبنم انصاری، ظفر ٹنڈوی، ساحل صاحب اور عقیل شاطر جیسے نامور شاعروں نے اپنے اپنے کلام پیش کیے۔

روزنامہ 'صحافت' 4 اپریل 2026

اعزاز و اکرام

عبدالصمد

پٹنہ: ناول نگار پروفیسر عبدالصمد کو 30 مارچ 2026

کی ساہتیہ اکادمی کی جنرل کونسل کی میٹنگ میں اکادمی کے سب سے بڑے اعزاز ساہتیہ اکادمی فیلوشپ دیے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان کے اڑیا زبان سے متعلق معروف ادیبہ پرتبھا رائے اور سندھی کے معروف مصنف لکھمی کھلانی کو بھی یہ قومی فیلوشپ عطا کی گئی ہے۔ ساہتیہ اکادمی اگرچہ ہندوستان کی بائیس زبانوں کی بہترین کتابوں پر ہر سال انعامات دیتی ہے مگر اس ادارے کا یہ سب سے بڑا اعزاز ہے جو اب تک چنندہ افراد کو ہی میسر آیا ہے۔ اردو کی حد تک غور کریں تو عبدالصمد سے پہلے یہ قومی فیلوشپ فراق گورکھپوری، قرۃ العین حیدر اور گوپی چند نارنگ کو تفویض ہوئی ہے۔ ہمیں یاد ہونا چاہیے کہ عبدالصمد کو 1991 میں ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ ان کے مشہور ناول 'دو گز زمین' کے لیے دیا گیا تھا۔ اس موقعے پر انھیں پروفیسر صفدر امام قادری، شبیر احمد، ابوذر ہاشمی، مقصود دانش اور اسماعیل نذر نے انھیں مبارکباد پیش کی۔ عبدالصمد کو اردو ادب سے متعلق کم وبیش تمام بڑے انعامات حاصل ہو چکے ہیں اور ان کے ناولوں اور افسانوں کی قریب ڈیڑھ درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اردو کے علاوہ درجنوں زبانوں میں ان کی کتابیں ترجمہ ہو کر ان کی شہرت اور قبولیت میں اضافے کا باعث رہی ہیں۔

روزنامہ 'تاثیر' پٹنہ، 1 اپریل 2026

ساہتیہ اکادمی اعزازات

نئی دھلی: ہندوستان کے معروف ادارہ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کی جانب سے گزشتہ برسوں کی طرح سال 2025 کے قلم کاروں کو بھی اعزازات سے نوازا گیا۔ واضح رہے کہ ساہتیہ اکادمی نے ہندوستان کی 24 زبانوں میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور ساہتیہ اکادمی یوا پرسکار کا اعلان کچھ مہینوں قبل ہی کر دیا تھا۔ حالیہ دنوں میں ساہتیہ اکادمی کی جانب سے منعقدہ لٹریری فیسٹیول 2026 میں ان تمام قلمکاروں کو اعزازات سے نوازا گیا۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے 2025 کے لیے اردو میں یہ اعزاز پرتپال سنگھ بیتاب کو ان کے شعری مجموعہ 'سفر جاری ہے' پر تفویض کیا گیا جب کہ ہندی میں ممتا کالیا، سنسکرت میں ساڈھو بھادریش داس اور انگریزی میں نوتیج سارنا کے ساتھ کل چوبیس زبانوں کے قلم کاروں کو اعزازات سے نوازا گیا۔ اس اعزاز کے تحت ہر قلمکار کو ایک لاکھ روپے، شیلڈ اور شال عطا کیا گیا۔

اسی طرح ساہتیہ اکادمی یووا پرسکار 2025 کے لیے اکادمی نے ادب سے وابستہ 23 ہندوستانی زبانوں کے نوجوان قلمکاروں کو اعزازات سے نوازا۔ اردو میں یہ اعزاز نہاں رباب کو ان کی کتاب 'مظہر الحق: تحریک آزادیٔ ہند کا فراموش کردہ قائد' پر تفویض کیا گیا۔ دیگر زبانوں میں اعزاز حاصل کرنے والے نوجوانوں میں پاروتی ترکی (ہندی)، دھیرج کمار پانڈے (سنسکرت) اور آدویت کوٹاری (انگریزی) کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس ایوارڈ کے تحت قلم کاروں کو پچاس ہزار روپے، شیلڈ اور شال سے نوازا گیا۔

اعزازات کی اس تقریب کے موقعے پر اکادمی کے صدر جناب شری مادھو کوشک، نائب صدر ڈاکٹر کمد شرما، سکریٹری محترمہ پلوی پرشانت ہولکر اور مہمان خصوصی معروف قلم کار واسکالر ڈاکٹر سوریہ پرساد دکشت کے علاوہ بڑی تعداد میں سامعین موجود رہے۔

بہ شکریہ ساہتیہ اکادمی، دہلی

افضل منگلوری

دیوبند: عالمی شہرت یافتہ شاعر افضل منگلوری کو حکومت اتراکھنڈ کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ساہتیہ گوروسمان 2025

بھاشا سنستھان اتراکھنڈ کی جانب سے طویل مدتی اردو ادبی خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر عنوان چشتی ایوارڈ دہرادون میں 30 مارچ کو دیا جائے گا۔ یہ ایوارڈ اتراکھنڈ کے گورنر و زیر اعلیٰ اور وزیر لسانیات کے ہاتھوں 30 مارچ کو دہرادون میں پیش کیا جائے گا۔ اس ایوارڈ میں سند توصیف ڈیڑھ لاکھ روپے کا چیک شال اور ایوارڈ شامل ہے۔ افضل منگلوری اتراکھنڈ اردو اکیڈمی کے بانی نائب چیئرمین بھی رہ چکے ہیں اور ساتھ ہی اتراکھنڈ حکومت کی مختلف کمیٹیوں میں بطور خصوصی مشیر کے کام کر چکے ہیں۔ حال میں افضل منگلوری کو شوبھت یونیورسٹی کی جانب سے ایسوسی ایٹ پروفیسر کے طور پر نومی نیٹ کیا گیا تھا۔ افضل منگلوری کی نثر اور نظم کی ہندی اردو میں آٹھ کتابیں آچکی ہیں ان کے مجموعے 'تیرے بعد' کو اتراکھنڈ حکومت نے اعزاز دیا تھا۔ اس کے علاوہ افضل منگلوری کو ملک و بیرون ملک 200 سے زیادہ ادبی اعزازات اور ایوارڈ مل چکے ہیں۔ اس سے قبل بھی اتراکھنڈ کے تمام وزرائے اعلیٰ اور گورنروں کے ذریعے بھی افضل منگلوری کو اعزازات مل چکے ہیں۔ افضل منگلوری فی البدیہہ کے استاد شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ غور طلب ہے کہ اردو کے لیے ڈاکٹر عنوان چشتی اردو ایوارڈ کی تجویز بھی 2022 میں افضل منگلوری نے ہی حکومت اتراکھنڈ کو پیش کی تھی۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 30 اپریل 2025

شاہد خان

لکھنو/ میل وشارم: سینئر صحافی اور قومی صحافت لکھنؤ کے گروپ ایڈیٹر شاہد خان کو تمل ناڈو کے رانی

پیٹ ضلع میں واقع مشہور اور تاریخی اہمیت کا حامل علاقہ میل وشارم میں بیسٹ اردو ایڈیٹر 2025 کے ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ یہ اعزاز و اکرام میل وشارم دانیشنل ویلفیئر ایسوسی ایشن کی جانب سے ایسوسی ایشن کے میل وشارم میں واقع دفتر پر منعقد ایک اعزازی تقریب میں کیا گیا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ جب سینئر صحافی شاہد خان کو جنوبی ریاست کے میل وشارم میں اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ اس سے قبل گذشتہ سال بھی شاہد خان کی صحافتی خدمات کے اعتراف میں ایسوسی ایشن کی جانب سے اعزاز سے سرفراز کیا گیا تھا جب کہ اس بار بیسٹ اردو ایڈیٹر 2025 کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

اس موقعے پر ایسوسی ایشن کے صدر کے محمد ایوب صاحب اور جوائنٹ سکریٹری کے اونشاط احمد صاحب نے سینئر صحافی اور قومی صحافت لکھنؤ کے گروپ ایڈیٹر شاہد خان کی صحافتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ سینئر صحافی شاہد خان کی خدمات نہ صرف قابل ذکر ہیں بلکہ قابل ستائش بھی ہیں اور ان کی خدمات سے قومی صحافت لکھنؤ کی میل وشارم کے علاوہ چنئی اور ریاست تمل ناڈو کے مختلف علاقوں اور اضلاع میں بھی دھوم ہے اور عوام کے درمیان اخبار بے حد مقبول ہو رہا ہے۔ اخبار کی مقبولیت اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں ہی اخبار کے گروپ ایڈیٹر شاہد خان کو بیسٹ اردو ایڈیٹر 2025 کے ایوارڈ سے نوازا جا رہا ہے۔ جب کہ اس موقعے پر سینئر صحافی شاہد خان نے میل وشارم دانیشنل ویلفیئر ایسوسی ایشن کے صدر کے محمد ایوب اور جوائنٹ سکریٹری کے اونشاط احمد سمیت تقریب میں موجود سبھی عہدے داران و اراکین اور معززین دیگر لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کی کوشش رہے گی کہ میل وشارم اور چنئی سمیت پوری ریاست تمل ناڈو اور جنوبی خطے میں بھی لوگ ان کی صحافتی خدمات سے مستفید ہو سکیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 26 مارچ 2026

ڈاکٹر مسیح الدین خان

لکھنؤ: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس کے ڈاکٹر مسیح الدین خان کو بہترین ناظم کا اعزاز دیا گیا، یہ ایوارڈ اتر پردیش اردو اکادمی کے اشتراک سے ہوپ

ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام، مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن ہال امین آباد میں ایک تقریب

کے دوران دیا گیا۔ یہ اعزاز مانو لکھنؤ کیمپس کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی نمایاں وممتاز سینئر صحافی سابق ایڈیٹر روزنامہ 'انقلاب' و 'آگ' کے بدست نوازا گیا۔ اس موقعے پر سینئر صحافی غفران نسیم، اورفاؤنڈیشن کے سربراہ اعزاز حسین موجود تھے۔ ڈاکٹر مسیح الدین خان کو یہ اعزاز دیے جانے پر اِرا میڈیکل یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر عباس علی مہندی، آل انڈیا انٹلکچول مسلم سوسائٹی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عمار انیس نگرامی، احمد نگرامی، محمود الحسن رضوی، اسرار احمد، عاطف مسیح، وعاصم مسیح وغیرہ نے مبارکباد پیش کی۔ اس سے قبل بھی ڈاکٹر مسیح الدین خان کو مختلف اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 4 اپریل 2026

رسم اجرا

تعلیم کے عصری مسائل اور تقاضے

دربھنگہ: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (مانو) کے

کالج آف ٹیچر ایجوکیشن (سی ٹی ای) دربھنگہ میں منعقدہ 13 مارچ کی شام ایک پروگرام کے دوران ڈاکٹر آفتاب عالم کی تصنیف 'تعلیم کے عصری مسائل اور تقاضے' نامی کتاب کی رونمائی ہوئی۔ متعلقہ کتاب کی رونمائی مولانا ابوالکلام آزاد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر سید عین الحسن رجسٹرار سید اشتیاق احمد، ڈین اکیڈمک اور بہار کے انچارج، پروفیسر محمد شاہد، اسکول آف ٹکنالوجی کے ڈین پروفیسر عبدالواحد اور دربھنگہ سٹیلائٹ کیمپس وکالج کے پرنسپل، پروفیسر محمد فیض احمد کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر کالج کے متعدد عہدے داران، اساتذہ، طلبہ وغیر تدریسی عملے نے شرکت کی۔ اس مناسبت سے خطاب کرتے ہوئے وائس چانسلر پروفیسر عین الحسن نے ڈاکٹر آفتاب عالم کی علمی کاوش کو سراہا اور معاصر معاشرے میں تعلیم کے ابھرتے ہوئے چیلنجوں سے نمٹنے میں تحقیقی وتصنیفی کاموں کی اہمیت پر زور دیا۔ نئی جاری کردہ کتاب میں تعلیم کے مختلف عصری مسائل اور تقاضوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، جن میں جامع تعلیم، تیسری جنس کی تعلیم، اقدار کی تعلیم، تعلیم کی نجکاری، پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ (پ پ پ)، عالمگیریت، آزادیت اور مجموعی نشوونما میں جسمانی تعلیم کا کردار جیسے موضوعات شامل ہیں۔ قابل ذکر ہے کہ وائس چانسلر موصوف کے کالج کے گذشتہ سفر کے دوران بھی ڈاکٹر آفتاب عالم کی تصنیف 'ہندوستان میں پسماندہ طبقات کی تعلیم' کی رسم اجرا عمل میں آئی تھی۔ یہ ابتدائی کتاب ہندوستان میں پسماندہ طبقوں کی تعلیمی صورت حال اور انھیں درپیش چیلنجوں پر مرکوز تھی۔ پروگرام میں موجود اساتذہ نے مصنف کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ یہ نئی کتاب تعلیم کے بدلتے ہوئے منظرنامے کو سمجھنے میں دلچسپی رکھنے والے محققین، اساتذہ اور طلبہ کے لیے ایک قیمتی علمی وسیلہ ثابت ہوگی۔ پروگرام کا اختتام شکریہ کی قرارداد کے ساتھ ہوا، جس میں تعلیم کے شعبے میں تحقیق، تصنیف وتالیف اور فکری مصروفیات کو فروغ دینے کے لیے ادارے کے مسلسل عزم کا اعادہ کیا گیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 14 مارچ 2026

بے باک ہوں بے ادب نہیں

نئی دھلی: بی جے پی کے سینئر لیڈر اور سابق ایم پی برج بھوشن شرن سنگھ کی بیٹی شالنی سنگھ کی شاعری پر مبنی کتاب 'بے باک ہوں، بے ادب نہیں' کا دہلی میں اجرا عمل میں آیا۔ اس تقریب میں سابق گورنر کلراج مشرا، شالنی سنگھ کے والد اور سابق رکن پارلیمنٹ برج بھوشن سنگھ اور پدم شری سنیل جوگی ومعروف شاعر (کوی) ڈاکٹر ہری اوم پوار بھی موجود تھے۔ تمام مہمانوں نے شالنی سنگھ کی کتاب اور شاعری کی تعریف کی۔ کلراج مشرا نے شالنی سنگھ کو مبارکباد دی اور ان کی شاعری کی تعریف کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب شالنی سنگھ کی ادب (ساہتیہ) میں دلچسپی اور ان کی زندگی میں اس کی اہمیت کو ثابت کرتی ہے۔ وہ جو کچھ سوچتی ہیں، اسے انھوں نے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ سابق رکن پارلیمنٹ برج بھوشن شرن سنگھ نے اس دن کو بہت خاص قرار دیتے ہوئے کہا کہ شالنی سنگھ نے خود کو ثابت کیا ہے۔ تاہم اس سے پہلے میری اس کتاب کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی، لیکن آج میں بہت خوش ہوں۔ انھوں نے کہا کہ شاعری نے میری زندگی میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ شاید اسی اثر نے شالنی سنگھ کو بھی متاثر کیا۔ شالنی سنگھ نے بہت جذباتی ہوکر کہا کہ میں نے اپنے والد کے بارے میں اتنی زیادہ کبھی بات نہیں کی، لیکن آج میں جو کچھ بھی ہوں ان کی وجہ سے ہوں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں لکھا کہ میرے لیے، میرے والد بھگوان سے پہلے ہیں کیونکہ انھوں نے مجھ میں تعلیم، اقدار اور زندگی کی طاقت کے بیج بوئے۔ میں ہمیشہ ان کی مقروض رہوں گی۔ شالنی سنگھ نے اردو زبان سے اپنی محبت اور پیار کا اظہار بھی کیا۔ اردو زبان سے محبت ان کی شاعری اور کتاب میں بھی جھلکتی ہے۔ قابل ذکر ہے کہ شالنی سنگھ، سابق ایم پی برج بھوشن شرن سنگھ کی اکلوتی بیٹی ہیں۔ وہ ایک ماہر تعلیم، وکیل، مصنف، شوٹر اور شاعرہ ہیں، جو اکتوبر 2025 میں عوامی

پلیٹ فارم پر شاعری سنانے کے بعد مشہور ہوئیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 3 اپریل 2026

وفیات

آشا بھوسلے

ممبئی: ہندوستانی موسیقی کی نامور اور لجنڈری پلے بیک سنگر آشا بھوسلے کا 12 اپریل 2026 کو ممبئی کے بریچ

کینڈی اسپتال میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ یہاں کئی دنوں سے وہ زیرِعلاج تھیں تاہم وہ جانبر نہ ہوسکیں۔ان کے انتقال کی تصدیق ان کے بیٹے آنند بھوسلے نے کی۔ 13 اپریل کی شام 4 بجے ممبئی کے شیواجی پارک میں ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔ آشا بھوسلے بالی ووڈ کی ان عظیم گلوکاراؤں میں سے تھیں جن کی آواز نے اس انڈسٹری اور ملک کی موسیقی کو خوبصورت شکل دی۔انھوں نے اپنی بہن لتا منگیشکر کے علاوہ محمد رفیع، مکیش اور کشور کمار جیسے عظیم فنکاروں کے ساتھ مل کر نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے تک ہندی موسیقی کی دنیا پر راج کیا۔تقریباً 10 سال کی عمر میں اپنے کیریئر کا آغاز کرنے والی آشا بھوسلے نے 22 زبانوں میں 12 ہزار سے زیادہ گانے گائے۔انھیں موسیقی کی تاریخ میں سب سے زیادہ گانے ریکارڈ کرانے والی فنکارہ کے طور پر گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈس سے بھی پہچان ملی۔تفریحی دنیا کو بے شمار لازوال ہٹ گانے دینے والی بھوسلے کو کئی ایوارڈز اور اعزازات سے نوازا گیا، جن میں پدم وبھوشن اور دادا صاحب پھالکے شامل ہیں۔ان کے انتقال پر فنکاروں، مداحوں اور سیاسی شخصیات کی جانب سے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔وزیراعظم نریندر مودی نے آشا بھوسلے کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے انھیں ہندوستان کی سب سے بااثر اور ہمہ جہت آوازوں میں سے ایک قرار دیا۔ ایکس پر شیئر کیے گئے ایک جذباتی پیغام میں وزیراعظم نے کہا کہ وہ ان کے انتقال سے انتہائی رنجیدہ ہیں اور ان کے کئی دہائیوں پر محیط شاندار موسیقی کے سفر کو خراجِ تحسین پیش کیا۔انھوں نے کہا کہ ان کا غیر معمولی موسیقی کا سفر جو کئی دہائیوں پر محیط ہے، ہماری ثقافتی وراثت کو مالال کرتا رہا اور دنیا بھر میں بے شمار دلوں کو چھوتا رہا۔ پردھان منتری نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ان کی آواز نے ہندوستانی سنیما اور موسیقی کی کئی نسلوں کی نمائندگی کی۔ان کی بے مثال ہمہ گیری کو یاد کرتے ہوئے مودی نے کہا کہ چاہے وہ سریلی دھنیں ہوں یا پرجوش گیت، آشا بھوسلے کی آواز میں ایک لازوال چمک تھی جو ہر دور اور ہر سامع تک پہنچتی رہی۔انھوں نے ایک ذاتی یاد بھی شیئر کی اور کہا کہ میں ہمیشہ ان سے ہونے والی ملاقاتوں کو یاد رکھوں گا جس سے ان کی شخصیت کی گرمجوشی اور مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔تعزیرات کا اظہار کرتے ہوئے وزیراعظم نے کہا کہ میری دلی تعزیت ان کے خاندان، مداحوں اور موسیقی کے شائقین کے ساتھ ہیں۔وہ آنے والی نسلوں کو متاثر کرتی رہیں گی اور ان کے گیت ہمیشہ لوگوں کی زندگیوں میں گونجتے رہیں گے۔ان کا انتقال ہندوستانی موسیقی کے ایک عہد کے خاتمے کے مترادف ہے۔ صدر جمہوریہ دروپدی مرمو نے معروف گلوکارہ آشا بھوسلے کے انتقال پر تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ملک میں موسیقی کے ایک پورے عہد کی تعریف کی اور کہا کہ ان کی آواز ہمیشہ زندہ رہے گی۔صدر مرمو نے سوشل میڈیا پلیٹ فارم 'ایکس' پر اپنے پیغام میں لکھا کہ آشا بھوسلے کے انتقال سے موسیقی کی دنیا میں ایک بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے۔ایک عظیم گلوکارہ کے طور پر انھوں نے ہندوستان میں موسیقی کے ایک مکمل دور کو متعین کیا۔ ان کے ساتھ میری ذاتی ملاقاتوں کی یادیں میرے لیے نہایت قیمتی ہیں۔انھوں نے مزید کہا کہ ایک فنکار اور ایک انسان کے طور پر انھوں نے اپنی زندگی اپنی شرطوں پر گزاری۔ دہلی قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر وجیندر گپتا نے آشا بھوسلے کے انتقال پر گہرے رنج وغم اور دلی تعزیت کا اظہار کیا۔اپنے تعزیتی پیغام میں گپتا نے کہا کہ آشا بھوسلے نے اپنے شاندار کیریئر کے دوران 12,000 سے زائد گیت گائے اور وہ ہمیشہ اپنی لازوال دھنوں کے لیے یاد رکھی جائیں گی۔انھوں نے مزید کہا کہ آشا بھوسلے کے انتقال کے ساتھ خاص طور پر بھارت رتن لتا منگیشکر کے بعد ملک نے اپنی سب سے سریلی اور بااثر آوازوں میں سے ایک کو کھو دیا ہے۔ نائب صدر جمہوریہ سی پی رادھا کرشن نے عظیم گلوکارہ آشا بھوسلے کے انتقال پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کی وراثت آنے والی نسلوں کو ترغیب دیتی رہے گی۔مسٹر رادھا کرشنن نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ عظیم گلوکارہ آشا بھوسلے جی کے انتقال سے مجھے شدید دکھ ہوا ہے۔ان کے اہل خانہ، مداحوں اور موسیقی کے شائقین کے ساتھ میری ہمدردیاں ہیں۔ انھوں نے کہا آشا بھوسلے کی ورسٹائل آواز نے انھیں غزل اور بھجن جیسی موسیقی کی مختلف اصناف میں مہارت عطا کی۔ نائب صدر نے کہا کہ ان کی بہترین آواز اور موسیقی کی وراثت آنے والی نسلوں کو متاثر کرتی رہے گی اور کروڑوں لوگوں کے دلوں میں گونجتی رہے گی۔ ان کے علاوہ وزیر دفاع راجناتھ سنگھ، کانگریس صدر ملکارجن کھڑگے، لوک سبھا میں قائد حزاب اختلاف راہل گاندھی، اتر پردیش کے وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ، مہاراشٹر کے وزیراعلیٰ، دیویندر فڑنویس، اتراکھنڈ کے وزیراعلیٰ پشکر سنگھ دھامی، مغربی بنگال کی وزیراعلیٰ ممتا بنرجی کے علاوہ فلمی دنیا کی کئی شخصیات نے انھیں خراج تحسین پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب'، 'ہمارا سماج' و 'صحافت' دہلی، 13 اپریل 2026

منظر مہدی

لکھنؤ/ اجودھیا: مشہور صحافی اور ادیب 68 سالہ منظر مہدی کا لکھنؤ میں انتقال ہوگیا۔ وہ ہفتہ وار اخبار 'آپ کی طاقت' کے مدیر تھے۔منظر مہدی نے 'اودھ نامہ' میں کام کرتے ہوئے اسے فیض آباد میں کافی ترقی دی تھی۔تقریباً 7 سال پہلے ان کی اوپن ہارٹ سرجری

ہوئی تھی۔ وہ شوگر کے مریض تھے۔ان کا علاج چل رہا تھا مگر وہ چلتے پھرتے تھے۔ دو روز قبل کسی رشتہ دار کے یہاں لکھنو گئے تھے، جہاں سے انھیں دہلی بھی جانا تھا مگر 3 اپریل کو ان کی طبیعت بگڑ گئی اور وہیں گھر پر ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ اپنے پیچھے چار بیٹیوں کو چھوڑ گئے ہیں، جن میں سے ایک دبئی میں رہتی ہے۔ ان کی

گلدستہ پروڈکشن کے نام سے ایک تنظیم بھی تھی، جس کے بینر تلے نریندرالیہ میں کئی ڈراموں کی پیشکش کی گئی۔ منظر مہدی نے اردو اخبار صحافت سے شروعات کی، جہاں انھوں نے اپنا ایک ہفتہ وار اخبار بھی شروع کیا۔ 'آپ کی طاقت' کا دفتر چوکی مسجد حسن رضا خاں میں تھا۔ منظر مہدی اردو زبان کے بہت ماہر مانے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے گلدستہ پروڈکشن کے بینر تلے کئی یکجہتی کے پروگرام بھی کیے۔ منظر مہدی کی نماز جنازہ 10 بجے صبح امام باڑا جوہر علی خاں کی جامع مسجد میں ادا کی گئی جب کہ تدفین وزیر گنج کے مولوی باغ قبرستان میں ہوئی۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ، 4 اپریل 2026

خراج عقیدت

جیلانی بانو اور ڈاکٹر جمال اویسی

علی گڑھ: معروف افسانہ نگار جیلانی بانو اور شاعر جمال اویسی کے انتقال پر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رشیدا حمد صدیقی ہال میں ایک تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں دونوں مرحومین کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں خراج عقیدت

پیش کیا گیا۔ صدر شعبہ پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی نے کہا کہ دونوں مرحومین نے اپنی ادبی خدمات سے اردو زبان و ادب کا دامن وسیع کیا۔ جیلانی بانو اور جمال اویسی کا تعلق علمی طور پر علی گڑھ سے بھی تھا۔ جیلانی بانو نے ناول بھی لکھے اور افسانے بھی۔ انھوں نے حیدرآباد کے کلچر اور اس کی روح کو اپنے ناول 'ایوان غزل' میں پیش کیا ہے، انھوں نے متعدد ترجمے بھی کیے، خود ان کی کتابوں کے بھی متعدد زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ انھیں پدم شری کے علاوہ دیگر کئی ادبی انعامات سے نوازا گیا۔ پروفیسر محمد علی جوہر نے کہا کہ جمال اویسی بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے، انھوں نے اپنی تشبیہات و استعارات وضع کیے، جن کے توسط سے وہ بڑی سے بڑی بات کہہ جاتے تھے۔ وہ اپنے معاصرین میں علی گڑھ کے نمائندہ شاعر تھے، وہ اچھے شاعر کے ساتھ اچھے انسان بھی تھے۔

پروفیسر طارق چھتاری نے کہا کہ جیلانی بانو ایک اچھی فنکارہ تھیں جنھوں نے اپنے زمانے کو فکشن میں پیش کیا، انھوں نے فن کی مہارت کے ساتھ مسائل و موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔ جمال اویسی کے تعلق سے انھوں نے کہا کہ وہ ایک اچھے شاعر تھے۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ جیلانی بانو ایک مشرقی خاتون تھیں جسے انھوں نے اپنے فکشن کا موضوع بنایا۔ انھوں نے کہا کہ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہ ہونے کے باوجود ترقی پسند تھیں۔ ڈاکٹر خالد سیف اللہ نے کہا کہ جمال اویسی ایک منفرد شاعر تھے مگر عام شاعروں کی طرح ان میں سنانے کی خواہش نہیں تھی۔ ان کی متعدد نظمیں بہت ہی خوبصورت اور گہری ہیں۔

ڈاکٹر معید الرحمٰن نے جمال اویسی کے انتقال پر تعزیتی قرارداد پیش کی۔ ڈاکٹر امتیاز احمد نے جیلانی بانو کے انتقال پر تعزیتی قرارداد پیش کرتے ہوئے ان کے ناول اور افسانوی مجموعوں کے ذکر کے ساتھ ترجمہ نگاری پر روشنی ڈالی نیز ان کتابوں کا بھی ذکر کیا جو ان کی حیات اور ادبی خدمات سے متعلق شائع ہوئی ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 17 مارچ 2026

امجد حیدرآبادی

بھاگل پور: باغ و بہار، برہ پورہ، بھاگل پور کے زیر اہتمام معظم چک ڈاکٹر عمارہ خاتون کی رہائش گاہ پر

شاعر مظہر مجاہدی کی صدارت میں امجد حیدرآبادی کے یوم وفات پر ایک ادبی تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں کئی اہم شخصیات نے شرکت کی۔

اس موقعے پر انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد پرویز نے امجد حیدرآبادی کے حیات و فن پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ حکیم الشعرا امجد حیدرآبادی اردو رباعی کی دنیا میں ایک روشن باب ہے۔ وہ بیک وقت غزل گو، نظم نگار، رباعی گو، افسانہ نگار، قطعہ گو، قصیدہ گو وغیرہ تھے۔ ان کی شاعری میں درد اور تڑپ، لطیف احساسات، سوز و گداز، انسانی ہمدردی کے نمونے ملتے ہیں۔ انھوں نے دکن کے صوفی شاعر کی حیثیت سے اردو ادب کی دنیا میں ایک انفرادی اور نمایاں مقام حاصل کیا۔

امجد حیدرآبادی کا اصل نام سید احمد حسین اور قلمی نام امجد حیدرآبادی تھا۔ 19 مارچ 1878 کو موسی ندی کے کنارے چمپا دروازہ، حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور وفات 29 مارچ 1961 کو ہوئی۔ 19 سال کی عمر میں ان کی رباعی کا مجموعہ شائع ہوا۔ ان کی تصانیف میں ریاض امجد، رباعیات امجد، نذر امجد، سی پیوند، حج امجد، پیام امجد، نثر میں جمال امجد، حکایات امجد، گلستان امجد، ایوب کی کہانی، میاں بیوی کی کہانی وغیرہ اہم ہیں۔ اس موقعے پر مظہر مجاہدی نے کہا کہ امجد حیدرآبادی ایک بڑے شاعر تھے، انھوں نے رباعی گو شاعر کی حیثیت سے لازوال شہرت پائی۔ نشست میں شامل محمد تاج الدین، محمد سہیم الدین، ڈاکٹر عمارہ خاتون وغیرہ نے امجد حیدرآبادی کے فن سے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 مارچ 2026

پہلی تحریر پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تحریر شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تحریر پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی تازہ مطبوعات

ادبیات شناسی

مصنف: محمد حسن

دوسرا ایڈیشن: 2026

صفحات: 192

قیمت: 120 روپے

زبان اور علم زبان

مصنف: عبدالقادر سروری

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: XVII+270

قیمت: 190 روپے

سہانی دھوپ

مصنف: رتن سنگھ

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: IX+494

قیمت: 305 روپے

جراحیاتِ نظامی

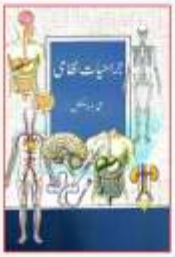

مصنف: محمد ذوالکفل

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: IV+358

قیمت: 275 روپے

خواتین واطفال سے متعلق قوانین (جلد اول: خواتین سے متعلق قوانین)

مصنفہ: نزہت پروین خان

مترجم: محمد صغیر حسین

پہلی ایڈیشن 2026

صفحات: X+678

قیمت: 405 روپے

خواتین واطفال سے متعلق قوانین (جلد دوم: اطفال سے متعلق قوانین)

مصنفہ: نزہت پروین خان

مترجم: محمد صغیر حسین

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 318

قیمت: 210 روپے

منجدھار میں دھار

مصنف: پنکج چترویدی

مترجم: ممتاز بیگم

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: XXII+178

قیمت: 280 روپے

زراعت کو آب وہوا میں ہونے والی تبدیلی کے مطابق بنانا

مصنف: محمد اسرار الحق

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: XVI+72

قیمت: 120 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, मई–2026,वर्ष:28, अंक:05
URDU DUNIYA Monthly, May-2026, Vol.28, Issue:05
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/04/2026**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326، A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025